تخلیق

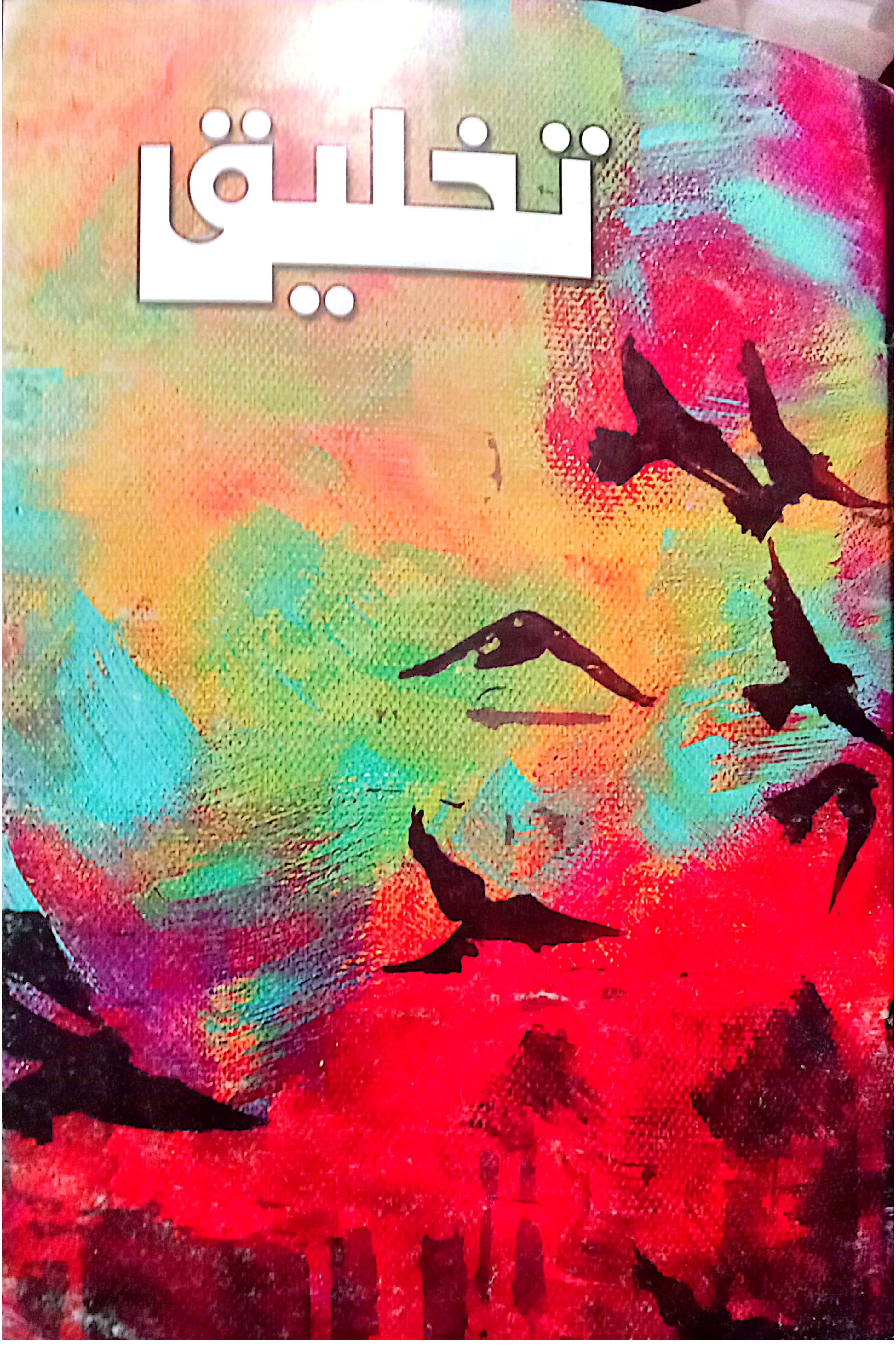

CamScanner

مسلسل اشاعت کا 45واں سال

بانی مدیر اظہر جاوید
عرصہ ادارت 2012 - 1969ء
(صدارتی ایوارڈ یافتہ)

ماہنامہ تخلیق لاہور

مدیر سونان اظہر جاوید

جلد : 45 | جون 2014ء | شمارہ : 6 | CPL نمبر 96

قیمت فی پرچہ : 150 روپے .... 750 روپے سالانہ (بمعہ ڈاک خرچ)

(سالانہ 100 ڈالر بیرون ممالک...... ہندوستان کے لیے 1,200 روپے سالانہ) (بمعہ ڈاک خرچ)

نمائندگان خصوصی

نیّر جہاں (امریکہ) ...... تاشی ظہیر (امریکہ) ...... نارنگ ساقی (انڈیا) ...... جاوید منظور (پاکستان)

E-67.A-1, St # 3, Near Defence Chowk, Police Chowki, Super Town, Lahore-Cantt.

فون نمبرز: 04236626008-04236671007......موبائل فون: 03218899007 ای میل : ajavedtakhleeq@gmail.com

ماہنامہ ''تخلیق'' کے مدیر جناب اظہر جاوید نے عہد کیا تھا کہ وہ ''تخلیق'' کو اپنی زندگی کے آخر سانس تک جاری رکھیں گے۔ انہوں نے اس عہد کو پورا کیا اور 14 رفروری 2012ء کو اپنی جان...... جانِ آفرین کے سپرد کی تو اس ماہ کا ''تخلیق'' شائع کر چکے تھے اور یہ ادبی رسالہ اپنی اشاعت کے 43ویں سال میں قدم رکھ چکا تھا۔

جناب اظہر جاوید کی وفات کے بعد ''تخلیق'' کی ترتیب وتدوین اور طباعت واشاعت کی ذمہ داری میرے کندھوں پر آ پڑی۔ ادبی صحافت کے میدان میں نووارد ہونے کے باوجود...... میں نے اپنے والد مرحوم کی اس وراثت کو قائم رکھنے کا عہد کیا ہے اور سب سے پہلے ان کی یاد میں ''اظہر جاوید نمبر'' پیش کیا جسے ادبی حلقوں میں پسند کیا گیا۔ دم ہے تو ''تخلیق'' پیہم رہے گا اور یہ ''علامت''، ''افکار''، ''صریر''، ''تقاضے'' اور ''طلوعِ افکار'' جیسے رسائل کی صف میں شامل نہیں ہوگا۔ (انشا اللہ) جو مدیرِ اعلیٰ کی وفات کے ساتھ ہی مرحوم ہو گئے۔

43 سال تک ''تخلیق'' کی اشاعت رفیقانِ تخلیق کے تعاون کی مرہونِ منت ہے۔ میں توقع کرتا ہوں کہ یہ تعاون اب مجھے بھی حاصل رہے گا۔ ''تخلیق'' کے نئے دور میں چند اہلِ ادب نے دل کھول کر ''تخلیق'' کی معاونت کی اور آئندہ بھی مدد کا وعدہ کیا ہے۔ یہ اہلِ دل شاد آباد رہیں۔ ان اہلِ دل کے مشورے سے ''تخلیق'' کے مضامین کے انتخاب کے لیے ''تخلیق پینل''، تشکیل دیا گیا تھا جو بڑی خوش اُسلوبی سے کام کر رہا ہے اور چند ناگزیر وجوہات کی وجہ سے پرچے کی قیمت میں معمولی اضافہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اُمید ہے آپ اسے خوشی سے قبول کریں گے۔

امریکہ، یورپ، ہندوستان اور پاکستان میں ''تخلیق'' کے امور کی ذمہ داری محترمہ نیّر جہاں، تاشی ظہیر، نارنگ ساقی اور جاوید منظور نے حسبِ سابق قبول کر لی ہے۔ یورپ اور امریکہ کے لئے زرِ تعاون سو (100) ڈالر (یا اس کے مساوی کرنسی)، ہندوستان کے لئے زرِ سالانہ صرف 1,200 روپے ہے۔

☆ تخلیق کا نیا پتہ: **E-67.A-1, St # 3, Near Defence Chowk, Police Chowki, Super Town, Lahore-Cantt**

PAKISTAN
Javed Manoor
76-Islam Block, Azam Garden,
Multan Road, Lahore
Ph: 0423751232
Cell : 0300-8406327
Email:upindustry@hotmail.com

INDIA
K.L. Narang Saqi
L-4-Connaught Circus, New
Delhi-110001, India
Ph: 0091-41517818
Email:narangsaqi@gmail.com

U.S.A.
Tashie Zaheer
591-Sylvanave
Mountain View
C.A.94041
U.S.A.
Ph: 0015107503297
Email: tzaheer@gmail.com

U.S.A.
Naiyar Jahan
721-Hill Street
111-Santa Monica
C.A. 90405, U.S.A.
Ph : 0013103969303
Email:Zihanat@hotmail.com
urdu@urdu markaz.com

o بسمِ اللہِ الرحمٰنِ الرحیم ط o

ترتیب

پہلی بات — سونان اظہر جاوید — 5

حمد و نعت

حمدِ باری تعالیٰ — نورین طلعت عروبہ — 7
حمدِ باری تعالیٰ — جاوید احسن — 7
نعت رسولِ مقبولؐ — امین راحت چغتائی — 8
نعت رسولِ مقبولؐ — کرشن پرویز — 8

مضامین

افسانہ نگار غلام عباس...... — انور سدید — 9
ادب اور معرکۂ خیر و شر — مسلم شمیم — 14

منظومات

ارمان نجمی، ایوب خاور، شاہین، ابصار عبدالعلی، منظر ایوبی، نجمہ عثمان، سیفی سرونجی، آصفہ نشاط، فوقیہ مشتاق، نور زمان ناوک، عبیرہ احمد، جاوید زیدی — 19

افسانے

محبت کبھی مرجھاتی نہیں — عطیہ سیّد — 25
شنکر پورہ کا بھگوان — دیپک کنول — 31
ان کہی — مشتاق اعظمی — 37
لیڈی سیکرٹری — محمد طارق علی — 41
ایک اور زخم — نجیب عمر — 49
شام کا تارا — اظہر جاوید — 53

غزلیں

سیّد مشکور حسین یاد، حسن عسکری کاظمی، کنول فیروز، گلزار بخاری، نثار ترابی، حفیظ انجم نگری، اکرام تبسّم، ڈاکٹر شیخ محمد اقبال، وِشال کھلر، شفیع ہمدم، طاہر شیرازی، شاہین زیدی، گلفام نقوی، اسلم سحاب ہاشمی، سعید باقر رضا، مسعود تنہا، ابراہیم عدیل، وقاص عزیز، اکبر مروت، قاسم خیال، یاسمین کنول — 57 تا 67

انشائیے

بھول جانا — سلیم آغا قزلباش — 69
راز داں کیسے کیسے — نیر رانی شفیق — 72

خاکے

فلمی دنیا اور عزیز میرٹھی — علی سفیان آفاقی — 74
ڈاکٹر وزیر آغا کی یادیں — انور سدید — 80
بہتا دریا۔ بابا عرفان الحق — ڈاکٹر ابدال بیلا — 83
میرے مرشد اشفاق احمد — اظہر جاوید — 91

یادنگاری

عاشقی صبر طلب...... — ڈاکٹر امجد رشید — 96

آپ بیتی

بھارت سے پاکستان تک — علی سفیان آفاقی — 100
تمھیں یاد ہو...... — عزیز میرٹھی — 104

سفرنامہ

سورج کے رُخ پر	ڈاکٹر ابدال بیلا	107

طنز و مزاح

دیکھتے ہیں ہم کہ غالب کون ہے؟	ڈاکٹر معین قریشی	113
''شہرنورد'' کے رومان	اعتبار ساجد	178

جائزے

جنگل والا صاحب	بانو قدسیہ	123
فرنٹ سیٹ کا سیاح	پروفیسر جمیل آذر	125
بسمل صابری اور سخن کی جادوگر	بشریٰ رحمٰن	128
سیّد ریاض زیدی کا شعری اسلوب	حسن عسکری کاظمی	130
گیان نامے بہ نام ڈاکٹر رفیع......	سکندر حیات میکن	133
وہ چاہے جس کو عطا کردے	ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی	136

پنجاب رنگ

اسد بیگ، بشریٰ رحمٰن، سلیم شہزاد، منزہ شاہد، 138

احسان رانا، سلطان کھاروی 140

آفتاب خان کے تبصرے

سخن آئینہ	مظفر ارج	141
سینہ خاک	عامر عبداللہ	
سامان دل کا	رفیق ارم	
ابھی موسم نہیں بدلا	شاہین زیدی	
ہوا پتے گرائے گی	گلزار بخاری	
ان کہی سوچیں	ڈاکٹر مقصود حسین	
فخرِ دو عالم	رشید آفریں	
بحرِ تجلیات	ریاض ندیم نیازی	146

انجمن خیال (خطوط)

ڈاکٹر انور سدید، امین راحت چغتائی، سلطان رشک، 147
نسیم سحر، پروفیسر زہیر کنجاہی، جاوید اختر زیدی، شفیع ہمدم، رومانہ رومی، سکندر حیات میکن، نجیب عمر، نجمہ عثمان، سیمیں کرن، دردانہ نوشین خان، جاوید احسن، محمد افضال انجم، بی ڈی کالیہ ہمدم، قمر علوی، مشتاق احمد، جمیل حیات، ایم ڈی ملک، جاوید احمد صدیقی 163

تخلیق کو موصول مزید خطوط

خواجہ سبطین شاہجہانی، محمد بشیر ماہر کوٹلوی، ظفر علی راجہ، رؤف ایاز، غلام شبیر اسد، جہانگیر عباسی، وصی مکرانی واجدی امتیاز کاظمی، محمد طارق علی

تخلیق کو موصول رسائل اور کتب 164

سرورق

انیس یعقوب

ناشر: سونان اظہر جاوید

طابع: بیدار سرمدی

قانونی مشاورت: لطیف قریشی، سیّد شاہد بخاری

مطبع: بُکسن پرنٹرز، گلشن راوی، لاہور

مقامِ اشاعت

E-67.A-1, St # 3, Near Defence Chowk,

Police Chowki, Super Town, Lahore-Cantt

○ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

پہلی بات

'تخلیق' کے گذشتہ اداریے میں اُردو کے مقاصد کے لئے ملک کے چند بڑے شہروں میں منعقد کی جانے والی ادبی کانفرنسوں کو موضوع بنایا گیا اور دردمندی سے دریافت کیا گیا تھا کہ ان کانفرنسوں کو ادبی میلے کا نام کیوں دیا جاتا ہے اور اُردو کو اس کا آئینی مقام دلانے میں کیا خدمات انجام دی گئی ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ادب کے سنجیدہ جلسوں میں اب موج میلے کے عناصر شامل ہو گئے ہیں اور قومی سطح پر اُردو کے بجائے انگریزی کو مسلّط کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ہماری یہ پیش گوئی درج رجسٹر کر لی جائے کہ **انگریزی ایک ہزار سال میں بھی ہماری رگوں میں اُتاری نہیں جاسکتی اور اس کے ساتھ ہماری غلامی کے دور کی یادیں وابستہ رہیں گی** دوسری طرف اُردو کا استیصال شاید چند برسوں میں ہو جائے کہ ہمارے بچے اب اُردو سے ناواقف کیے جا رہے ہیں اور یہ لوگ اُردو کے نام پر میلے ٹھیلے منعقد کر رہے ہیں۔

ہم نے اداریے میں ان کانفرنسوں میں عمل میں لائی جانے والی مبیّنہ بے قاعدگیوں، بدعنوانیوں اور کرپشن کی طرف دبی زبان میں اشارہ بھی کیا تھا۔ چند روز کے بعد لاہور میں 80 کے لگ بھگ معروف فنکار، ادیبوں، شاعروں اور فنون لطیفہ کے دیگر فنکاروں کے نام پر مشتمل ایک فہرست گردش کرنے لگی جن کو مبینہ طور پر دو سے دس لاکھ روپے تک کی رقم خلاف ضابطہ پیش کی گئی تھی اور یہ بھی درج تھا کہ کانفرنس کے منتظمین نے ان کے مرتبے کو مدنظر رکھتے ہوئے اس رقم کی رسید تک نہیں لی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ قریباً چار کروڑ روپے سے زیادہ کی رقم کانفرنس کے کسی جلسے میں شفاف انداز میں سامعین کے سامنے تقسیم نہیں ہوئی اور نہ اس خصوصی عطائے فراوانہ کا استحقاق بیان کیا گیا ہے۔

ہم حکّامِ وقت سے یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہیں کہ یہ سرکاری گرانٹ کی کھلی لوٹ کیا ان کے علم میں ہے؟ اگر علم میں ہے تو اس بندر بانٹ کے خلاف کیا کارروائی کی گئی ہے جبکہ ایسی ہی ایک اور کانفرنس منعقد کرنے کی خبریں گردش کر رہی ہیں، ستم کی بات یہ ہے کہ بعض ممتاز ادیبوں نے یہ شکایت کی ہے کہ انہیں کسی کانفرنس کا دعوت نامہ نہیں بھیجا گیا اور صرف منتظمین کے منظورِ نظر لوگوں کو ہی مدعو کیا گیا جن کے منہ نوٹوں سے بند کر دیے گئے۔ ہمارے عام معاشرے کی بدعنوانیوں کا ادبی معاشرے میں در آنا افسوس ناک ہے۔ اس سے ادب کا پاکیزہ مقصد مجروح اور ادیب کا کردار داغدار ہو رہا ہے۔ اونچی سطح کے ادیبوں کو اس پر غور کرنا چاہیے اور اس برائی کے استیصال کے لئے ٹھوس اقدام عمل میں لانا ناگزیر ہے۔

لدھیانہ سے اُردو کے معروف افسانہ نگار ڈاکٹر کیول دھیر نے اطلاع دی کہ لاہور میں منعقد ہونے والی چوتھی عالمی اُردو کانفرنس میں وہ پاکستان کے چند ادیبوں کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ساحر لدھیانوی ایوارڈ پیش کرنے کے خواہش مند ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے انتخاب کی ذمہ داری ادارہ ''تخلیق'' پر ڈال دی۔ بظاہر ''تخلیق'' کے لئے یہ اعزاز کی بات ہے لیکن میں بصد ادب گزارش کرتا ہوں کہ ساحر لدھیانوی ایوارڈ کے لئے پاکستانی ادیبوں کا انتخاب ڈاکٹر کیول دھیر کا استحقاق ہے۔ ان کی پوری زندگی برصغیر کے دشتِ ادب کی سیاحت میں گزری ہے اور وہ اس ملک کے معروف و ممتاز ادیبوں کے نام اور کام سے بھی شناسا ہیں۔

اس طرح ساحر لدھیانوی ایوارڈ کی غیر جانبدار حیثیت بھی قائم رہے گی۔انھوں نے میری بات کی تائید کی اور آخر کار باہمی صلاح ومشورے سے پانچ شخصیات کو ساحر لدھیانوی ایوارڈ کے لئے منتخب کیا گیا جن میں انتظار حسین، بانو قدسیہ، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر انور سدید اور عبداللہ حسین شامل ہیں۔ان سب کو ادارہ ''تخلیق'' کی جانب سے مبارک ہو۔

''تخلیق'' نے اظہر جاوید صاحب کی یاد کو تازہ رکھنے اور اہلِ ادب کی خدمت کے اعتراف کے لئے ''تخلیق ایوارڈ 2013'' گذشتہ برس جاری کیا تھا ہمیں خوشی ہے کہ ایوارڈ کمیٹی نے پہلے ایوارڈ کے لئے ڈاکٹر انور سدید اور جناب شفیع عقیل کا انتخاب کیا تو اس انتخاب کو منصفانہ اور غیر جانبدارانہ قرار دیا گیا۔ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اور پروفیسر حسن عسکری کاظمی کے مضامین اور انجمن خیال کے خطوط ان کے استحقاق کی توثیق کرتے ہیں۔

ہماری انتخاب کمیٹی نے 2014ء کے ''تخلیق ایوارڈ'' کے لئے محترمہ بانو قدسیہ صاحبہ کا نام منتخب کیا ہے جو ملک کے نامور افسانہ نگار، فلسفہ دان اور معلم ادب ہیں۔ان کی خدمت میں ''تخلیق ایوارڈ 2014'' پیش کرتے ہوئے ہمیں خوشی محسوس ہو رہی ہے۔

نئے سال کے آغاز پر ''تخلیق'' کے ساتھ ادبی رابطہ قائم رکھنے کے لئے جب چندے کی مہم شروع کی گئی تو حیرت ہوئی کہ بعض ادبائے کرام نے سالانہ رکنیت اس لئے قبول نہ کی کہ ''تخلیق'' ان کے گراں مایہ اور بلند پایہ ادب پاروں سے استفادہ نہ کر سکا اور انہیں اس رسالے میں گذشتہ برس کے دوران اپنی جگہ نہ مل سکی تھی۔میں بصد ادب یہ وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ سالانہ رکنیت کسی فرد کی تخلیق کی اشاعت کے ساتھ مشروط نہیں۔قارئین کرام! میرا کام تو صرف یہ ہے کہ میں اعلیٰ پائے کی تخلیقات آپ کے مطالعے کے لئے تلاش کروں اور ان کی اشاعت سے آپ کے جمالِ ذوق کی تسکین کرنے کی کوشش کرتا رہوں۔اگر پرچے میں ایک بھی مضمون یا صرف ایک شعر بھی آپ کے ذوق کو آسودگی عطا کر دیتا ہے تو اس کے سامنے سالانہ چندہ بالکل کم مایہ ہو جاتا ہے۔سالانہ خریدار پرچے کی اشاعت میں کسی حد تک معاون ہیں لیکن اس سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ادب کے فروغ میں اور انسانیت کی فلاح و بہبود میں دامے درمے شریک ہیں۔ان کی یہ خدمت تاریخ کے اوراق میں سنہری حروف سے لکھی جا رہی ہے۔وہ ان گم نام سپاہیوں کی طرح ہیں جو وطنِ عزیز کی پاسبانی کے لئے اپنی زندگی کا نذرانہ پیش کر دیتے ہیں اور جن کے احسانات قوم ہمیشہ تسلیم کرتی ہے۔

مَیں اس ضمن میں جناب خورشید بیگ میلسوی کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انہوں نے چھوٹے سے مضافاتی شہر سے ''تخلیق'' کو سات سالانہ خریدار عطا فرمائے۔جناب تاشی ظہیر نے کیلے فورنیا (امریکہ) سے تیرہ خریداروں کا سالانہ چندہ رخصت کیا۔میں یقین کر سکتا ہوں کہ جناب خورشید بیگ میلسوی اور تاشی ظہیر صاحب کی قائم کی ہوئی مثال کا سلسلہ وسعت حاصل کرے گا اور ''تخلیق'' کے قارئین کا دستِ کرم کشادہ رہے گا۔''تخلیق'' ان کی اعلیٰ تخلیقات کے لئے ہمیشہ چشم براہ رہے گا اور نئے لکھنے والوں کو آسمانِ ادب پر تابندہ ستاروں میں شامل کرنے میں ہمیشہ کوشاں رہے گا۔جناب ناصر زیدی کی یہ کاوش بھی قابلِ صد تحسین ہے کہ انہوں نے اظہر جاوید مرحوم کی تصویر کو پاک ٹی ہاؤس میں ادیبوں کی پکچر گیلری میں آویزاں کر دیا میں ان کا شکریہ دل کی گہرائیوں سے کرتا ہوں۔

پاکستان کی تہذیبی ومعاشرتی وسیاسی دنیا کی طرف سے محترمہ بشریٰ رحمان کو 'دخترِ پاکستان'' کا خطاب عطا کیا ہے۔ہم اس منفرد اعزاز کے لیے ان کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

رب راکھا...... **سونان اظہر جاوید**

◆◆◆

نورین طلعت عروبہ

حمدِ باری تعالیٰ

ہر خوشی کم ہے بس اک طرب کے سِوا
صحنِ کعبہ کی پُرنور شب کے سِوا

نعتِ صلِ علیٰ، حمدِ ربِّ جہاں
کیا ہُنر کیسا فن اس ادب کے سِوا

بُوند مانگی تھی ہم نے، سمندر مِلا
اور کیا چاہیے اس طلب کے سِوا

عرض کرتے ہیں آنسو، دھڑکتا ہے دل
آج گویا ہیں سب، ایک لب کے سِوا

کب کوئی آئے گا، کب چلا جائے گا
کوئی واقف نہیں میرے رب کے سِوا

دونوں عالم نے پائی حرم سے ضیاء
روشنی کیا ہے اس اک سبب کے سِوا

OOO

جاوید احسنؔ

حمدِ باری تعالیٰ

آسمانِ فکر پر تارے سجا دیتا ہے کون؟
لق و دق صحرا میں گُل بوٹے کِھلا دیتا ہے کون؟

دھوپ کے شعلوں سے جلتے ہیں جہاں برگد کے برگ
سبزہ و گل کی وہاں چادر بچھا دیتا ہے کون؟

بھیجتا ہے کون تپتے دشت میں ابرِ بہار
ریگزارِ تھل میں نخلستاں اُگا دیتا ہے کون؟

معدنی دولت سے بھر کر سینۂ کوہ و دمن
خاکِ بے توقیر کو سونا بنا دیتا ہے کون؟

ظلمتِ آفاق میں گم کردہ راہوں کے لیے
ہر قدم پر اک نئی مشعل جلا دیتا ہے کون؟

بیٹھنے لگتا ہے جب کوئی مسافر دشت میں
’’دو قدم منزل ہے آگے‘‘ کی صدا دیتا ہے کون؟

شاعرِ رنگیں نوا ہو جب تہی دامانِ فکر
اُس گھڑی احسنؔ اُسے تابِ نوا دیتا ہے کون؟

OOO

امین راحت چغتائی

نعت

بہاروں کی مہک، یادوں کی خوش بُو
درودوں کی صدا، کوئل کی کُو کُو

جھلک نقشِ کفِ پائے پیمبرؐ
معیّن کر گئی راہی کی خُو بُو

درِ اقدس کا یہ بھی معجزہ ہے
کہ دل کی بات کہہ دیتے ہیں آنسو

ستاتی ہے بہت اب یادِ طیبہ
تڑپتا ہے تو دل کہتا ہے یا ہُو

سنہری جالیاں جب سامنے ہوں
کسے یارا کہ رکھے دل پہ قابو

زیارت جانے کب ہو جائے اُنؐ کی
رہے ہیں خواب میں بھی ہم دو زانو

نظر میں تھا جمالِ روئے احمدؐ
بدلتا کوئی راحتؔ کیسے پہلو

OOO

کرشن پرویز (انڈیا)

نعت

دیدار کر سکیں گے رسالت مآبؐ کا
ہم کو تو انتظار ہے یومِ حساب کا

ذرّے میں نور آتا ہے اس آفتاب کا
اس نام سے سرور ملا ہے شراب کا

بے خود ہوا ہوں دیکھ کر روضہ شریف کو
نقشہ بدل کے رہ گیا ہے میرے خواب کا

ہم کو کبھی جو خواب میں دیدار ہو گیا
کرتے ہیں شکر ہم کرمِ بے حساب کا

ہو جائے اک نظر کبھی پرویزؔ کی طرف
سنورے نصیب بگڑا اس خانہ خراب کا

OOO

مضامین

افسانہ نگار غلام عباس سے شناسائی

انور سدید

سیّد قاسم محمود[1] نے اردو کے ممتاز افسانہ نگار غلام عباس کے لیے ''شاہکار'' کی ایک اشاعت مختص کی تو انہیں ''چھوٹے آدمی کا داستان گو'' قرار دینے کے علاوہ یہ بھی لکھا کہ

''وہ اُردو کے واحد ایسے بڑے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے خود کو کسی ادبی تحریک، رویّے اور گروہ سے وابستہ نہیں کیا۔''

اور پھر غیر شکایتی انداز میں کہا :

''غالباً یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر انور سدید صاحب کی تالیف ''اُردو ادب کی تحریکیں'' (انجمن ترقیِ اردو) میں ان کا نام اشارۃً بھی شامل نہیں۔''

گمان غالب یہ ہے کہ قاسم محمود صاحب کی نظر سے میری مندرجہ ذیل صراحت نہیں گزری۔

''یہ کتاب جسے میں نے ''اُردو ادب کی تاریخ'' کہنے کی جسارت کی ہے، میرے ایک پرانے خواب کی تعبیر ہے۔ یہ خواب میں نے ''اُردو ادب کی تحریکیں'' لکھنے کے بعد دیکھا تھا۔ اس کے عناصرِ ترکیبی میں ایک بات یہ بھی تھی کہ ''اُردو ادب کی تحریکیں'' میں متعدد ایسے ادیبوں کے کارنامے زیرِ بحث نہیں آ سکے تھے جو ادب کی تاریخ میں تو نمایاں مقام حاصل کر چکے ہیں لیکن جنہیں کسی مخصوص تحریک کے مدار میں شامل کرنا ممکن نہیں تھا۔ کتاب چھپ کر آئی تو مجھے اپنے موقف کی صراحت متعدد مرتبہ کرنا پڑی۔ بالفاظِ دیگر ''اردو ادب کی تحریکیں'' نے ہی ''اُردو ادب کی مختصر تاریخ'' کو کروٹ دی ہے۔''

اور سیّد قاسم محمود کے دل کی بات قلم کی زبان سے بیان ہوئی تو وہ یوں تھی :

''اصل شکایت تو نقادانِ فن سے ہے کہ انہوں نے غلام عباس کی وہ قدر نہ کی جو ان کا حق تھا لیکن بقول ڈاکٹر انوار احمد ''اردو افسانے کا نقاد غلام عباس کو نظر انداز کرتا آیا ہے اور مزید کر سکتا ہے۔ مگر آنندی، اوورکوٹ، کتبہ، فینسی ہیر کٹنگ سیلون اور جوار بھاٹا جیسے افسانوں کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔''

1- سیّد قاسم محمود 2010ء میں وفات پا گئے تھے۔ اور اس کے ساتھ ہی رسالہ ''شاہکار'' کی اشاعت بند ہو گئی۔ (انور سدید)

ڈاکٹر انوار احمد کی بات کسی حد تک درست ہے لیکن انہوں نے اس اہم افسانہ نگار کو نظر انداز کرنے کی وجوہ بیان نہیں کیں جبکہ میری ناچیز رائے میں غلام عباس کو اکیسویں صدی کے چودھویں سال میں بھی مقامِ امتیاز حاصل ہے اور انہیں دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے کیوں کہ ان کے افسانوں میں انسانی زندگی اپنے اصل رنگوں میں ظاہر ہوتی ہے۔لیکن ترقی پسند نقاد نے اس سے اغماض ضرور برتا ہے۔اس کا ذکر آگے آئے گا۔

غلام عباس سے میری شناسائی زمانی اور فنی لحاظ سے قدیم ہے۔ میں نے ان کی کتاب ''قصرِ صحرا'' سکول کے طالب علمی کے زمانے میں پڑھی تھی جب وہ رسالہ ''پھول'' کے اشاعتی ادارہ دارالاشاعت پنجاب لاہور سے وابستہ تھے۔ایک کم عمر بچے کی مہم جوئی کی یہ داستان اتنی دلچسپ تھی کہ میں نے اس کے تاثر کو نشان راہ کے طور پر قبول کیا۔ جب ادبی رسائل ہمایوں، نیرنگِ خیال، ساقی ادبی دنیا اور عالمگیر تک رسائی حاصل ہوئی اور افسانے کے مطالعے کا شوق بڑھتا چلا گیا تو کامران (سرگودھا) کے مدیر انور گوئندی نے سالنامہ ''ادبِ لطیف'' مجھے تھماتے ہوئے کہا ''سب سے پہلے غلام عباس کا افسانہ ''آنندی'' پڑھنا۔ایسا افسانہ اُردو زبان میں تاحال نہیں لکھا گیا۔'' حالاں کہ اس وقت مرزا ہادی رسوا کے ناول ''امراؤ جان ادا'' اور قاضی عبدالغفار کے افسانے ''تین پیسے کی چھوکری'' اور ''لیلیٰ کے خطوط'' کا غلغلہ بپا ہو چکا تھا۔لیکن ''آنندی'' نے جو کیفیت پیدا کی، وہ جداگانہ تھی۔

واضح رہے کہ غلام عباس اُردو افسانے کا ایک بے حد اہم افسانہ نگار ہے اور مطلعِ ادب پر اس وقت سے روشن ہے جب ترقی پسند افسانہ نگاروں نے ابھی دیوارِ دبستان پر لام الف لکھنا بھی شروع نہیں کیا تھا۔لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ جب ترقی پسند تحریک کی آندھی چلی اور شخصی پروپیگنڈے کو فن پر فوقیت دے دی گئی تو غلام عباس کو اس طرح پسِ پُشت ڈال دیا گیا جیسے وہ دنیائے افسانہ کا ایک عام نام بھی نہیں تھا۔ یہ تاثر آہستہ آہستہ نہ صرف فروغ پاتا رہا بلکہ ایک زمانے میں عالم یہ ہو گیا کہ اُردو افسانے کا ذکر چھڑتا تو کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو اور اوپندر ناتھ اشک کے بعد مہندر ناتھ اور عادل رشید کا نام لیا جاتا اور غلام عباس کو جس کے افسانے ''آنندی'' کا تہلکہ پوری ادبی دنیا میں بپا تھا قریباً نظر انداز کر دیا جاتا۔اور اب یہ کہنا درست ہوگا کہ غلام عباس کے فن کی مہک سے تو سارا گلشن خوشبو حاصل کر رہا تھا لیکن معاصر نقاد جو اپنا تنقیدی سفر ترقی پسند تحریک کے سائے میں سرانجام دے رہے تھے ان سے منصوبہ بندی سے اغماض برت رہا تھا۔ان کے فن کے اعتراف میں مسلسل بُخل سے کام لے رہا تھا۔''آنندی''، ''جاڑے کی چاندنی''، ''کن رس'' اور ''گوندنی والا تکیہ'' اُردو فکشن کی اہم کتابیں ہیں لیکن ان میں سے بیشتر کو دوسرا یا تیسرا اشاعتی ایڈیشن دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔غلام عباس اُردو کا ممتاز افسانہ نگار ہے لیکن اس کے فن پر ترقی پسند تحریک کے کمزور ترین افسانہ نگار سے بھی کم لکھا گیا ہے۔اور جب شہزاد منظر نے مغربی پاکستان اُردو اکادمی سے ڈاکٹر وحید قریشی کی معاونت سے اپنی تصنیف ''غلام عباس۔ایک مطالعہ'' پیش کی تو میں کبھی کتاب کو دیکھتا......اور کبھی شہزاد منظر کو جس نے غلام عباس کے فن اور ان کی زندگی کا تنقیدی مطالعہ کرنے کی کوشش کی اور ایک ایسے افسانہ نگار کی نشاۃ ثانیہ برپا کی جس کا فن اُردو افسانے کی آبرو ہے لیکن جو خود اُردو افسانے کا اجنبی ہے۔

میں نے غلام عباس کو اجنبی اس لیے کہا ہے کہ ان کی زندگی کے بہت سے گوشے کبھی منظرِ عام پر لانے کی کاوش نہیں کی گئی، ہم

میں سے بیشتر لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ غلام عباس نے اپنی زندگی کا ابتدائی حصہ غربت اور فکشن کے سائے میں بسر کیا تھا۔ غربت انہیں خدا کی طرف سے عطا ہوئی تھی، وہ نویں جماعت میں تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ خاندان غریب تھا، اس لیے گھر کی ذمّہ داری غلام عباس پر آ پڑی، رزق حاصل کرنے کے لیے تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔ خاندان کے ایک پرانے کرم فرما نے ان کے لیے ریلوے کے محکمے میں نوکری تلاش کی جس کی تنخواہ تیس روپے ماہانہ تھی اور کام چاول کی بوریوں پر نشان لگانا تھا۔ غلام عباس نے ''مارکر'' کی نوکری قبول نہ کی اور اپنی غربت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور یہ ان کی عمر کا وہ دور تھا جب فکشن نے ان پر اپنا گھنا سایہ ڈال دیا تھا۔ انہوں نے پہلی کہانی ''بکری'' کے عنوان سے 1922ء میں لکھی، اس وقت وہ ساتویں جماعت کے طالب علم تھے، نویں جماعت تک پہنچے تو انگریزی میں اتنی استعداد پیدا کر لی کہ انگریزی کہانیوں اور نظموں کا ترجمہ کرنے لگے، ان کے سکول ٹیچر مولوی لطیف علی پابند نے حوصلہ افزائی کی، اس شہہ پر انہوں نے گولڈ سمتھ کے ایک ناول کا ترجمہ کر ڈالا، مطالعے کا عالم یہ تھا کہ سکول کے زمانے ہی میں شرر، رسوا، رتن ناتھ سرشار، حسن نظامی اور راشد الخیری جیسے کلاسیکی ادیبوں کی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ انہیں کو اپنا استاد بنا لیا۔ انہیں سے کسب فیض کیا۔ غلام عباس نے لکھا ہے کہ

''انسان اگر یہ سب کچھ پڑھ لے تو اُردو آپ ہی آ جاتی ہے، مزید کچھ سیکھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔''

غلام عبّاس ان ادیبوں سے متاثر تھے، عبدالحلیم شرر کی کتابیں ان کی ادبی راہنما تھیں۔ لیکن انہوں نے سادہ اسلوب میں لکھنے کی طرح ڈالی، خود تنقیدی کو اصول بنایا اور اپنی زبان کے لیے اصول بھی خود وضع کیے مثلاً انہوں نے دو ہم معنی صفات کو اکٹھا کرنے سے اجتناب کیا۔ عشق و محبت اور رنج و غم جیسی ترکیبیں انہیں فضول نظر آتی تھیں، اس زمانے میں ادب میں زور پیدا کرنے کے لیے محاوروں کا استعمال زیادہ ہوتا تھا۔ غلام عبّاس نے محاوروں کے بنے بنائے سانچے بھی قبول نہیں کیے وہ اوائل عمری میں ہی اس قسم کے کلیشوں سے نکل آئے، 1925ء میں ان کا ترجمہ شدہ افسانہ ''جلاوطن'' شائع ہوا تو اس کی زبان کی تعریف حکیم احمد شجاع، عابد علی عابد اور ہادی حسین صاحب نے کی، نیرنگِ خیال کے سالنامہ 1929ء میں ان کا افسانہ ''محبت کا درخت'' چھپا تو حکیم یوسف حسن نے انہیں 20 روپے پیش کیے، اس معاوضے کی قدر و قیمت کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ 20 روپے میں دو تولے سونا خریدا جا سکتا تھا۔

یہ چند باتیں غلام عباس کے بچپن کے بارے میں تھیں جو شہزاد منظر نے غلام عباس کی زبانی سنیں اور اپنے ٹیپ پر اتار لیں، گویا انہیں آپ شنیدہ ہی نہ سمجھیں بلکہ مصنّف کی آپ بیتی شمار کریں۔ شہزاد منظر نے غلام عباس کا سوانحی خاکہ اس انٹرویو سے ہی اکتساب کیا ہے جو انہوں نے 14 مارچ 1980ء کو سیّد انور، محمد علی صدیقی، علی حیدر ملک اور منظر عالم تپش کی معیت میں لیا اور قریباً دس برس کے بعد پہلی دفعہ اپنی کتاب میں شائع کیا۔ اِس انٹرویو کے سوالات خاصے تیکھے ہیں لیکن جوابات سے جو غلام عباس ہمارے سامنے آتا ہے وہ نفسِ مطمئنہ رکھنے اور نفسِ امارہ جیسے موذی کو کچل ڈالنے والا انسان ہے۔ ان کے فن کو ابتدا ہی میں مرزا محمد سعید، ڈاکٹر تاثیر، امتیاز علی تاج اور مولوی سیّد ممتاز علی جیسے لوگوں نے سراہا۔ اور یہ تحسین کسی نئے لکھنے والے کے ذہن کو فتور آشنا کر سکتی ہے، لیکن غلام عباس کو احساس تھا کہ ''میرا پہلا افسانہ جسے اچھا افسانہ کہنا چاہیے'' آنندی'' تھا جو 1947ء میں لکھا گیا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ غلام عباس کو اچھا افسانہ نگار بننے میں کم و بیش ربع صدی کا عرصہ لگا اور جب یہ افسانہ چھپا تو یہ آواز بھی اُٹھی کہ غلام عباس کا یہ اوریجنل افسانہ نہیں بلکہ ترجمہ ہے یا کہیں سے چرایا گیا ہے۔

غلام عباس اس رائے سے آگاہ تھے اور انہوں نے بلا تاخیر وضاحت کر دی کہ

''آنندی میرے ذاتی مشاہدے کا نتیجہ ہے، دہلی میں اس وقت چاوڑی خالی کی جا رہی تھی، عصمت فروش عورتوں کو جو متبادل جگہ دی گئی تھی، وہ شہر سے باہر دو میل کے فاصلے پر تھی۔ میں نے یہ کیا کہ افسانے میں اس فاصلے کو چھ سات میل کر دیا۔ میں منٹو روڈ (نئی دہلی) میں رہتا تھا اور میرا دفتر نیو علی پور روڈ (پرانی دلّی) میں تھا۔ میں روز تانگے پر آتے جاتے ہوئے دیکھتا کہ کبھی مکان کی بنیاد رکھی جا رہی ہے۔ کسی روز دیکھتا کہ اس کے ستون تیار ہو رہے ہیں، پھر دیکھتا کہ نصف مکان بن چکا ہے۔ اس طرح ہوتے ہوتے افسانہ بن گیا۔''

غلام عباس نے ''آنندی'' کو افسانہ بنتے ہوئے دیکھا تھا لیکن گوندنی والا تکیہ جو ''ماہِ نو'' میں قسط وار چھپا، وہ، ان سے ذاتی مکان کی ضرورت نے لکھوایا تھا۔ واقعہ یوں ہے کہ پاکستان بنا تو وہ نئے ملک کی خدمت کا جذبہ لے کر اور بی بی سی کی نوکری چھوڑ کر کراچی آ گئے، یہاں سر چھپانے کے لیے گھر نہیں تھا۔ چنانچہ مکان کا بندوبست کرنے لگے، بڑی مشکلوں سے زمین الاٹ کرائی، جس کی قسط ہر ماہ ادا کرنی پڑتی تھی، ''ماہِ نو'' کے نگران عزیز احمد نے کہا ''آپ ہر ماہ افسانہ لکھیے، میں سو روپے فی افسانہ ادا کرواؤں گا'' غلام عباس لکھتے ہیں کہ

''کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ مجھے پیسے کی خاطر لکھنا پڑا۔ لیکن ایسی مجبوری آ پڑی تھی، رہائش کا بہت بڑا مسئلہ درپیش تھا۔ اس ناول کی قسط میں ایک رات میں لکھا کرتا تھا۔ آخری رات کو جب مجھے قسط پیش کرنی ہوتی تھی۔''

''گوندنی والا تکیہ'' لوگوں نے پسند کیا لیکن غلام عباس بڑی سچائی سے اعتراف کرتے کہ ''اس میں کئی خامیاں رہ گئی ہیں، میں جو کشمکش دکھانا چاہتا تھا وہ میں دکھا نہیں سکا۔ یہ ناول مجھے پسند نہیں آیا۔ اسی وجہ سے میں نے اسے نہیں چھپوایا۔ کسی نے اسے دلّی میں چھاپ دیا اور اس کا نام بدل دیا۔''

معروف نقاد محمد علی صدیقی نے ترقی پسند تحریک کا سوال اٹھایا اور غلام عباس کے اس خیال کا حوالہ دیا کہ ایک خاص قسم کی ادعائیت اور پروپیگنڈا نے اسے لٹریچر سے پرے کر دیا۔ غلام عباس نے جواباً کہا ''جس زمانے میں ہم نے صحیح معنوں میں لکھنا شروع کیا اس وقت ہم لوگ ''انگارے'' کے افسانوں کی جرأت مندی سے متاثر ہوئے لیکن جب دیکھا کہ ان کے نسخے تو وہاں سے آتے ہیں کہ یہ لکھنا ہے اور یہ کرنا ہے اور ادب پروپیگنڈا کے سوا کچھ نہیں ہے تو مجھے کہنا یہ ہے کہ ادب پروپیگنڈا نہیں، کسی مسلک کی ترویج کے لیے آپ افسانے اور نظمیں لکھنا شروع کر دیں تو یہ خالص صحافت ہوئی، فن نہ ہوا۔ آپ کو یاد ہوگا ایک زمانے میں شاعری شروع ہوئی تھی مزدور، مزدور کا بیٹا، مزدور کی ماں، مزدور کی نانی، مزدور کا باپ......''

اس انٹرویو میں غلام عباس سچے اور صاف گو ادیب ہی نظر نہیں آتے بلکہ معصوم انسان بھی محسوس ہوتے ہیں علی حیدر ملک نے کہا ''آنندی تو آپ کا شاہکار ہے لیکن اس نے فائدے سے زیادہ نقصان پہنچایا، چنانچہ ''آنندی'' سے زیادہ اچھی کہانیوں کا ذکر نہیں ہوتا''...... غلام عباس نے سُن کر کہا ''آنندی تو بس ایسا ہی ایک لطیفہ تھا۔ میری بہت ہی اہمی شش کہانی ''سرخ گلاب'' ہے۔ دو تین کہانیوں میں سے مصنّف کو یاد کیا جاتا ہے، اس میں نقصان کا سوال نہیں ہے۔'' خواتین کے افسانوں کا ذکر آیا تو غلام عباس نے کہا :

''ہماری صنفِ نازک نے سوچا ہے کہ اگر عورت کی زبان سے کھلی کھلی باتیں لکھی جائیں، تیز قسم کی باتیں تو مرد خوش

ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسا نسخہ ان کے ہاتھ آ گیا ہے کہ اب اس لائن پر عورتیں چل پڑیں، اسے عصمت چغتائی نے شروع کیا تھا۔''

غلام عبّاس کے بارے میں یہ چند ذاتی باتیں اور افسانے کے فن کے بارے میں ان کے تصورات میں نے اس لیے پیش کیے ہیں کہ ان کی آگہی سے یہ عظیم افسانہ نگار اپنے حقیقی تناظر میں سامنے آتا اور باندازِ دگر متاثر کرتا ہے۔ غلام عباس کی خوبی یہ ہے کہ وہ زندگی کی ایک چھوٹی سی قاش کو موضوع بنانے کی بجائے زندگی کے وسیع تر اجتماعی احساس کو افسانے میں سمونے کی کاوش کرتے ہیں۔ وہ زندگی کی معنوی وسعتوں کو سمیٹتے اور متعدد کرداروں کو ان کے اعمال اور افعال کی روشنی میں منظر پر اُبھار دیتے ہیں۔ اس کی عمدہ ترین مثال تو ان کا افسانہ ''آنندی'' ہی ہے جس میں کرداروں کا پورا ایک شہر آباد ہے۔ یہ شہر سانس بھی لیتا ہے، ردِعمل بھی ظاہر کرتا ہے اور نقل مکانی بھی اختیار کرتا ہے۔ اور عمل کے ایک دائرے کو مکمل کرنے کے بعد دوسرے نئے دائرے کو جنم دے ڈالتا ہے۔ دائرے کی اس ٹیکنیک کو غلام عباس نے فینسیہیئر کٹنگ سیلون''...... ''چکر'' اور ''جھنور'' میں بھی بڑی کامیابی سے استعمال کیا اور زندگی کے گورکھ دھندے کو اُلجھانے کے بجائے سلجھانے کی کاوش کی ہے۔ اُردو نظم میں اس ٹیکنیک کی مثال مجید امجد نے ''پنواڑی'' میں پیش کی ہے۔

سماجی طنز غلام عباس کے افسانوں کا غالب رجحان نہیں تاہم انہوں نے زیرِ سطح طنز کو اپنے افسانوں میں بڑی کامیابی سے استعمال کیا ہے۔ اس کی ایک خفی رو ''آنندی''، ''ناک کاٹنے والے''، ''کن رس'' اور ''کتبہ'' جیسے افسانوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کا افسانہ ''رینگنے والے'' جلیانوالہ باغ میں گولی چلائے جانے اور پھر مارشل لا نافذ کرنے کے واقعے پر استوار کیا گیا ہے لیکن دو نوجوانوں کا شرط باندھ کر گلی سے رینگنے کا مقابلہ اس افسانے کو ایک نئی جہت دے دیتا ہے اور گورے سارجنٹ کے چہرے پر اچانک اُبھرنے والی اناری سرخی اس افسانے کے طنز کو جلی کر دیتا ہے۔ ''لچک'' اور ''دھنک'' بھی سیاسی طنز کے افسانے ہیں۔ ''دھنک'' ایوب خان کے مارشل لائی دور میں لکھا گیا تھا۔ اس وقت انسان ابھی چاند پر نہیں اُترا تھا۔ ''دھنک'' کے ابتدائیہ میں غلام عباس نے یکم جون 1969ء کو لکھا :

> ''یہ افسانہ میں نے آج سے دو سال قبل لکھا تھا۔ اس وقت میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اجرام فلکی کی تسخیر کے لیے انسانی مہمات شدت اختیار کر لیں گی کہ اگلے دو برس میں انسان کا چاند پر پہنچنا ممکن ہو جائے گا اور اس کے ساتھ ہی ٹیلی وژن کی نشریات میں بھی اس قدر ترقی ہو جائے گی کہ اس کے ذریعے ساری دنیا انسان کی اس فیروز مندی کا تماشا دیکھ سکے گی۔''

''دھنک'' بلاشبہ چاند پر انسان کے اُترنے کی فیروز مندی کا افسانہ ہے لیکن اس کا پورا عمل ہوٹل موہن جوڈارو کے تناظر میں طے پاتا ہے۔ جہاں کٹ ملاؤں کی حکومت قائم ہے۔ اور گردشِ ایام کو پیچھے کی طرف دوڑانے کی کوشش جاری ہے اور ''تسخیر مہر'' کو ''کافرانہ مفروضے'' سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ غلام عباس نے اس سائنسی کامیاب واقعے کے گرد و پیش میں جو کچھ چالیس برس پہلے اپنے متخیلہ سے دیکھا تھا، وہ آج ہم اپنے وطنِ عزیز میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور بلا توقف غلام عباس کے متخیلہ کو پیغمبرانہ قرار دے سکتے ہیں۔ سیّد قاسم محمود نے ''جزیرہ سخن وراں'' اور ''دھنک'' کو جریدی کتاب ''شاہکار'' میں چھاپ کر غلام عباس کی عظمتِ فن پر نئی مہر ثبت کر دی ہے۔

◆◆◆

ادب اور معرکۂ خیر و شر

مسلم شمیم

انسان سماجی زندگی کے آغازِ سفر سے فطرت سے برسرِ پیکار رہا ہے اور آج بھی ہے رموزِ فطرت اور قانونِ فطرت سے اُس کی شناسائی اور آشنائی وقت کے ساتھ فروغ پاتی رہی ہے۔ جہدِ بقا کے مراحل میں انسان کو فطرت سے برسرِ پیکار ہوتے ہوئے معرکہ خیر و شر سے بھی دوچار ہونا پڑا ہے۔

روحِ عصر کی ترجمانی کرنا اور ضمیرِ وقت کی آواز بننا ادب کا منصب رہا ہے۔ اس منصبِ عظیم کی تاریخ کا سراغ لگانا انسانی سماج کے سفر ارتقا کے مطالعے سے جڑا رہا ہے۔ ادب کا بنیادی موضوع اور مرکز و محور انسان رہا ہے۔ انسان جو سماج میں پیدا ہو کر اُس کا ایسا حصہ بن جاتا ہے کہ سماج کے حدود سے باہر رہ کر انسان کی نفسیات سمیت اُس کے مادی اور روحانی تقاضوں اور ترجیحات کی تفہیم ناممکن ہے۔ طرزِ احساس اور حسیت، جو ادب کی تخلیق کے محرکات ہیں، اسی سماج کی دین اور عطا ہیں۔ انسان جن مراحلِ حیات سے دوچار اور جہد و پیکار اور مسائل و مصائب سے نبرد آزما ہوا، ادب میں اس کا اظہار ادبی جمالیات کے دائرے میں ہوتا آیا ہے۔ کرۂ ارض پر انسان کی کہانی نظریہ تخلیقِ ربانی کی روشنی میں آدم و حوا سے شروع کی جائے یا سائنسی تحقیقات یعنی نظریہ ارتقا کے مطابق، بات ہزاروں بلکہ لاکھوں سالوں کی ٹھہرتی ہے۔ انسانی زندگی میں دکھ اور سکھ کی داستان کے ساتھ نیکی اور برائی یعنی خیر و شر کے مابین تصادم و معرکہ آرائی کی داستان کا تسلسل روزِ اول سے پایا جاتا ہے۔

خیر و شر کے تصورات انسانی فکر و احساس اور عقائد کا جزوِ لاینفک اور ارتقا پذیر رہے ہیں انسانی شعور کی تربیت اور رہ نمائی میں مذاہبِ عالم کا کلیدی کردار رہا ہے۔ مذاہبِ عالم میں خیر و شر کے حوالے سے اس حد تک قدرِ مشترک پائی جاتی ہے کہ ہر مذہب خیر کی حمایت و تائید کا دعویٰ کرتا ہے اور شر کی مخالفت اور شر کے خلاف جہد و پیکار کو اپنے بنیادی عقائد کا حصہ قرار دیتا ہے۔ یہ علاحدہ حقیقت ہے کہ ہر مذہب کا تصور خیر و شر کے حوالے سے ایران کے قدیم مذہبی رہ نما زرتشت کے یہاں خیر و شر کے جدا جدا خدا ہیں، یعنی یزداں و اہرمن۔ ہندو مذہب میں رام اور راون خیر و شر ہے جس میں خیر کی فتح ہوئی اور شر کی شکست۔ رامائن کے خالق کالی داس نے اس معرکہ خیر و شر کو ایک عظیم رزمیہ سے EPIC بنا دیا ہے اور اسے تخلیقی شاہکار تسلیم کیا جاتا ہے۔ مذاہب ابراہیمی میں خیر و شر کے معرکوں کا تسلسل اسلام تک جاری رہا۔ حضرت ابراہیمؑ کا آتشِ نمرود سے سرخ رو لانا خیر کی فتح کا اعلان نامہ تھا۔ اس حوالے سے علامہ اقبالؔ کا یہ شعر

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

معنویت کا حامل ہے۔ اسلام میں عقیدۂ توحید کے باوجود جبریل اور ابلیس کو گویا خیر و شر کی دو تلمیحات کے طور پر ادب میں بھی

جانا اور برتا جاتا ہے۔ 'یا ربِ خیر' کے زیرِعنوان میرے پہلے شعری مجموعے 'امکان' کا سرنامہ ہے۔ ملاحظہ ہو:

مصلوب روحِ عصر ازل سے ہے آج تک　　　دھرتی پہ جبر و جور کا کب اختتام ہوا

ادب آغازِ سفر سے خیر کا ہم نوا اور شر کا حریف رہا ہے۔ معرکہ خیر وشر کی تاریخ عالمی تہذیبی تناظر میں خود ایک بڑا موضوع ہے۔ یہاں اس حد تک بات رکھی جائے گی کہ ادب کے خمیر اور طینت کی تفہیم میں کوئی ابہام نہ رہے۔ مولانا رومیؔ نے ''شاعری جزو یست از پیمبری'' کہہ کر ادب کے خیر کے پرچارک ہونے کی تصدیق کر دی ہے۔ سعدیؔ شیرازی کی گلستان و بوستان میں منثور و منظوم حکایاتِ خیر کی تائید اور پرزور حمایت اور شر کی خباثتوں اور فتنہ سامانیوں کو بے نقاب کرنے سے عبارت ہیں۔ مولانا الطاف حسین حالیؔ کا مسدس مدو جزرِ اسلام اور علامہ اقبالؔ کی متعدد بڑی نظمیں اس زمرے میں شامل کی جا سکتی ہیں۔ ادب میں کہیں اور کسی مرحلے پر شر کی قوتوں کی تائید کی روش نہیں پائی جاتی۔ معرکہ خیر و شر کے حوالے سے تاریخِ ادب میں غیر جانب داری کی کوئی روایت اور رویہ نہیں پایا جاتا۔ ادب نے ہمیشہ خیر، یعنی حق کی تائید میں کلیتہً جانب داری کا کردار ادا کیا ہے۔ معرکہ خیر و شر اور معرکہ حق و باطل مترادفات کا درجہ رکھتے ہیں۔ ادب میں معرکہ حق و باطل کے باب میں واضح صف بندی نظر آتی ہے اور ادب حق کی قوتوں کے دوش بدوش کھڑا نظر آتا ہے۔ معرکہ کربلا اس ضمن میں سب سے بڑا حوالہ بنتا ہے۔ مولانا ظفر علی خاں نے یہ کہہ کر کہ

قتلِ حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے　　　اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

رزمِ حق و باطل میں ادب کا واضح ترین موقف بیان کر دیا گیا ہے۔ یہاں حضرتِ معین الدین چشتی کے چار مصرعے بھی اس موقف کی تائید میں نذرِ قارئین ہیں۔

شاہ ہست حسینؓ، بادشاہ ہست حسینؓ　　　دیں ہست حسینؓ، دیں پناہ ہست حسینؓ
سر داد نہ داد دست در دستِ یزید　　　حقا کہ بنائے لا الہ ہست حسینؓ

اردو شاعری میں مرثیے کی صنف میں انیسؔ و دبیرؔ سے لے کر جوشؔ اور جمیل مظہری تک حق اور خیر کی نمائندگی کرنے والی شخصیات کے لیے جو کچھ کہا گیا ہے، وہ ہمارے ادب کا ایک بڑا اثاثہ اور ورثہ ہے۔ سانحہ کربلا نے اردو مرثیے کے علاوہ اردو شاعری میں علامات و استعارات کا ایک گنجینہ عطا کیا ہے۔ تاریخ نے بڑے بڑے جنگ بازوں اور فاتحین کو عظیم قرار دیا ہے جو جارحیت کے بھیانک جرم کے مرتکب اور لاکھوں انسانوں کی ہلاکتوں کے مرتکب ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں جہاں لاکھوں انسان قتل ہوئے، اُن کے سروں کے مینار سجائے گئے، وہاں تہذیب و تمدن اور ثقافت کی تباہی اور بربادی تاریخ میں مرقوم ہوئی، مگر سکندر سکندرِ اعظم کے نام سے تاریخ میں جانا جاتا ہے، اشوک کو کالنگا کی جنگ میں لاکھوں انساں کی لاشوں کا منظر نامہ سجانے کے اعتراف میں اشوکِ اعظم کے خطاب سے نوازا گیا۔ ہر چند کہ اس جنگ کی ہلاکتوں کا نظارہ دیکھنے کے بعد وہ جنگ سے تائب ہو گیا اور ہندو مذہب ترک کر کے بودھ مذہب کا پیرو بن کر بقیہ عمر خلقِ خدا کی خدمت میں صرف کر دی اور سماجی امن کا پیامبر بنا۔ چنگیز خاں (1162ء-1237ء) کو منگولیہ والے اپنا ہیرو مانتے ہیں اور اُنھوں نے اُس کے ایک عظیم الشان گھوڑے پر سوار مجسمے کو اپنی قومی شناخت کے طور پر نصب کیا ہوا ہے۔ ہلاکو خاں نے (1258ء) بغداد کو تباہ و برباد کیا اور خلافتِ عباسیہ کے خاتمے کا باعث بنا۔ بغداد کے عظیم الشان کتب خانوں اور دیگر عالمی خزانوں کو نذرِ آتش کیا۔ ہلاکو خاں بھی منگولوں کا ہیرو ہے۔ تیمور جس نے وسطِ ایشیا کے متعدد ملکوں کو اپنی بدترین جارحیت کا ہدف بنایا اُس نے دہلی کی بھی اینٹ سے اینٹ بجائی، مگر آج بھی

ہمارے شہر، یعنی شمالی ناظم آباد کو سرکاری طور پر تیموریہ کا نام دیا گیا ہے اور شمالی ناظم آباد میں ایک تیموریہ لائبریری بھی تعمیر کی گئی جو قائم و دائم ہے۔ مغلیہ سلطنت کے دودمان اپنے کو آلِ تیمور و چنگیز کہنے میں فخر کرتے رہے ہیں تاریخ ادب میں یہ تاریخ کے ہیروز ہمیں نظر نہیں آتے بلکہ انھیں انسانیت کے قاتلوں کے گروہ کے سرخیل کے طور پر ادب کی مختلف اصناف میں شامل فہرست کیا گیا ہے اور جبر و ظلم کے علم بردار اور انسانی اقدارِ حیات کے گورکنوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ادب کے دامن پر انسانیت کے ان قاتلوں کی تعریف و توصیف کے داغ اور دھبے ہمیں کہیں نظر نہیں آتے، بلکہ جبر و استحصال کے مقابلے میں خیر کے پرچم برداروں کو ادب میں استعارات، تلمیحات اور علامت حق و خیر کے طور پر شعر و ادب کی جمالیات کا زیب زینت بنایا گیا۔ سقراط، مسیح، حسین، منصور حلاج، سرمد شہید اور حسن ناصر ہمارے ادبی ورثے میں تلمیحات کے طور پر برتے جاتے ہیں اور بالیدگی کا سرچشمہ ٹھہرتے ہیں۔

ماضی میں تاریخ نے جنگ کو GLORIFY کیا ہے، جبکہ جنگ میں بنیادی طور پر جارحیت اور قتل و غارت گری کی کارفرمائی ہوتی ہے، اور جنگ میرے نزدیک شر کی بھیانک شکل ہے۔ جنگ کے حوالے سے نہ تائید ایزدی کی کوئی بات منسوب کی جاسکتی ہے اور نہ اسے مشیتِ ایزدی کا نام دیا جاسکتا ہے۔ جنگ کے بنیادی محرکات سیاسی اور اقتصادی مفادات ہوتے ہیں۔ اسی تناظر میں کارل مارکس نے تاریخ انسانی میں درج تمام جنگوں کو جنگِ زرگری قرار دیا ہے۔ جنگ کو اس طرح زمرۂ شر میں شمار کیا جانا چاہیے اور امن کی طاقتوں کو خیر کا علم بردار کہنا اور تحریکِ امن کو تحریکِ خیر کا نام دیا جانا چاہیے۔ ادب کے جدید عہد کے موضوعات میں سماجی امن اور امن عالم کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ الفریڈ نوبیل کے ادارے نے کئی علوم کو نوبیل انعام کے لیے منتخب کیا ہے اور 1901ء سے یہ عالمی شہرت کے حامل انعامات دیے جا رہے ہیں۔ ان میں ادب اور امن کے موضوعات بھی شامل ہیں۔ امن کے حوالے سے فیض احمد فیضؔ کو لینن امن انعام دیا گیا تھا جو نوبیل انعام کا ہم منصب اور ہم رتبہ تھا۔ فیضؔ صاحب کی ایک مختصر نظم بعنوان 'امن' اس حوالے سے نذرِ قارئین ہے:

امن اور آزادی بہت حسین اور تابناک چیزیں ہیں
امن گندم کے کھیت ہیں
سفیدے کے درخت ہیں، دُلھن کا آنچل ہے
بچوں کے ہنستے ہوئے ہاتھ ہیں
شاعر کا قلم ہے اور مصور کا موقلم
آزادی ان سب صفات کی ضامن
اور غلامی ان سب خوبیوں کی قاتل

امن دائرہ خیر میں انسانی خوش حالی، ترقی اور مسرتوں کا سرچشمہ اور روشنیوں کا منبع ہے جنگ شر کے دائرے میں اندھیرے اور مصائب و آلام اور شرفِ بشر کی قاتل ہے۔ امن کے موضوع پر عالمی ادب میں مختلف اصناف میں گراں مایہ تخلیقات اور تصنیفات منصۂ شہود پر آئی ہیں جن میں ٹالسٹائی کا ناول 'WAR PEACE' عالم گیر شہرت کا حامل ہے۔ ترقی پسند تحریک جو 1936ء میں شروع ہوئی تھی، اُس تحریک کے زیرِ اثر امن اور آزادی کا موضوع ادب کا اہم ترین موضوع قرار پایا۔ ترقی پسند تحریک دراصل جرمنی اور اٹلی کی فسطائیت کے مدِ مقابل ثقافت اور امن کے دفاع میں شروع ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں 1935ء میں پیرس میں بین الاقوامی کانفرنس امن اور ثقافت کے دفاع

میں منعقد کی گئی تھی جس میں اُس وقت کے دنیا کے نام ور ترین ادیبوں نے شرکت کی تھی۔ سجاد ظہیر اور ملک راج آنند اُس کے شرکا میں شامل تھے۔ اس تناظر میں ترقی پسند تحریک کو شر (جنگ) کے مدِ مقابل ایک اہم تحریک خیر کا منصب دیا جانا چاہیے۔

تاریخ انسانی کو تاریخی جدلیات کی روشنی میں آغازِ تمدن سے طبقاتی کشمکش کی تاریخ کہا گیا ہے، یعنی ظالم و مظلوم، قاہر و مقہور، قاتل و مقتول، استحصال کے شکار طبقات اور استحصالی طبقات بالفاظِ دیگر HAVES اور HAVE NOTS کے درمیان ایک جنگِ مسلسل انسانی معاشرے کے آغازِ سفر سے جاری و ساری ہے۔ ادب میں ظلم کے خلاف اور عدل کی تائید اور حمایت میں واضح موقف پایا جاتا ہے۔ ہر دور میں ادب سے وابستگان نے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی اور اُس کی پاداش میں صلیب و دار کے مراحل سے بھی گزرے ہیں۔ مظلوم طبقات کی حمایت ادب کا مسلک و مشرب رہا ہے۔ جبر و استحصال کی تمام صورتوں کی نفی کرنا قلم قبیلے نے اپنے فرائضِ منصبی میں شامل کر لیا ہے۔ امن سے محبت ایک عظیم جذبہ خیر ہے۔ محبت تو ادب کی دنیا کا مذہب بنا رہا ہے بقول ساغر نظامی:

کافر ہوں میں کافر ہوں، مرا کفر محبت　　　یہ کفر مجھے حاصلِ ایماں نظر آیا ہے

اسی زمرے میں یہ شعر بھی پڑھا جانا چاہیے:

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو　　　ورنہ، اطاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرو بیاں

محبت کا ایک نغمہ امیؔر مینائی کے یہاں مختلف آہنگ اور لہجے میں گونجا ہے۔ ملاحظہ ہو:

خنجر چلے کسی پہ، تڑپتے ہیں ہم، امیؔر!　　　سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

محبت ادب کی روح ہے اور محبت کے سرچشمے ادب کی مختلف اصناف سے پھوٹتے رہے ہیں محبت اپنے وسیع ترین مفہوم اور دائرے میں اخوتِ انسانی کی اساس کہی جا سکتی ہے اور تمام تر انسانی رشتوں کے درمیان تانے بانے کے کردار کی حیثیت رکھتی ہے۔ معرکہ خیر و شر میں ادب کا بہت وقیع حصہ اور بہت اہمیت کا حامل کردار رہا ہے۔ ادب میں معرکہ خیر و شر کی جہتوں کا احاطہ کرنا ممکن نہیں، لہٰذا کچھ حوالوں پر اکتفا کرتے ہوئے موضوع گفتگو آگے بڑھاتا ہوں۔ ہماری داستانوں میں جو کردار پیش کیے گئے ہیں، اُن کے مطالعے سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ مثبت اور منفی کرداروں کی کردار نگاری میں خیر و شر کی لکیر واضح طور پر کھینچی گئی ہے اور خیر کے علم برداروں کی عظمت و فضیلت کے اظہار میں کسی ابہام کو راہ نہیں دی گئی ہے۔ ہماری شاعری میں تصوف کا ایک بڑا گراں قدر حوالہ ہے اور حضرتِ امیر خسرؔو اور مولانا رومؔی سے لے کر حضرتِ شاہ لطیف بھٹائی اور خواجہ میر دردؔ تک صوفیانہ خیالات اور تصورات کے خلاقانہ اظہار کا خزینہ ہمارے ادبی ورثے کا انمول حصہ ہے۔ یہ پوری شاعری خیر کے فروغ و فضیلت کا اثاثہ ہے صوفیائے کرام کی انسانی دوستی اور رواداری پر مبنی انسانی رشتوں کی تکریم و توقیر شر کی قوتوں کو کلیتہً مسترد کرنے سے عبارت ہے۔ مظلوم انسانیت اور جبر و استحصال کی شکار اکثریتی آبادی کے حقوق کے حق میں قلم کاروں نے بہ بانگِ دہل آواز اٹھائی ہے۔ 1886ء میں شکاگو میں مزدوروں کے خون سے شکاگو کے شہر کی سڑکوں کا لہولہان ہونا تاریخ عالم کا سانحہ عالمی پیمانے پر یومِ مئی کے حوالے سے ہر سال منایا جاتا ہے اور اسے مزدوروں اور مظلوموں کی شکست کے بجائے اُن کی فتح مندی قرار دیا جاتا ہے، اور یہ سانحہ اردو شاعری میں ایک رزمیے کی حیثیت سے تاریخ ادب کا حصہ ہے۔ ترقی پسند شعرا کی شاعری میں یومِ مئی ایک بڑا موضوع اور حوالہ ہے۔ 1886ء میں شکاگو کا سانحہ معرکہ خیر و شر کی تاریخ کا ناقابلِ فراموش واقعہ ہے، اور اس معرکے میں ادب خیر کے پرچم کی سر بلندی کا مغنی و مطرب ہے۔ مجروؔح سلطان پوری کا یہ شعر مذکورہ رزمیے کا سرنامہ ہے:

ستون دار پہ رکھتے چلے سروں کے چراغ　　جہاں تک یہ ستم کی سیاہ رات چلی

معرکہ خیر وشر جاری وساری ہے اور اس معرکہ آرائی کے حاصلات میں شرف شر کی فتح ونصرت کی داستانیں تاریخ عالم میں جگہ پا چکی ہیں۔ تہذیب وتمدن کے سفر پیش رفت کا مطالعہ عام انسان بلکہ مظلوم طبقات سے تعلق رکھنے والے انسان کے حوالے سے کیا جائے تو ہزاروں سالوں پر محیط عرصہ تاریخ میں انسان جو کبھی غلام تھا، وہ آج آزاد انسان ہے اور جمہوریت کے سیاسی اور سماجی نظام میں اُسے ہر طرح کے تفریق وامتیاز سے بالاتر مقام حاصل ہو گیا ہے۔ یہ ایک بڑی زمینی حقیقت ہے کہ آج بھی نظام جبر واستحصال قائم ہے مگر رو بہ زوال ہے۔ اصولی طور پر اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے منشور (1948ء) میں انسان کی عظمت اور اصولی فتح مندی کا اعلان ہو چکا ہے اور عام انسان رنگ ونسل اور جنس کے امتیاز وتفریق کی زنجیروں سے آزادی حاصل کر چکا ہے۔ یہ سب کچھ خیر کی فتح کی کہانی ہے، اور یہ کہانی آ کے ادب میں مختلف اصناف اور مختلف رنگ وآہنگ کے ساتھ وقیع تر ہوتی جا رہی ہے۔ علامہ اقبال نے اس حوالے سے نئے عہد کے جمہوریت کے پرچم تلے مظلوم غریب عوام کو رزم آرائی کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا:

"اٹھو! مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو　　کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے　　کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے　　پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو"

غرض ادب معرکہ خیر وشر میں روزِ ازل سے شامل رزم و بزم ہے اور قلم کی روشنائی میں خیر کی روشنی شامل تابندگی ہے۔ خیر کے پرچم کی سربلندی ادب کی سربلندی کا نشانِ راہ ہے اور شر سے نبرد آزما ہونے اور رہنے کی بوطیقا ہے۔

◆◆◆

بیرون ممالک اور اندرون

ادبی دنیا میں مسلسل 45 سال سے سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

ادبی رسالہ ماہنامہ "تخلیق" کے 2013ء میں شائع ہونے والے چار شمارے

مارچ 2013

جون 2013

ستمبر 2013

دسمبر 2013

ارمان نجمی (انڈیا)

سفر تو کردی و من در وطن غریب شدم

تم کو جانا تھا
اس گردشِ آسماں سے پرے
روک سکتا تو میں روک لیتا تمہیں
تم جو نکلے تھے لمبے سفر کے لئے
صرف ایفائے وعدہ کی خاطر
ادھر آ گئے
کچھ دنوں منتظر چاہتوں کو
گلے سے لگا تو گئے
کچھ دنوں کے لئے ہی سہی
اپنی مٹی کی مانوس خوشبو میں
خود کو بسا تو گئے
اپنی آفت زدہ بستیوں کی المناک روداد
کہتے ہوئے
آئینۂ ظلمت روز وشب کا دکھا تو گئے
غم زدہ اہلِ خانہ کی نیندیں
درد کی وادیوں میں
ابھی تک ہیں کھوئی ہوئی
جانے کب لوٹ کر آئیں گی
تم سے جو رشتۂ جان وتن تھا بتاؤں کسے
نارسائی کا قصہ سناؤں کسے

OOO

ایوب خاور

آخر کس دن

آخر کس دن
اس کھڑکی میں
صبح بہار کی آنکھ کھلے گی
کس دن کنجِ خواب سے باہر
وصل کا پھول کھلائے گی
ان آنکھوں کی اوٹ میں چھپ کر
کس دن آخر رنگ لباس اُتاریں گے
اور کس دن خوشبو ان ہونٹوں کے
خواب کنارے چھو کر مجھ میں
لمس کی لَو مہکائے گی
آخر کس دن
موجِ خزاں اُس آنچل کے سائے میں سمٹی
اصلِ بہار چرائے گی!

OOO

شاہین (کینیڈا)

عالی رنگ

چاروں اور نظر دوڑائے تھر تھر کرتا جائے
کمرے بیچ اکیلا پنچھی شیشے سے ٹکرائے

سواگت کرنے دوار پہ گوری، آئے، دیا اُٹھائے
پَون چلے، سایا پیتم کا، ٹکڑوں میں بٹ جائے

مدھو شالا میں رات ہوئی تو لہرائی یہ تان
پاپ اور پُن کے بیچ ہے پیارے اک گنگا اشنان

رات بِرات نہ جانا ساجن اُس بگیا کی اور
جہاں منڈیر پہ چھپ کر بیٹھیں دھنش لئے چِت چور

گیانی جانے گیانی کی پشپانجلی کے بھید
میرا چرن چھونا ہی منتر میرا چرن چھونا ہی دید

دھرم کی ساری باتیں لیکن ہِنسا کے سب کام
رام کے نام کو جپنے والے بن گئے ناتھو رام

OOO

ابصار عبدالعلی

گیت

نار سوہنی لچکے شاخ چنبیلی سی
لہرے، ڈولے، مہکے من کے آنگن میں
کلی کھلی ہو جیسے نئی نویلی سی

کرنیں دستک دیتی ہیں اس کے دُوارے
آتے ہیں آکاش سے ملنے کو تارے
اُس کی چال ہوا کی ہے اٹھکھیلی سی

آن منڈیرے پنچھی سُر بکھراتے ہیں
گیت ملن کے سارے گاما گاتے ہیں
من کٹیا لگتی ہے پریم حویلی سی

اتنی پیاس، سمندر سارا پی جاؤں
آس میں اُس کی جنم جنم میں جی جاؤں
من میں ہو صورت اُس کی البیلی سی

OOO

منظر ایوبی

قطعات

سُن لیں جنھیں دعویٰ ہے بہت راہبری کا
مرغوب زلیخائے سیاست نہیں ہم کو
ہم یوسفِ دوراں بھی ہیں اور خضر صفت بھی
منظور کسی کی بھی قیادت نہیں ہم کو

جو حشر ہو گا حشر میں معلوم ہے مگر
ہے اِن دنوں بپا وہ قیادت تو دیکھئے
لینے چلے ہیں ہم سے حسابِ وصال و ہجر
سوداگرانِ عشق کی جرأت تو دیکھئے

یہ دور بھی ہمیں سے لہو مانگ رہا ہے
ہم کشتگانِ درد کی قسمت عجیب ہے
اک ہاتھ میں ہیں پھول تو اک ہاتھ میں سناں
طرزِ تپاکِ اہلِ محبت عجیب ہے

OOO

نجمہ عثمان (برطانیہ)

گرین ہاؤس

اس کے اندر اور باہر کا منظر
ایک سا رہتا ہے
اس کی چھت اور دیواروں کے شیشوں سے
موسم کی تبدیلی کے
سب رنگ عیاں ہو جاتے ہیں
اور بدلتی رُت کے سارے عکس بھی اس کے شیشوں میں
گھل مل کر رہ جاتے ہیں
گرین ہاؤس کے پودے سب
موسم کی نسبت سے اُگتے، بڑھتے پھلتے ہیں
پھر پت جھڑ کے آتے آتے
اپنی اپنی جڑ میں گھس کر سو جاتے ہیں
کچھ ایسے ہیں جو برگ و بار کی محرومی سے
بددل ہو کر مر جاتے ہیں
اپنے گرین ہاؤس میں بیٹھ کے اکثر......
خوابیدہ پودوں سے باتیں کرتی ہوں
اپنے دکھ اور غم کے قصوں کو
گرین ہاؤس کی دیواروں پر
اشکوں سے لکھ دیتی ہوں
پھر ہریالی کے موسم میں
گرین ہاؤس کے پودوں کی
ہر تازہ کونپل کے اوپر
اک رنگ الگ سا آتا ہے
شاید اس میں،
میرے غم کا بھی حصہ ہے

OOO

سیفی سرونجی (انڈیا)

O

بونے بھی کرنے لگے پھر تو مجھ پہ وار
میں نے اپنے ہاتھ سے رکھ دی جب تلوار

تیرے دھرتی آسماں ترا سب سنسار
تو ہے جگ کا بادشاہ میں مفلس نادار

بیوی بچے سو گئے سب نے چھوڑا ساتھ
ماں نے آ کر ایسے ہی سر پر رکھا ہاتھ

پل دو پل کے ساتھ کو اس نے جانا کھیل
دل پر اک جھٹکا لگا جیسے چل دی ریل

کیسی پریاں گاؤں کی، کیسا سُندر روپ؟
لکھے ہوں جب بھاگ میں جنگل کانٹے دھوپ

OOO

آصفہ نشاط (کیلی فورنیا)

گیت

کوئی گیت گنگناؤ مجھے نیند آ رہی ہے
میرے پاس بیٹھ جاؤ مجھے نیند آ رہی ہے

وہ پرانا گیت شاید تمھیں یاد ہو ابھی تک
وہی گیت پھر سے گاؤ مجھے نیند آ رہی ہے

میری چوڑیاں چھوئیں تو یہ کھنن کھنن بجیں گی
انہیں ہاتھ نہ لگاؤ مجھے نیند آ رہی ہے

یہ ہوا ہے بھیگی بھیگی کہیں ہو رہی ہے بارش
ذرا لکڑیاں جلاؤ مجھے نیند آ رہی ہے

یہ مقام زندگی میں کبھی پھر نہ آئے شاید
کہیں دور تم نہ جاؤ مجھے نیند آ رہی ہے

OOO

فوقیہ مشتاق (امریکہ)

مرے آنسو بھی ہجرت کر چکے ہیں

مجھے اب کچھ نہیں کہنا
مجھے اب کچھ نہیں سننا
مری وحشت جنوں کی آخری حد تک
پہنچ کر لوٹ آئی ہے
مرے اندر تلاطم کو بپا ہونا تھا جتنا
ہو چکا ہے
صدائیں جس قدر دینی تھیں وہ میں
دے چکی ہوں
مرے آنسو بھی ہجرت کر چکے ہیں
سکوتِ مرگ سا طاری ہے دل پر
کہ اب ہونے کی کس منزل پہ ہوں میں
مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے
مرا دل اب یونہی خاموش رہنا چاہتا ہے
کوئی دُکھ مجھ کو سہنا چاہتا ہے

OOO

نورزمان ناوکؔ

دوہے

کونپل گھاس کی باہر نکلے پتھر میں کر چھید
تو بھی او ماٹی کے پتلے کھول جیا کے بھید

کیسا کومل باج رہا تھا خاموشی کا ساز
کرچی کرچی کر گئی اُس کو جھینگر کی آواز

اندھیارے کو پاچ وہ دیوے اُجیارے کو کاچ
اپنی بُدھی میں نہ آوے یار سمے کا جاچ

ودیا اور ہشیاری ہی سے ملتا جو جلپان
کیسے چڑھتے اس سنسار کے اَن ودیا پروان

لاکھ جتن کر ہاری میّا منتر پڑھے ہزار
جادو ٹونے سے کب جاوے پریت کا دُکھ آزار

اِکتارے کی دُکھیا دُھن پر گاتا جائے رَنک
بچھو سے بھی زہریلا ہے اکلاپے کا ڈنک

تیری ہی سب دین ہے داتا ہریالی اور سُوکھ
ندی کنارے بھی دیکھے ہیں ہم نے سوکے رُوکھ

OOO

عبیرہ احمد

زلیخا پاک داماں تھی

ظہورِ عشق سے پہلے
زلیخا پاک داماں تھی
مورخ یہ نہیں لکھتا
پیمبر اور پیمبر زادۂ کنعاں کو جن
گوہر شناس آنکھوں نے پرکھا تھا
ہوس کی کارگہ میں
خوبرو، سستے نظاروں کی تماشائی کبھی نہ تھیں......
مورخ یہ نہیں لکھتا
کہ بے انصاف تو وہ تھا
کہ جس نے یوسفِ گم گشتہ کو بے مول بیچا تھا
مورخ مصر کے بازار کے سوداگروں کی
کور چشمی کی حکایت کیوں نہیں لکھتا؟؟
مورخ یہ نہیں لکھتا
کہ مائل ہونے والی اور مائل کرنے والی
نمودِ جلوہ ہائے عشق سے پہلے
عزیزِ مصر کی عورت کبھی نہ تھی
سُنو! میں بھی زلیخائے زماں ہوں
میں بتاتی ہوں
کہ جب تک عشق کی بازی گری
میں سرنگوں نہ تھی
پیمبر زادۂ کنعاں کی دُھن میں سرگراں
نہ تھی
زلیخا پاک داماں تھی
مورخ دردِ ہجراں کی نہایت کیوں
نہیں لکھتا؟؟
زلیخا پر کھلے جو وحشتوں کے ذائقے
سب میں نے چکھے ہیں
زلیخا مبتلائے حسنِ یوسفؑ نے
تو بہر حسنِ عالم جسم رکھا تھا
پر میں نے حرف رکھے ہیں
مورخ حرفِ حق لکھتا ہے
تو پھر حرفِ جذبِ عشق آخر
کیوں نہیں لکھتا؟؟
مورخ کچھ نہیں لکھتا
زلیخاؤں سے پوچھو
کون تھی؟
کیوں چاک داماں تھی......؟
ظہورِ عشق سے پہلے زلیخا پاک
داماں تھی

OOO

جاوید زیدی (امریکا)

شجرِ ممنوعہ

(گریفیٹی آرٹ)

یہ بوسیدہ دَرو دیوار
جو خاموش تماشائی تھے
خستہ تن، تشنہ دہن
روغن و رنگ کے شیدائی تھے
آس میں تھے کہ کوئی پیاس مٹانے آئے
شہر برباد کو آباد کرانے آئے
سوغول کے غول بلائے گئے فنکاروں کے
بھوکے آوارہ آرٹ کے متوالوں کے
قابلِ دید تھا جذبہ ان کا
یہ عزادارانِ غم آرٹ کے عنوان بدلنے نکلے
اپنے بیمار کی پہچان بدلنے نکلے
نقشِ حسرت سے یہ
فکرِ انسان بدلنے نکلے
زورِ موئے قلم سے
معلق دنیا کو ہنسایا پھر یوں
مُردہ لندن کو جگایا پھر یوں
منظر و موسمِ دل
پیمانۂ رنگِ محفل
بدلنے سے لگے
بھولے ہوئے کھنڈرات
مچلنے سے لگے
زندگی کے نئے
قافلے چلنے سے لگے!

OOO

افسانے

محبت کبھی مرجھاتی نہیں

عطیہ سید

میں جب یونیورسٹی کیمپس کے پوسٹ گریجویٹ ہوسٹل میں منتقل ہوئی تو پہلی مرتبہ اپنی شریکِ رہائش کو دیکھا۔ اس نے گرم جوشی سے میرا استقبال کیا اور میں اس کا سراپا دیکھتی رہی۔ لمبے سیاہ بالوں، سیاہ آنکھوں، سفید رنگت لانبے چھریرے بدن والی ڈیبی جس کے نفیس نقوش کسی سنگ تراش کی ماہرانہ کاوش کا شاہکار دکھائی دیتے تھے۔ وہ اکثر امریکن لڑکیوں سے مختلف تھی جو عموماً لمبی تڑنگی، فربہ اندام، چوڑی چکلی اور مردنما ہوتی تھیں، بے شک ان کی آنکھیں نیلی ہوں اور بال سنہری یا بھورے۔

''میں ڈیبی ہوں یعنی ڈیبورا (Deboraha)...... ویسے تم مجھے ڈیبی کہو تو میں زیادہ اچھا محسوس کروں گی۔''

''یقیناً، میں وہی کہوں گی جو تمہیں پسند ہو۔''

میں نے اپارٹمنٹ کا جائزہ لیا اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ نیویارک کی بھیانک رہائش گاہوں سے نجات ملی جن کی خارجی شان و شوکت اور اندرونی زبوں حالی ایک ایسی عورت جیسی تھی جو غازے اور سرخی کے لیپ پوت سے اپنے آپ کو دنیا کی نظروں میں قبول صورت بنائے رکھتی ہے۔ کمرہ اچھا خاصا وسیع تھا۔ سڑک کے رُخ کھڑکیاں تھیں جن پر اس وقت روشنی چھن چھن کر آ رہی تھی اور جس میں ڈیبی کا وجود دمک رہا تھا۔ کھڑکیوں کے باہر ایک گول قطعہ سرسبز تھا جس کے گرد سربلند درخت کھڑے تھے۔ اس سرسبز قطعے کے دوسری جانب یونیورسٹی پروفیسروں کی رہائش گاہیں تھیں جو پچیس پچیس منزلوں پر مشتمل تھیں۔ ڈیبی نے مجھے وہ باورچی خانہ دکھایا جو اس ایک بیڈ روم اپارٹمنٹ کے لحاظ سے اچھا خاصا تھا۔ اس کے برابر میں ڈریسنگ روم اور اس سے جڑا ہوا غسل خانہ بھی۔ اس کے بعد اس نے ڈریسنگ روم کی دو الماریوں میں سے ایک میرے حوالے کر دی۔ میں اپنا بکس کھینچ کر الماری کے سامنے لے آئی اور اپنے ملبوسات ہینگروں پر لٹکانے لگی۔ اس کے بعد نیچے ریک پر جوتے رکھے۔

باورچی خانے میں گئی تو معلوم ہوا کہ فریج تھا، مگر خالی...... برتن تھے پر ڈیبی کے۔ سو مجھے اپنے لیے برتن بھی خریدنے تھے، اگرچہ از راہ عنایت پہلے دن مجھے ڈیبی نے اپنے برتن استعمال کرنے کی اجازت دے دی تھی۔

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی اور ڈیبی دوڑ کر روزنِ در سے جھانکنے لگی۔

''اوہ! یہ تو ڈینیل ہے۔'' اس کا اشتیاق جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

''ڈینیل کون؟''

"تم خود ہی دیکھ لو گی۔"

ڈیبی نے بے دلی سے دروازہ کھولا۔ایک درمیانے قد کا خوش شکل نوجوان بازوؤں میں گتے کے دو بڑے ڈبے لیے داخل ہوا۔ اس کی آنکھیں براہِ راست ڈیبی پر جا کر ٹک گئیں......پُر جوش اور محبت بھری۔

"تمہارا سامان کہاں رکھوں؟"

"ادھر کونے میں......ابھی ڈبے خالی کیے دیتی ہوں......جاتے ہوئے لے جانا۔"

ڈیبی کے لہجے میں سرد مہری تو نہیں تھی، لیکن بے جذبہ ضرور تھا جس سے ڈینیل آزردہ سا ہو گیا۔

اس نے ڈبے کونے میں رکھنے کے بعد دوبارہ ڈیبی کی طرف چاہت سے دیکھا، مگر ڈیبی نے جلدی سے اس کی توجہ کا رُخ میری جانب موڑ دیا۔"ڈینیل !اس سے ملو یہ پاکستان سے تعلق رکھتی ہیں اور میری رُوم میٹ ہیں۔"

ڈینیل نے پہلی مرتبہ میری طرف دیکھا ورنہ اسے اب تک میری موجودگی کا احساس تک نہ تھا۔

"ہیلو! ویلکم ٹو نیویارک۔" وہ مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔

"شکریہ" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

ڈیبی نے سکھ کا سانس لیا اور بولی "اچھا تم دونوں گپ شپ کرو۔ میں اتنے میں ڈبے خالی کر دوں اور ان میں لایا گیا سامان سمیٹ لوں۔" ڈینیل بڑی اپنائیت سے میرے پاس صوفے پر بیٹھ گیا۔"اچھا تو تم پاکستان سے ہو؟"

"کیا تم پاکستان کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات رکھتے ہو؟"

"ہاں......کچھ کچھ جانتا ہوں مثلاً تم افغان جنگ میں ہمارے اتحادی تھے؟" میں ہنسنے لگی :"بھئی ہم تو ہر جنگ میں آپ کے اتحادی رہے ہیں اور غالباً مستقبل میں بھی رہیں گے۔"

ڈینیل مسکرایا:"وہ کیسے؟"

"خطے کی تاریخ پڑھ کر دیکھ لو۔ ہم انگریزوں کے غلام تھے۔ان کی ہر جنگ ہماری جنگ تھی۔آزادی کے بعد تم نے یا ہم نے تمہیں گلے لگایا اور ایسا یارانہ گانٹھا کہ آج تک چولی دامن کا ساتھ ہے۔"

"اچھا۔" پھر ڈینیل نے اس حساس موضوع سے ہٹتے ہوئے کہا "میں پہلے بھی غیر ملکی مشرقی لڑکیوں سے مل چکا ہوں......مجھے اچھا لگا تھا ان سے ملنا۔دراصل مجھے بدیسی ثقافتوں سے دلچسپی ہے۔"

"خوب! کیا حسنِ اتفاق ہے، کیوں مجھے بھی غیر ملکی کلچر پُرکشش محسوس ہوتے ہیں۔"

"اوہو! تم دونوں میں تو گاڑھی چھن رہی ہے۔" ڈیبی نے خالی ڈبے ڈینیل کے حوالے کرتے ہوئے فقرہ کسا۔

ڈینیل کو توقع تھی کہ ڈیبی اسے کچھ دیر بیٹھنے کو کہے گی۔لیکن ڈیبی نے رکھائی سے کہا:"شکریہ ڈینیل! خدا حافظ۔"

ڈینیل نے ایک مہذّب انسان کی طرح جواب میں خدا حافظ کہا اور چلا گیا۔

میں ڈیبی کی اپنے بوائے فرینڈ سے بے رُخی پر حیران تھی، لیکن تہذیبی آداب کے باعث خاموش رہی۔

شام کے قریب دوبارہ دروازے پر دستک ہوئی۔ڈیبی نے روزنِ در سے جھانکا، چہرے پر ناگواری کے آثار نمودار ہوئے، لیکن

اس نے بادلِ نخواستہ دروازہ کھول دیا۔ میں سمجھی ڈینیل ہوگا، مگر اب کی بار دو خواتین داخل ہوئیں...... ایک بڑی عمر کی اور دوسری ادھیڑ عمر۔ دونوں مجھے یکسر نظر انداز کرتے ہوئے ہسپانوی میں ڈیبی سے پہلے دھیمے لہجے میں اور بعد میں قدرے تیزی و تندی سے گفتگو کرنے لگیں۔ ڈیبی نے بہ مشکل ان کی لفظی بوچھاڑ کو روکا اور میری طرف اشارہ کیا کہ کمرے میں کوئی اور بھی ہے۔ خواتین نے مجھ سے رسمی 'ہیلو ہائے' کرنے کے بعد دوبارہ مجھے نظر انداز کر دیا اور اپنی تیز و تند باتیں ہسپانوی میں جاری رکھیں۔ میں اُلجھن میں تھی کہ آخر یہ خواتین کون تھیں اور وہ کیوں تشویش اور تناؤ کی کیفیت میں تھی۔ بظاہر وہ اس کی رشتہ دار دکھائی نہیں دیتی تھیں یعنی چہرے مہرے اور جسمانی ساخت کے اعتبار سے، وہ کوتاہ قامت اور فربہ تھیں جب کہ ڈیبی لمبے قد اور دبلے پتلے جسم کی تھی۔ وہ پھیکی ہلکی ہسپانوی رنگت کی تھیں اور ڈیبی مرمریں تھی۔ ان کی حرکات و سکنات اور اندازِ گفتگو لاطینی امریکن تھا۔ ڈیبی کا شمالی امریکہ کے باسیوں جیسا۔ میں دم سادھے ایک کونے میں بیٹھی رہی۔ خواتین نے کافی لمبی بحث کے بعد سفید عروسی جوڑا ایک ڈبے سے نکالا جو وہ ساتھ لائیں تھیں اور فخریہ انداز میں ڈیبی کو دکھایا۔ انہیں ملبوس کی خوبصورتی کی تعریف کی توقع تھی، مگر ڈیبی ٹس سے مس نہ ہوئی اور جوڑے کو چھوا تک نہیں۔ اس پر ادھیڑ عمر خاتون نے خود ڈیبی کو کھڑا کیا اور دیوار میں لگے قدِ آدم آئینے کے سامنے اس کے جسم سے جوڑ کر دیکھنے کو کہا۔ ڈیبی نے مؤدبانہ انداز میں اسے تہہ کیا اور ڈبے میں ڈال کر خواتین کو لوٹا دیا۔ خواتین لٹکے ہوئے چہروں سے رخصت ہوگئیں۔ ڈیبی کافی دیر بالکونی میں بیٹھی سگریٹ پیتی رہی۔ آخرا سے ضرورت محسوس ہوئی کہ دل کا بوجھ ہلکا کرے۔ اس نے مجھے پکارا۔ میں بالکونی میں آ گئی۔ اس نے سامنے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جب میں اس کے سامنے بیٹھ گئی تو تھوڑی دیر تک وہ میری طرف دیکھنے سے کتراتی رہی۔ چند اور ساعتیں خاموشی کی نذر ہوگئیں جن کے دوران وہ سگریٹ کے کش لگاتی اور نتھنوں سے دھواں باہر نکالتی رہی۔ یہ چند ساعتیں کس قدر گراں بار تھیں، مجھے معلوم تھا۔ وہ فیصلہ نہ کر پا رہی تھی کہ وہ مجھ سے ......ایک مکمل اجنبی سے حدیثِ دل کہے یا نہ کہے۔ ایسے فیصلے چند لوگوں کے لیے اضطراری ہوتے ہیں اور بے حد آسان، جب کہ بعضوں کے لیے مشکل...... بے حد مشکل...... بالکل خود سپردگی کی طرح۔ شاید یہ بھی ایک قسم کی خود سپردگی ہی تھی۔

آخر وہ کسی نتیجے پر پہنچ گئی اور میری طرف دیکھے بغیر کہنے لگی: ''تم بھی اُلجھن میں ہوگی کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے...... اس اپارٹمنٹ میں منتقلی کے فوراً بعد۔'' میں چُپ رہی کمرے کی دیواروں کی طرح...... سامنے سرسبز قطعے میں کھڑے درختوں کی طرح جن سے سرِ شام ہوا سرگوشی کر رہی تھی کہ اپارٹمنٹ میں اس سارے ناٹک کے دوران سورج ڈھلنے کو تھا۔

وہ دوبارہ بولنے لگی: ''تم یہ جاننا چاہو گی کہ وہ دو خواتین کون تھیں؟''

''اگر تم ایسا چاہتی ہو تو۔ ویسے وہ شکل و صورت کے لحاظ سے تم سے بالکل مختلف تھیں۔''

''ہاں۔ دراصل میرا ننھیال کا تعلق کیوبا سے ہے جو وہاں سے فرار ہو کر شمالی امریکہ آ گئے تھے۔ ان میں سے بڑی عمر کی خاتون میری نانی اور ادھیڑ عمر میری امی ہیں جنھوں نے میرے پاپا یعنی ایک سفید فام امریکن سے شادی کی۔''

''اسی لیے تمہارے بال اور آنکھیں کالی ہیں...... رنگ سفید۔''

''ہاں یہ دو نسلوں کے ملاپ کا پھل ہے۔''

''وہ دونوں اتنی تیز و تند گفتگو کے بعد یہاں سے اتنی پریشان گئی ہیں۔'' ڈیبی کے لہجے میں اکتاہٹ تھی جب وہ بولی: ''پریشان تو وہ مجھے کر گئی ہیں۔''

''اگر تم اسے دخل اندازی نہ جانو تو کیا میں پوچھ سکتی ہوں...... کیوں؟''

''دراصل وہ چاہتی ہیں کہ میں ڈینیل سے شادی کرلوں۔''

''تو پھر...... وہ تو تمہارا بوائے فرینڈ ہے۔ تم اسے پسند کرتی ہو تو اس طرح کا رشتہ قائم ہوا۔''

''ہاں۔ میں اسے پسند کرتی ہوں۔ وہ نہ صرف میرا بوائے فرینڈ ہے بلکہ منگیتر بھی۔''

''تو پھر مسئلہ کیا ہے؟''

''درحقیقت گذشتہ پانچ برسوں سے میں اس کے خاندان والوں کے ساتھ رہائش پذیر تھی بطور اس کی منگیتر کے۔ انہوں نے بہو سمجھا اور ان کے حُسنِ سلوک کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ کبھی گلہ شکوہ نہیں ہوا...... نہ انہیں، نہ مجھے، نہ ڈینیل نے کوئی قابلِ اعتراض حرکت کی۔'' میری حیرت میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہو رہا تھا: ''تو اب کیا ہوا کہ تم یونیورسٹی کیمپس منتقل ہو گئیں۔''

''سچی بات تو یہ ہے کہ میں اُکتا چکی ہوں، زندگی میں...... جذبوں میں کوئی تلاطم نہیں...... نہ کسی طوفان کی آمد کی توقع۔ بس یکسانیت سی پیدا ہو گئی ہے...... میرے اور ڈینیل کے رشتے میں۔''

''یعنی......؟'' میں نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔ ڈیبی نے میری جانب پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔

''ہمارے درمیان اُنس ہے، لگاؤ ہے، خلوص ہے۔ ہم ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں...... لیکن......'' اس نے معنی خیز انداز میں جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

''لیکن......؟''

''وہ شعلہ...... وہ جذبے کی بھڑک...... وہ تباہ کن کشش قائم نہیں رہی جو عاشق و معشوق کو اپنے طوفانی سیلِ رواں میں ہر شب بہا کر لے جاتی ہے۔'' مجھ پر سکوت سا طاری ہو گیا۔ ڈیبی نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا: ''اب ہم محض بہن بھائیوں جیسی زندگی بسر کر رہے ہیں۔''

''بہن بھائیوں جیسی......'' میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''ہاں۔ یہ جینا نہیں جمود ہے جس میں زندگی کی حرارت اور آرزو کی تڑپ نہیں۔ میں ایسی زندگی گزارنا نہیں چاہتی۔ فی الحال، کیوں کہ میں ابھی بہت کم عمر ہوں۔ میں ایک بھرپور...... سنسنی خیز لمحات سے پُر حیات کی تمنا رکھتی ہوں۔ سکون کے لیے...... جمود کے لیے اک عمر پڑی ہے۔ جب وقت مجھے بہا کے اس گھڑی تک لے آئے گا جہاں سے آپ پلٹ نہیں سکتے تب میں یقیناً ڈینیل کے ساتھ گھر بساؤں گی اور سکون کی زندگی بسر کرنا چاہوں گی۔''

''یعنی تب تم اس سے شادی کرو گی؟''

''ہاں''

''منصوبہ سو برس کا پل کی خبر نہیں'' میں منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

''کیا؟ کیا کہا تم نے؟''

''کچھ نہیں۔ تو تمہاری نانی و رامی تمہیں اس سو برس کے منصوبے سے باز رکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔''

اگلے روز شام کو ڈینیل آیا — ہاتھوں میں پھول — آنکھوں میں آنسو لیے — ایک ہاری ہوئی جنگ کی آخری لڑائی لڑنے۔ میں ان فیصلہ کن اختتامی گھڑیوں میں وہاں ان کے بیچ حائل نہیں ہونا چاہتی تھی۔ سو میں نے اپنا پرس اٹھایا اور کچھ کہے سنے بغیر اپارٹمنٹ سے یونیورسٹی لائبریری کے لیے روانہ ہوگئی۔

ہلکی سی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ میں دریا کی جانب سے آتی ہوئی تیز و تند ہواؤں سے نبرد آزما اپنی رنگ برنگی چھتری کو مضبوطی سے اپنی گرفت میں لیے ہوئے لائبریری پہنچ گئی اور مطالعے میں ایسی کھوئی کہ سب کچھ بھول گئی۔ دس بجے شب ہوش آیا اور واپس جانے کا سوچا۔ اپنے اپارٹمنٹ کی عمارت کے قریب پہنچی تو پورچ کے ایک کونے میں کوڑے کے ڈبے کے پاس رک گئی کہ اپنی چھتری بند کرلوں۔ اچانک میری نظر کوڑے کے کالے ڈبے پر پڑی۔ ڈبے میں سفیدی جھلکتی دکھائی دی جس نے میری توجہ اپنی طرف کھینچی۔

''ارے! یہ تو سفید للی کے پھول ہیں جو سرِ شام ڈینیل آنکھوں میں آنسو لیے ڈیبی کے لیے لایا تھا۔''

میں نے کسی انجانے جذبے کے تحت سفید پھولوں کا وہ گل دستہ اٹھالیا۔ ان میں سے چند ایک میلے اور نیم جاں ہو چکے تھے۔ وہ نم آلود بھی تھے۔ جانے بوندا باندی سے یا ڈینیل کے آنسوؤں کی نمی ان میں در آئی تھی۔ میری آنکھوں میں بھی ہلکی سی نمی تھی۔ میں نے نہایت احترام کے ساتھ مرجھائے سفید پھولوں کو کوڑے کے ڈبے میں واپس رکھ دیا جیسے کوئی اپنے عزیز کو سپردِ خاک کردے۔ ساتھ ہی ایک جملے کی بازگشت سنائی دی: ''محبت کبھی مرجھاتی نہیں۔'' یہ میں نے کب، کہاں اور کس سے سنا تھا؟ ہاں، یاد آیا ویلنٹائن ڈے پر میری ایک طالبہ نے مجھے صبح سویرے سرخ گلاب پیش کیے تھے۔ میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا تھا: ''یہ تو شام میں گھر واپسی تک مرجھا جائیں گے۔''

طالبہ نے معصوم خود اعتمادی سے کہا تھا: ''محبت کبھی مرجھاتی نہیں۔'' وہ طالبہ دنیا کے جھمیلوں میں گم ہوگئی، مگر اس کا یہ جملہ غالباً میرے ذہن کے کسی نیم تاریک گوشے میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگیا۔ اور اب وقت کے غبار سے میرے ذہن میں کہیں سے اس کی بازگشت سنائی دینے لگی۔ ''محبت کبھی مرجھاتی نہیں۔'' محبت کبھی نہیں مرجھاتی! میں نے کوڑے کے ڈبے میں پھینکے نیم جاں سفید پھولوں کو دیکھا۔

◆◆◆

پروین شیر ایک معروف شاعر، ادیب، مصور اور موسیقار کی ادبی خدمات کے اعزاز میں

Cape Town, Atlantic Ocean, South Africa

◆ راویہ کے زاویہ نظر اور زندگی کی بصیرتوں سے لبریز استعاراتی انداز نے تاثر کی شدت کے ساتھ انسانی معاملات کی تفہیم کے پہلو کا بھی اضافہ کردیا ہے۔ اظہار اور اسلوب میں ایک ایسی جامعیت ہے جو کسی مخصوص شخص یا مخصوص علاقے کی محدود ذات اور قدروں کے بحران کو آفاقیت اور ہمہ گیری میں تبدیل کردیتی ہے۔ راقم الحروف اس ناقابلِ فراموش کتاب کا خیر مقدم کرتا ہے۔'' (پروفیسر ابوالکلام قاسمی، انڈیا)

◆ پروین شیر اپنے بیانیہ میں اندر ہی اندر ایک عقبی راہ سے فلسفیانہ فکر، یادوں اور جذبوں کو ہمارے سامنے لے آتی ہیں۔ انہوں نے بڑی فنکارانہ مہارت کے ساتھ حقیقی توضیحی زبان اور شعری زبان کے خواب رنگ پہلوؤں کے مابین ایک ربط باہم پیدا کردیا ہے۔'' (پروفیسر ڈاکٹر دارین کیریو، کینیڈا)

"مجھے لوگوں میں
مُنفرد بنائے...
میری نرم و ملائم
اور شگفتہ جِلد"
تبت سنو کے تازگی بخش اجزاء
• جلد کو ریشم کی طرح نرم و مُلائم بنائے۔
• چھائیاں، داغ دھبے دور کرے۔
• چہرے کی زائد چکنائی کو جذب کرے۔
• جلد کو گرد و غُبار سے بچائے۔
• جلد کو عمر کے اثرات اور جھریوں سے عرصہ دراز تک محفوظ رکھے۔
Tibet
Keeps skin soft and smooth
تبت سنو - ایشیا کی مشہور ترین

شنکر پورہ کا بھگوان

دیپک کنول (انڈیا)

شنکر پورہ میں بھلے ہی سب کچھ بدل چکا ہوگا مگر شنکر پورہ کا نام نہیں بدلا۔ یہاں کے لوگ آج بھی اس محلے کو اسی نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ محلّہ سری نگر سے سات آٹھ کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔ شورش سے قبل شنکر پورہ میں کشمیری ہندوؤں کی اچھی خاصی تعداد آباد تھی۔ یہاں پر شیو کا ایک مندر تھا جہاں صبح سویرے ہی بھگتوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ نور کے تڑکے کے ساتھ ہی یہاں کی فضا شنکھ کی آوازوں میں گونجتی رہتی تھی۔ مندر کی گھنٹیاں یہاں کے خاموش ماحول میں سنگیت کی ترنگیں بکھیرنے لگتی تھیں۔ دھوپ اور اگربتیوں کی مہک سے یہاں کی ہوائیں معطر ہو جایا کرتی تھیں۔ وہ زمانہ اور تھا۔ تب اس وادی میں امن تھا، شانتی تھی۔ پھر ایک زمانہ ایسا بھی آیا، جب بندوقیں دندنانے لگیں۔ معصوم لوگوں کا خونِ ناحق بہایا جانے لگا۔ ہر طرف خوف و ہراس کی فضا طاری ہوگئی۔ ایسے ماحول میں شنکھ خاموش پڑ گئے۔ گھنٹیوں کی آوازیں خوف کے سایے میں دب کر رہ گئیں۔ دہشت کا ایسا دور شروع ہوا کہ اقلیتی فرقے نے ادا سا کسنا شروع کیا اور پھر ایک ایک کر کے وہ یہاں سے نقل مکانی کرنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے شنکر پورہ ہندوؤں سے یکسر خالی ہوگیا۔ یہاں کے ہندوؤں نے اپنی جائیدادیں اونے پونے داموں میں بیچ ڈالیں۔ بس رہ گیا یہ مندر جو آج بھی یہاں کھڑا ہے اور اپنی خاموش زبان سے اپنی بربادی کی داستان بیان کر رہا ہے۔ اس مندر کا المیہ یہ ہے کہ آج اس کی دیکھ ریکھ کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب یہاں کا اقلیتی فرقہ ادھر سے بھاگ گیا تو کچھ دنوں کے بعد اس مندر کا اکلوتا پجاری بھی مندر کو بھگوان کے رحم و کرم پر چھوڑ کر، دان پیٹی بانجھ کر کے یہاں سے اڑنچھو ہوگیا۔ جب کوئی نام لیوا، پانی دیوانہ رہا تو بھگوان نے سوچا میں اکیلا یہاں رہ کے کیا کروں۔ سو ایک دن بھگوان بھی یہاں سے چھومنتر ہوگیا۔

کشمیری ہندوؤں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ہمیشہ بھاگتے کے آگے اور دوڑتے کے پیچھے رہتے ہیں۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ قرن ہا قرن سے بھاگتے رہے ہیں۔ چاہے جو بھی دوڑ رہا ہو انہوں نے بھاگ جانے میں ہی خیریت سمجھی ہے۔ اس بار بھی انہوں نے بھاگنے میں ہی اپنی بھلائی سمجھی۔ کسی نے اس اکلوتے بھگوان کے بارے میں نہیں سوچا کہ آخر یہ اکیلا یہاں کس کے لئے بیٹھا رہے گا۔ ایک آدھ بھگت بھی پیچھے چھوٹ گیا ہوتا تو بھگوان کو بھی لگتا کہ کم سے کم ایک بھگت تو اس کی آس پر یہاں بیٹھا ہے۔ سو بھگوان کو بھی یہاں ٹھہرنے کا جواز مل جاتا۔ جب یہاں کوئی روکنے ٹوکنے والا ہی نہ بچا تھا تو بھگوان کے یہاں رکنے کی تک ہی کیا تھی سو وہ بھی اپنی راہ ہولیا۔ انکے چلے جانے کے بعد یہ مندر ایک دم ویران ہوگیا۔ بس رہ گیا قادر نارائن جو آج بھی مشتبہ حالت میں اس مندر کے آگے پیچھے گھومتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

قادر نارائن کشمیری نژاد تھا۔ اس کا اصلی نام قادر شاہ تھا، پر اسے اس نام سے کوئی جانتا نہیں تھا۔ جو بھی جانتا تھا وہ نارائن کے نام سے ہی جانتا تھا۔ اس کے نام کے ساتھ یہ لاحقہ اس وجہ سے جڑ گیا تھا کہ وہ بڑا سنکی تھا۔ ایک جگہ اسکے پاؤں ٹھہرتے ہی نہیں تھے۔ ایک دن یہاں کام کیا تو ایک دن وہاں۔ اب تک اس نے بیس ہانڈیوں کا مزہ چکھا ہوگا۔۔ پہلے وہ ایک مسجد میں سقّے کا کام کرتا تھا۔ ایک دن کسی نمازی سے ذراسی تو تو میں میں کیا ہوگئی کہ وہ اپنی مشک وہیں پر چھوڑ کر ایسا نکل گیا کہ پھر اس طرف پلٹ کے بھی نہیں دیکھا۔ کچھ دن تک وہ اسی شہر میں بے نیل مرام بھٹکتا رہا۔ پھر ایک حکیم کے یہاں نوکری کر لی۔ وہاں بھی حکیم کی بیوی سے کسی بات پر بحث تکرار ہوئی۔ بس پھر کیا تھا، ایک مہینے کی تنخواہ حکیمن کے منہ پر مار کر چلا آیا۔ اس کے بعد چند دن وہ یونہی ڈنڈے بجاتا پھرتا رہا۔ ایک دن لوگوں نے اسے اس مندر کے باہر پھول بیچتے دیکھا۔ اس دن کے بعد وہ اسی مندر کا ہو کر رہ گیا۔ وہ نہ صرف بھگتوں کو پھول بیچا کرتا تھا بلکہ ان کے جوتے چپل بھی سنبھال لیا کرتا تھا۔ یہ کام اس کی حیثیت کے مطابق نہ تھا، پھر بھی یہ کام کرنے میں اسے بڑا سکون اور فرحت ملتی تھی۔

نارائن واقعی دل کا بادشاہ تھا۔ کسی کا دکھ درد اس سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ کسی کی تکلیف اس سے سہی نہیں جاتی تھی۔ وہ کسی کی آنکھ میں آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا، کوئی بھوکا اگر اس کے پاس آتا تھا تو وہ خود بھوکا رہتا تھا اور اپنی روٹی اسے کھلا دیتا تھا۔ وہ کون تھا، کہاں سے آیا تھا، یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ جیسے کسی خودرو جھاڑی کی طرح اس علاقے میں اگ آیا تھا۔ آج تک اس کی سدھ لیتے ہوئے کسی کو نہیں دیکھا گیا تھا۔ وہ ناٹھا نگوڑا تھا۔ یعنی آگے ہاتھ اور پیچھے بات۔ کبھی کسی نے اسے ہنستے مسکراتے نہیں دیکھا۔ جب دیکھو اس کے چہرے سے وحشت برستی رہتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ بڑا دل جلا ہو۔ کوئی ایسی بات تھی، جس نے اسے دنیا سے بددل کر دیا تھا۔ اس لئے وہ اس مطلبی دنیا سے پرے رہ کر جی رہا تھا۔ آج تک اس نے اپنے لئے ایک آشیانہ تک کھڑا نہیں کیا تھا۔ بندر کی طرح، بس جہاں پر رات ہوتی تھی، وہیں اس کا رین بسیرا ہوتا تھا، چاہے وہ دکان کا تھڑا، مسجد کی سیڑھی یا مندر کی باڑی ہی کیوں نہ ہو۔ یہاں کے ہندوؤں کو بھی اس کے مندر میں گھومنے پھرنے پر کوئی اعتراض نہ تھا کیونکہ وہ اس مندر کی سچے دل سے سیوا کرتا تھا۔

قادر نارائن چھ فٹ کا لحیم شحیم آدمی تھا۔ دیکھنے میں بڑا بدصورت لگتا تھا۔ ایک دم جھاڑ جھلا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ساؤتھ افریقہ کے کسی جنگل سے بھاگا کوئی بن مانس ہو، جس نے اس مندر کے باہر ڈیرہ ڈال دیا ہو۔ اس کی کالی صورت دیکھ کر بچے تو کیا بڑے بھی ڈر جایا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنا سر جھکائے رکھتا تھا۔ اب تک اس نے کسی سے بھی آنکھیں ملا کر بات نہیں کی۔ ہمیشہ نظریں جھکا کر بات کرتا تھا۔ وہ شاید احساس کمتری کا شکار تھا۔ اگر کوئی اسے ڈانٹ ڈپٹ بھی دیتا تھا تو وہ برہم نہیں ہوتا تھا بلکہ چپ چاپ کسی کی بھی ڈانٹ سنتا رہتا تھا۔ وہ بہت کم بولتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس نے گونگے کا گڑ کھا لیا ہو۔ جب بھی بولتا تھا اپنے آپ سے بولتا تھا۔ اس کی یہ خود کلامی اسے اور بھی مشتبہ اور پراسرار بنا دیتی تھی۔ وہ جتنا بدشکل تھا اتنا ہی بداطوار بھی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ کئی طرح کے نشے کرتا تھا۔ وہ چرس پینے کا عادی تھا۔ اس علّت کی وجہ سے اس کی عزّت دو کوڑی کی بھی نہیں رہی تھی۔ جو بھی اس کی طرف دیکھتا تھا تو تحقیر بھری نظروں سے ہی دیکھتا تھا۔ اسے اس بات کا کوئی ملال نہ تھا کہ لوگ اس کے ساتھ بڑی رکھائی سے پیش آتے تھے۔ وہ تو بس اس بات سے خوش تھا کہ اس مندر سے اس کو آزوقہ ملتا تھا اس لئے وہ اس مندر کا ایسا دیوانہ ہو کے رہ گیا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کے کہیں اور جانا نہیں چاہتا تھا۔

اس کی اس دیوانگی نے اسے لوگوں کا دشمن بنا دیا تھا۔ یہاں کے مقامی لوگ اس سے اس بات سے بھی شاکی تھے کہ وہ مسلمان ہو کر مندر کا ہو کر رہ گیا تھا اور اپنے سارے دینی فرائض بھول گیا تھا۔ وہ کبھی نماز ادا نہیں کرتا تھا۔ جمعہ کے دن جب پاس کی مسجد سے اذان

ہوتی تھی تو وہ غائب ہوجاتا تھا جیسے زمین دوز ہوگیا ہو۔اس کی ان حرکتوں کی وجہ سے یہاں کا مولوی اس کی جان کا لاگو ہوگیا تھا۔کتنی بار مولوی نے بھرے بازار میں اسے آڑے ہاتھوں لیا۔سب کے سامنے اس کی اس قدر لعنت ملامت کی کہ کوئی غیرت مند ہوتا تو کھڑے کھڑے ہی مرجاتا۔وہ تو چکنا گھڑا تھا۔بھلا چکنے گھڑے پر بھی کبھی بوند ٹھہرتی ہے۔وہ تو ایسے سنتا رہتا جیسے کوئی اس کے نام کے قصیدے پڑھ رہا ہو۔کچھ لونڈوں نے اس کی دیدہ دلیری دیکھ کر کئی بار اس کی پٹائی بھی کی مگر وہ تو کتے کی دم ثابت ہوا۔مار کھانے اور ذلیل وخوار ہونے کے باوجود اس نے اپنی خو بو نہیں بدلی۔دین دار اسے کتنا سمجھاتے رہے کہ اب تک اپنی آخرت بگاڑتے آئے ہو،اب جب کہ عمر کی آخری ڈھلان پر کھڑے ہو کم سے کم اب تو اپنی عاقبت سنوار لو۔اتنا سمجھانے کے بعد بھی نتیجہ وہی نکلا،ڈھاک کے تین پات۔اسے نہ عاقبت کی فکر تھی نہ آخرت کا ڈر۔وہ تو جیسے یہ طے کر کے بیٹھا تھا کہ وہ کسی کی نہیں سنے گا۔نہ جانے عبادت کا نام سنتے ہی اسے بخار کیوں چڑھ جاتا تھا۔کیا وہ سرگردان ہو چکا تھا؟اس سوال کا جواب شاید اس کے پاس بھی نہیں تھا،پر یہ ایک حقیقت تھی کہ وہ کسی بھی دین مذہب کا پیروکار نہیں تھا۔اب تو اسکی یہ قدر رہ گئی تھی کہ کوئی اسے پاس پھٹکنے نہیں دیتا تھا۔وہ جہاں جاتا تھا لوگ اسے پھٹ پھٹ اور دُر دُر کر کے بھاگتے تھے جیسے وہ کوئی خارش زدہ کتا ہو۔یہاں کے مولویوں نے تو اسے ملحد اور ملعون قرار دیا تھا۔نارائن کا لاحقہ بھی اسی سبب اس کے نام کے ساتھ جڑ گیا تھا کیونکہ وہ اپنا زیادہ تر وقت مندر کے سایے میں گزارتا تھا۔پہلے اسے لوگ چڑانے کے لئے نارائن کہہ کے بلاتے تھے۔پھر وہ اسے اس نام سے طنزاً بلانے لگے اب تو وہ اسے حقارت سے اس نام سے بلاتے تھے۔مزے کی بات یہ تھی کہ نارائن یہاں کی عورتوں میں کافی مقبول تھا۔وہ حربے ضرب اپنی پریشانیاں لے کر اس کے پاس آتی تھیں اور اپنے درد کا درماں نارائن سے پالیتی تھیں۔

جب یہاں سے اقلیتی فرقہ ہجرت کر گیا تو قادر نارائن بھی کئی مہینوں تک روپوش ہوگیا۔یہاں کے لوگ یہی سمجھ بیٹھے کہ شاید وہ بھی یہاں سے چلا گیا مگر چند مہینوں بعد وہ پھر اسی مندر کے باہر اپنی جھلک دکھا کر غائب ہوگیا۔اب جب کہ یہ مندر ویران پڑا تھا۔یہاں کا پجاری ہی نہیں،اس مندر کا بھگوان بھی بھاگ گیا تھا،تو سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ نارائن اب کس کے سہارے جی رہا تھا۔یہاں کے لوگوں کو وہ اب خال خال ہی اس علاقے میں دکھائی دیتا تھا۔جب بھی وہ نظر نہیں آتا تھا تو لوگ یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دیتے تھے کہ شاید مر گیا مردود جس کا نہ فاتحہ نہ درود۔مگر ان کی یہ خوشی تب ہوا ہوجاتی تھی جب وہ اسے مندر کے آگے پیچھے پراسرار حالت میں گھومتے ہوئے پاتے تھے۔قادر نارائن جو بھی تھا پر تھا بڑا پراسرار بندہ۔کبھی ظاہر ہوجاتا تھا تو کبھی غائب۔لوگ یہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ وہ آتا کہاں سے ہے اور جاتا کہاں ہے۔کسی کے ساتھ اس نے بنا کے بھی نہیں رکھی تھی،جو اسے اپنے گھر میں پناہ دیتا۔آخر ایسی کونسی پناہ گاہ تھی جہاں وہ ہفتوں مہینوں پڑا رہتا تھا۔یہ ایک پہیلی تھی جو کسی سے بھی سلجھ نہیں پا رہی تھی۔کہتے ہیں جب کشمیر میں حالات انتہائی ابتر ہوگئے تو یہاں کے مولوی نے چند کٹر پنتھیوں سے مل کر اس مندر کو مسمار کرنے کی سازش کی۔محلے کے سبھی لوگ مندر کے آگے جمع ہوگئے مگر کسی میں اتنی ہمت تھی نہ باک جو وہ ان لوگوں کو روک پاتے یا ان کی مزاحمت کر پاتے۔قادر نارائن اتفاق سے اس وقت مندر کے سامنے آلتی پالتی مار کے بیٹھا تھا۔جونہی ریش دراز مولوی کی نظر اس پر پڑی تو اس نے ایسے منہ سکوڑ لیا جیسے کسی نجس شے پر اس کی نگاہ پڑی ہو۔قادر نارائن مولوی کے رویے سے بے نیاز تن کر کھڑا ہوگیا اور شعلہ بار نظروں سے ان لوگوں کی طرف دیکھ کر بولا۔

''کیا بات ہے مولوی صاحب۔آج مجھے کونسا پاٹھ پڑھانے آئے ہو؟''

''تم جیسے مردود کا نام لینا بھی میرے لئے گناہ ہے۔تم لادین ہو،ملحد ہو۔تم نے آج تک کبھی اللہ کی بندگی نہیں کی۔اس کے آگے

سربسجود نہیں ہوئے۔ دیکھ لینا تم دوزخ کی آگ میں جلو گے۔ تمہیں نہ اس دنیا میں سکون ملے گا اور نہ آخرت میں۔ تم جب تک مولا پر ایمان نہیں لاؤ گے تم پر اسی دنیا میں قہر نازل ہوتا رہے گا۔''

''مولوی صاحب میری فکر کرنا چھوڑ دو۔ تم بتاؤ یہ اتنے لوگوں کو لے کر کس ارادے سے یہاں پر آئے ہو؟''

''ہم اس مندر کو منہدم کرنے آئے ہیں۔ اس علاقے میں اب یہ مندر نہیں رہے گا۔ ہم اسے توڑ دیں گے۔''

''مندر توڑ دو گے! کیوں تم یہ مندر کیوں توڑنا چاہتے ہو؟''

''ہم اس جگہ ایک مسجد تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ ہم کافروں کی کوئی بھی نشانی بچا کر رکھنا نہیں چاہتے۔ ہم اس جگہ پر اللہ کا گھر کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ انشا اللہ اب یہاں کے ذرّے ذرّے پر اللہ کا راج ہوگا۔''

''تو کیا یہاں کے ذرّے ذرّے پر اللہ کا راج نہیں ہے۔ کیا یہاں کے دلوں میں خدا نہیں بستا؟ کیا یہاں پہلے اللہ کے لئے گھر بنانا ہوگا تب اللہ یہاں آ کر بس جائیں گے۔ مولانا تم اپنے آپ کو مومن کہتے ہو پھر بھی خدا کا گھر توڑنے کی بات کرتے ہو۔ کیا یہ مندر خدا کا گھر نہیں ہے؟ کیا وہ کلیسا اس کا کاشانہ نہیں ہے؟ کیا وہ گوردوارہ اس کا مسکن نہیں۔ تم کس گھر کی بات کر رہے ہو۔ ارے وہ تو ذرّے ذرّے میں سمایا ہوا ہے۔ وہ تو ہمارے دلوں میں رہتا ہے۔ یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟''

مولوی قادر نارائن کی باتوں سے تلملا اٹھا۔ وہ برافروختہ ہو کر بولا ''تو ہمیں دین و دنیا کی باتیں سکھائے گا۔ ہمیں نیک و بد سمجھائے گا۔ تم جو گلے گلے تک گناہوں میں ڈوبے ہوئے ہو، تم ہمیں درس دو گے۔ تو تو لا دین ہے، اس لئے شرک کی باتیں کر رہا ہے۔ تو کیا جانے اللہ کیا ہے اور دین کیا ہے۔ یہ ہماری شرافت ہے کہ ہم تم کو اب تک گوارہ کئے بیٹھے ہیں۔ تمہیں تو بہت پہلے سنگسار کر دینا چاہیے تھا۔ یہ روز روز کا ٹنٹا ہی ختم ہو جاتا۔ اب چل پھوٹ یہاں سے اور ہمیں اپنا کام کرنے دے۔ یہ مندر مسمار ہو کے ہی رہے گا۔''

''دیکھو میں تم لوگوں کی طرح دین داری کا دعویٰ تو نہیں کرتا مگر ایک بات میں ضرور کہنا چاہوں گا کہ اگر تم لوگوں نے اس مندر کو منہدم کر دیا تو یہ کشمیر کے تہذیب وتمدن کا بے اشتباہ خون ہوگا۔ یہ سراسر قتل ہوگا مذہبی رواداری اور بھائی چارے کا۔ ارے تم سب لوگ گونگے بہرے بنے کیوں کھڑے ہو۔ تم لوگ اس جنونی مولوی کو روک کیوں نہیں رہے ہو۔ یہ تم سے ایسا گناہ کروانے جا رہا ہے جس کی تلافی ممکن نہیں۔ غفلت کی نیند سے جاگو میرے پیارو اور اس مولوی کو نفرت کا زہر پھیلانے سے روکو''

اب کے مولوی قادر نارائن کی باتوں سے آگ بگولہ ہوا اٹھا۔ اس نے بھیڑ کو اکساتے ہوئے کہا۔

''ارے اس ملعون کی باتوں پر کان نہ دھرو۔ اس کی تو ابتدا بھی بگڑی ہے اور آخرت بھی۔ تم تو دین دار ہو۔ سب سے پہلے اس لا دین کو سنگسار کر دو اور اس کے بعد اس مندر کو نیست و نابود کرو۔ دیکھ کیا رہے ہو۔ آگے بڑھو میرے مومنو۔''

مولوی نے دیکھا کہ بھیڑ کو تو جیسے سانپ سنگھ گیا۔ وہ مولوی کی طرف ایسی خونخوار نگاہوں سے دیکھنے لگے جیسے اسے کچا ہی کھا جائیں گے۔ قادر نارائن کی باتوں نے بھیڑ میں کھڑے لوگوں کو ہمت اور حوصلہ بخشا تھا۔ اس کی کہنی نے تریاق کا کام کیا تھا۔ مولوی کا زہر بے اثر ثابت ہو رہا تھا۔ وہ ایک آواز ہو کے بولے۔

''نارائن نے جو بھی کہا کیا غلط کہا۔ سچ تو یہ ہے کہ مندر اور شوالے ہمارے تہذیب وتمدن کی جیتی جاگتی نشانیاں ہیں۔ ہم ان نشانیوں کو یوں مٹنے نہیں دیں گے۔''

لوگوں کو یوں مشتعل دیکھ کر وہ مٹھی بھر لوگ پیچھے ہٹ گئے جو مولوی کے جھانسے میں آ گئے تھے۔ لوگ بے شک سہمے ہوئے تھے، پر انہیں آج بھی اپنی روایتوں کا پاس تھا۔ انہیں آج بھی اپنی تہذیب وتمدّن سے پیار تھا۔ ان کے تیور دیکھ کر وہ لوگ ڈر کر پیچھے ہٹ گئے۔ وہ دل ہی دل میں قادر نارائن کو کوستے رہے اس پر تبّرہ بھیجتے رہے جس نے ان کے منصوبوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ اس دن کے بعد اس مندر کو کسی نے توڑنے کی بات تو نہیں کی البتہ اس مندر کے بالکل سامنے ایک مسجد کھڑی ہو گئی۔

مسجد تعمیر ہونے سے یہ مندر ایک دم ویران ہو گیا۔ یہ مندر جو کبھی بقعۂ نور بنا ہوا تھا، آج پوری طرح سے اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہاں ہر طرف ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ مندر میں اداسی برس رہی تھی۔ یہاں برسوں سے کسی نے دیا نہیں جلایا تھا۔ کسی نے شنکھ کی صدا نہیں دی تھی۔ کسی نے یہاں خاموش پڑی گھنٹیوں کو ہلایا نہیں تھا۔ اس مندر کا درد اس کے کلش سے مظہر تھا جس پر میل کی پرتیں چڑھی ہوئی تھیں۔ شنکر پورہ کا یہ مندر بہت پرانا ہے۔ شاید چار پانچ سو سال پرانا۔ اس مندر نے زمانے کے بڑے اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں۔ کتنی ہی یورشوں کا تن تنہا مقابلہ کیا ہے۔ کتنے ہی حملہ آور آئے، اس مندر کے کلس کو جھکانے کی کوشش کی مگر یہ مندر جھکا نہیں بلکہ یہ پوری شان سے کھڑا رہا۔ شاید اس لئے کہ تب بھگوان اس میں رہتا تھا۔ اب جب کہ بھگوان ہی یہاں سے بھاگ گیا تھا تو یہ مندر اپنا وجود کیسے بچا رکھتا۔ کسی پنڈت نے وزارت داخلہ میں شکایت کر دی کہ اس مندر کو مسمار کر دیا گیا ہے اور اس جگہ ایک مسجد تعمیر کی گئی ہے۔ شکایت یہاں کی سرکار کو بھیجی گئی۔ یہاں کے وزیر داخلہ نے ایک ہندو پولیس افسر کو تحقیقات کرنے کے لئے بھیج دیا۔ جب وہ ایک دو سپاہیوں کے ساتھ مندر کے اندر گھسا تو اندر کا منظر دیکھ کر وہ اپنا کلیجہ مسوس کر رہ گیا۔ مندر کی ہر چیز غائب تھی۔ مندر سے پوجا کی سمگری تک اڑا لی گئی تھی۔ بس بچ گئی تھی شنکر کی مورتی جو اوندھی پڑی تھی۔ مندر کے برآمدے میں دنیا بھر کا کاٹھ کباڑ پڑا تھا۔ شراب کی خالی بوتلیں۔ سگریٹ کے ادھ جلے ٹکڑے۔ نہ جانے وہ کون لوگ تھے جنہوں نے مندر کے تقدس کو پامال کر کے رکھ دیا تھا۔ پولیس پارٹی کو دیکھ کر لوگ گھروں سے باہر آ گئے۔ مندر کے باہر بھیڑ جمع ہو گئی۔ مندر کی بے حرمتی کی خبر سن کر انہیں بڑا دکھ ہوا۔ لوگوں میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ اس مذموم حرکت کے پیچھے کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ لوگوں نے اٹکلیں لگانی شروع کیں۔ وہ کہتے ہیں نا کہ بد اچھا بدنام برا۔ شک کی سوئی سیدھے قادر نارائن پر جا کے ٹھہر گئی۔ اس گھناونے فعل کے لئے اسے ہی ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ پولیس قادر نارائن کی تلاش میں نکل پڑی۔ انہوں نے جگہ جگہ چھاپے مارے، علاقے کا چپہ چپہ چھان مارا مگر قادر نارائن ان کے ہاتھ نہیں لگا۔ جانے اسے زمین کھا گئی یا آسمان نکل گیا۔ شاید اسے کہیں سے بھنک لگ گئی تھی اس لئے وہ پکڑے جانے سے پہلے ہی روپوش ہو کے بیٹھ گیا تھا۔

ایک دن وہ ان کے ہتھے چڑھ گیا۔ پولیس اسے مقامی تھانے میں لے آئی اور اسے حوالات میں ڈال دیا۔ اس تھانے کا انچارج ایس ایچ او عنایت اللہ تھا۔ وہ تھرڈ ڈگری تفتیش کرنے کے معاملے میں اتنا بدنام تھا کہ چھٹے ہوئے بدمعاش بھی اسے دیکھ کر اپنے پنجے چھکے بھول جاتے تھے۔ وہ ایک ڈنڈا ہاتھ میں لے کر جب حوالات کی کوٹھری میں گھسا تو نارائن کی آنکھیں شعلہ بار ہو گئیں۔ اس نے نارائن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تو اسے ایسا لگا جیسے اس کے رگ و پے میں کوئی دہکتی ہوئی سیّال شے سرایت کر گئی ہو۔ وہ سر سے پاؤں تک جھلسنے لگا۔ اسے لگا جیسے کسی نے اسے دہکتے ہوئے انگاروں پر ڈال دیا ہو۔ وہ درد کی شدت سے چیخنے چلانے لگا۔ اس نے اپنا ڈنڈا دور پھینکا اور وہ بدحواس ہو کر حوالات کی کوٹھری سے چلاّتا ہوا باہر آ گیا۔ وہ اپنے عملے کو تنبیہ کرتے ہوئے بھاگ رہا تھا ''اسے مت مارو۔ اسے مت مارو۔ اسے چھوڑ دو۔ ارے یہ کوئی بلا ہے۔ کوئی جادوگر ہے یہ۔ اس نے مجھے جلا ڈالا ہے۔ اسے چھوڑ دو۔ اسے چھوڑ دو۔''

پولیس والوں نے اسے ترت پھرت لاک اپ سے آزاد کردیا۔ نارائن چھوٹ کر تو باہر آ گیا جب کہ عنایت اللہ دو دن رہا۔ مولوی جس کا دل اس کی گرفتاری کی خبر سن کر باغ باغ ہوا تھا، اس کی رہائی کی خبر سے چراغ پا ہوگیا۔ لوگ بھی اس خبر سے مشتعل اٹھے۔ وہ مندر کے پاس جمع ہوکر پولیس کے خلاف نعرے لگانے لگے۔ عام رائے یہی تھی کہ نارائن نے پولیس کی منہ بھرائی کر کے اپنے آپ کو چھڑا لیا ہوگا۔ اب کے صرف مولوی ہی نہیں سارا محلہ اس کے خون کا پیاسا ہوگیا تھا۔ اس بار مولوی پیش پیش تھا کیونکہ نارائن اس کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتا تھا۔ وہ اسے دہریہ گردانتا تھا اور اسے تہہ تیغ کر دینے کے درپے تھا۔ اس لئے اس نے محلے والوں کو اس کے خلاف اکسایا۔ بھیڑ نارائن کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے چاروں اور پھیل گئی، تبھی یہ اطلاع ملی کہ نارائن مندر میں جا کے چھپ گیا ہے۔ لوگوں کا ہجوم یہ اطلاع ملتے ہی مندر کی اور دوڑ پڑا۔ مندر کے اندر گھستے ہی انہوں نے جو کچھ دیکھا اسے دیکھ کر بھیڑ کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مورتی کی طرف دیکھ رہے تھے جہاں پتھر کی مورتی نہیں بلکہ نارائن شنکر کی مورتی کی جگہ خود براجمان تھا۔ اس کے روشنی کا ایک ہالہ تھا اور وہ اس ہالے کے بیچ بڑے پُر وقار انداز میں بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے سے نور برس رہا تھا۔ مندر کی چاردیواری سے جگمگا اٹھی تھی۔ نارائن کی موجودگی سے مندر کی برسوں سے چپ پڑی گھنٹیاں وجد میں آ کر خود ہی بجنے لگی تھیں۔ مندر کا سارا ماحول انوکھی خوشبو و نکہت سے شرابور تھا۔ مندر کی فضا جیسے ترو تازہ ہوگئی تھی اور شنکر پورہ کا یہ مندر ایک بار پھر اپنی سربلندی کے ساتھ کھڑا تھا اور کے لوٹ آنے کے احساس سے سرشار تھا۔

اس دن کے بعد نارائن پھر کبھی اس علاقے میں نظر نہیں آیا۔

◆◆◆

معروف شاعر، ادیب، مصور اور موسیقار پروین شبیر کا سیاحتی اور تخلیقی سفر پر

مبنی شاہکار سفرنامہ

چند سیپیاں

سمندروں سے

شائع ہوگیا ہے

ملنے کا پتہ :

قیمت 200

126-Vineland Cres Ninnipcg R3Y1T6, Manitoba Canada. (00512048960124)

اَن کہی

مشتاق اعظمی (انڈیا)

گاڑی کے پلیٹ فارم پر لگتے ہی ایکسائز انسپکٹر انیل بسواس کو سخت ذہنی جھٹکے کا احساس ہوا۔ سات سال کا طویل ذہنی سفر ایک جست میں طے ہو گیا۔ اب وہ سات برس پہلے والے اس مشہور و معروف ہِل اسٹیشن پر تھا جہاں کی دل کشی کا ذکر وہ اپنے دوستوں کی زبانی سنتا رہا تھا اور جہاں آنے کی آرزو میں اس کا دل کئی دفعہ مچلا تھا۔

پتاجی کے بتائے ہوئے پتے پر وہ آسانی کے ساتھ پہنچ گیا۔ لیکن اسے اس وقت تھوڑی سی الجھن ہوئی جب مکان کی مالکہ نے جو ادھیڑ عمر کی عورت تھی، اس سے کہا ''مسٹر گپتا اس مکان میں تو نہیں، دیکھیے وہ سامنے والے مکان میں رہتے تھے، مگر کوئی پانچ مہینے ہوئے وہ اپنی فیملی کو لے کر یہاں سے چلے گئے ......لیکن آپ کہاں سے آرہے ہیں؟''

''میں کلکتہ سے آرہا ہوں۔'' انیل نے جواب دیا۔ ''وہ میرے پتاجی کے دوست تھے اور مجھ کو ان ہی کے یہاں ٹھہرنا تھا۔''

''افسوس، تو آپ کو ان کے چلے جانے کی خبر نہ تھی۔'' عورت کے لہجے میں ہمدردی تھی۔ ''لیکن اگر آپ گھومنے آئے ہیں تو یہاں ٹھہرنے کی بہت سی جگہیں ہیں۔ آپ پسند کریں تو میرے یہاں بھی ٹھہر سکتے ہیں۔'' اس نے انیل کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''سو روپے روزانہ کا الگ تھلگ کمرہ ہے، کھانا آپ چاہے ہوٹل میں کھائیں چاہے یہاں۔''

ابھی وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ ایک مترنم سی آواز سنائی دی۔ ''سوچتے کیا ہیں، یہاں آپ کو کافی آرام ملے گا''۔ اسی گھر کی ایک خوبصورت لڑکی باہر آئی۔ اس نے بڑی بے تکلفی سے اس کے ہاتھ سے سوٹ کیس لے لیا۔

سب سے پہلے اس نے غسل کیا، پھر تولیہ سے بدن پونچھتے ہوئے کمرے میں آیا تو لڑکی میز پر چائے کی پیالی اور بسکٹ کی پلیٹ رکھ رہی تھی۔

''چائے پی لیجیے، آپ کافی تھک گئے ہوں گے۔'' وہ بڑی اپنائیت سے بولی۔

''ہاں سفر تو واقعی لمبا تھا، لیکن یہاں آنے کی خوشی ایسی تھی کہ کچھ محسوس نہیں ہوا''۔ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

''لیکن اکیلے آپ کو کیا مزا آئے گا، لوگ یہاں دوستوں کے ساتھ آتے ہیں یا پھر......''

بسکٹ کا ٹکڑا منہ میں رکھ کر وہ بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''دوست پہلے آکر چلے گئے اور شادی ابھی ہوئی نہیں۔''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''کیوں، شادی کیوں نہیں کی آپ نے؟'' اس نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

''شادی کر لیتا تو تم پوچھتیں، شادی کیوں کی آپ نے؟'' وہ پھر ہنس پڑی...... ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''میں سپترا ہوں''۔اس نے چہکنے کے انداز میں کہا۔''آرام کیجئے، میں کھانا تیار کرتی ہوں۔''

'ہونہہ، لوگ پڑھ لکھ کر آدمی بنتے ہیں، میں بی۔اے کر کے بھی گدھا رہا'۔اس نے بڑبڑاتے ہوئے اپنے پیروں کے پنجوں کو آہستہ آہستہ سہلایا۔ پھر ایک ایک کر کے انگلیاں کھینچیں۔اس کے بعد ہری ہری دوب پر لیٹ گیا۔ پاؤں میں موچ آ جانے کے باعث اس کا موڈ آف تھا۔ پہاڑی سے اترتے وقت اس کا پاؤں پھسل گیا تھا۔ اگر اس نے لڑھکتے وقت پہاڑ کی نوکیلی چٹان کو مضبوطی کے ساتھ نہ پکڑ لیا ہوتا تو وہ کئی سوفٹ گہری کھائی میں ہوتا۔

''میری مت ماری گئی جو میں یہاں تنہا چلا آیا''۔اس نے اپنے آپ سے کہا۔''تفریحی جگہیں بھی کبھی تنہا جانے کی ہوتی ہیں۔ دن بھر کسی ٹریولنگ ایجنٹ کی طرح جھک مارتے پھرو اور شام ہوتے ہوتے تھک کر چور ہو جاؤ اور سو رہو۔ اجنبی جگہ، کوئی دوست نہ کوئی واقف کار کہ آدمی اس سے ہنسے بولے، اپنے تاثرات بتائے، اس کا ریمارک سنے۔ قہقہے، پھبتی، چھیڑا، اٹھکھیلیاں، کچھ بھی تو نہیں۔ میں نے اس سے غلط تو نہیں کہا تھا کہ تمہارا ہل اسٹیشن مجھے پسند نہیں آیا۔ کہنے لگی۔''تنہا گھومنے میں مزا کم آتا ہے، تھکن زیادہ ہوتی ہے۔'' کیا مطلب تھا اس کا؟ کیا میں اسے ساتھ لیے پھروں؟ تھکن ہوتی ہے تو مجھے، اس کا کیا؟ لیکن میں نے اس سے کہا ہی کیوں تھا؟ مگر اس نے مجھ سے پوچھا ہی کیوں تھا؟ وہ کون ہوتی ہے مجھ سے اس طرح کی باتیں کرنے والی۔ اس دن کس بے باکی سے بولی تھی۔ آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟ بے شرم! مسکراتی ہے، آنکھیں مٹکاتی ہے۔ جیسے میں ریجھ ہی تو جاؤں گا اس پر! آخر اسے گیارہ بجے رات کو کمرے میں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ صراحی میں پانی نہیں تھا تو میں کون سا پیاسا مرا جا رہا تھا۔ اسے تو بس کوئی بہانہ چاہئے، کمرے میں آنے کا، باتیں کرنے کا...... کل کس معصومیت سے پوچھنے لگی۔ کیا کلکتہ کا چڑیا گھر بہت بڑا ہے؟ بانک بازار کا رس گلہ کیسا ہوتا ہے؟ اور پھر خود ہی بولی۔''جب میں چھوٹی تھی تو پتا جی ایک بار کسی کام سے کلکتہ گئے تھے۔ واپسی پر وہ میرے لیے بہت سے کھلونے لائے تھے۔ رنگ برنگ کے کھلونے اور فراک کے کپڑے بھی اور رس گلے بھی۔

کہتے تھے کہ بانک بازار کے رس گلے ڈبوں میں بھر کر دور دور تک بھیجے جاتے ہیں۔ انہیں وہاں کا چڑیا گھر بہت پسند آیا تھا۔''...... جب اسے سب کچھ معلوم ہی تھا تو اس نے پوچھا ہی کیوں تھا، اور پھر اسے یہ بتانے کی بھی کیا ضرورت تھی کہ اس کے پتا جی ایک جھگڑے میں قتل کر دیئے گئے اور پچھلے برس اس کی ماں بھی مر گئی۔ ان باتوں سے مجھے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ میں جانتا ہوں یہ سب باتیں وہ کیوں کہتی ہے۔ وہ سمجھتی ہے اس طرح وہ میری ہمدردی حاصل کر لے گی۔ لیکن میں کسی جھانسے میں آنے والا نہیں ہوں۔ میں خوب سمجھتا ہوں کہ ہوٹلوں میں اس طرح کی لڑکیاں رکھی ہی اس لیے جاتی ہیں کہ وہ گاہکوں سے لگاوٹ کی باتیں کر کے ان کی جیب ہلکی کراتی رہیں۔''

ہری ہری ریشم جیسی ملائم دوب پر دیر تک آنکھیں بند کیے لیٹے رہنے کے بعد اب وہ راحت سی محسوس کر رہا تھا۔ اس کی جھنجلاہٹ ختم ہو گئی تھی۔ اس نے نگاہ اٹھا کر چاروں طرف دیکھا۔ شام گہری ہوتی جا رہی تھی اور دور دور تک پھیلے ہوئے چائے کے باغات دھند کے لحاف میں دبک گئے تھے، لیکن آبشار کسی چوکیدار کی طرح اب بھی جاگ رہا تھا۔ یہ آبشار کس قدر شوخ منہ زور گھوڑے کی طرح! کسی ضدی بچے کی طرح! نہیں، سپترا کی طرح!! سپترا بڑی الھڑ لڑکی ہے۔ جو زبان پر آتا ہے کہہ گذرتی ہے، معنی مطلب سے بے پروا ہو کر۔ اور میں بھی بڑا واہیات آدمی ہوں، اس کے بارے میں کیسی بے تکی باتیں سوچ گیا۔ سپترا الھڑ ہے، بے شرم نہیں۔ وہ شوخ ہے بے حیا نہیں۔ بے باک ہے لیکن بے غیرت نہیں...... بڑی پیاری لڑکی ہے۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا،اس کے پیر کی تکلیف کم ہوگئی تھی۔

''کیا بات ہے، وہ ابھی تک آئی نہیں۔ وہ دکھائی بھی تو نہیں دی۔ اس کی آہٹ بھی نہیں سنائی دی۔ اتنی دیر میں تو وہ کئی چکر لگا لیتی تھی۔'' وہ پلنگ پر لیٹا سگریٹ پی رہا تھا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد وہ کھانا لے کر آئی۔ برتن میز پر رکھتے ہوئے بولی۔ ''مجھے آنے میں دیر ہوگئی۔ کس کس کا خیال رکھوں۔ اوپر کے کمرے میں کوئی سیٹھ جی آ کر ٹھہرے ہیں، گھنٹہ بھر سے ان کے ناز نخرے برداشت کر رہی تھی۔'' اس نے گہرا سانس بھرا۔'' ماتا جی مجھے کس جنجال میں چھوڑ گئیں، اپنے ساتھ مجھے بھی کیوں نہ لے گئیں۔'' یہ پہلا موقع تھا کہ وہ چہک نہیں رہی تھی۔

انیل نے اس کے افسردہ چہرے اور اداس آنکھوں کی طرف دیکھ کر پوچھا'' کیوں، آج کوئی ایسی ویسی بات ہوگئی کیا؟''

''موسی کو میرا آپ سے اس قدر زیادہ بے تکلف ہونا پسند نہیں۔'' اس نے جوں ہی یہ جملہ کہا، انیل کو ایسا لگا جیسے نوکیلی چٹان اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی ہو۔

اس نے اپنی کیفیت کو چھپاتے ہوئے کہا۔'' ٹھیک ہی تو کہتی ہیں تمہاری موسی، وقت پر میرا کھانا لا دینے اور چھوٹے موٹے کام کرنے کے علاوہ میرا تمہارا تعلق ہی کیا ہے۔''

اس کی آنکھوں میں آنسو تیر گئے، بے قرار ہو کر بولی۔''تعلق تو دل کا دل سے ہوتا ہے۔ آپ مجھے بھلے آدمی لگتے ہیں۔ باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے اس لیے کرتی ہوں۔ لیکن وہ سیٹھ، وہ حرام خور میرا کیا ہوتا ہے۔ موسی کا حکم ہے کی میں اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھوں۔''

''تو اس میں برائی کیا ہے، آخر اس کی ضرورتوں کا خیال کون رکھے گا؟'' بات کی تہہ تک پہنچ کر بھی اس نے انجان بننے کی کوشش کی۔

''اوہ!'' وہ جھنجھلا اٹھی۔'' آپ سمجھے نہیں، اس کا مطلب کچھ اور ہے۔''

''اور کیا مطلب ہے اس کا؟'' چھیڑ اس کی مسکراہٹ سے عیاں تھی۔

لیکن اس بے موقع چھیڑ سے وہ لاوا جو معلوم نہیں کب سے اس کے سینے میں ابال کھا رہا تھا، بہہ نکلا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی اور اتنا روئی کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ جب جی ہلکا ہوا تو بولی۔'' میری موسی حد سے زیادہ لالچی ہے۔ روپے کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ آپ کو قتل بھی کرا سکتی ہے۔ ماتا جی کے مرنے کے بعد سے موسی کا روّیہ ایک دم بدل گیا ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ میں یہاں ٹھہرنے والے ہر مسافر کا دل بہلانے کی کوشش کروں، لیکن خود قابوں میں رہوں۔ میرے حالات کا بھلا آپ کو کیا پتہ ہوگا۔ میں ایک شریف ماں کی شریف بیٹی ہوں، لیکن گذرتے ہوئے وقت کا ہر لمحہ میرے سر پر ننگی تلوار لیے کھڑا ہے۔ کسی بھی گھڑی کوئی موٹا گاہک آ سکتا ہے جس کے ہاتھ میرا سودا ہو جائے گا...... میں اس جہنم سے نکلنا چاہتی ہوں، لیکن بے بس ہوں۔ آپ میری مدد کر سکتے ہیں؟''

''کون، میں''؟ اس نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں، آپ!''

انیل بسواس سوچ میں پڑ گیا۔

''نہیں نا!'' وہ خود ہی بولی۔ جیسے جواب اسے پہلے سے معلوم تھا۔'' آپ میری تقدیر کے لکھے کو کیسے بدل سکتے ہیں۔'' اس کا لہجہ

بڑا تیکھا تھا۔"آپ کھانا کھالیں۔"

اگلی صبح انیل کلکتہ کے لیے روانہ ہوگیا۔ راستہ بھر وہ اپنے دل میں چبھن سی محسوس کرتا رہا۔ کھڑکی سے آتی ہوئی تیز ہوا کے ساتھ سچترا کے یہ الفاظ اس کے کان کے پردوں سے بار بار ٹکڑا رہے تھے......"آپ میری مدد کر سکتے ہیں۔ نہیں نا! میری تقدیر کے لکھے کو آپ کیسے بدل سکتے ہیں۔"

انیل بسواس، ایکسائز انسپکٹر انیل بسواس کلکتہ اسٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر دس پر کھڑا تھا۔ گاڑی ابھی ابھی پلیٹ فارم پر آ کر لگی تھی۔ سات برس کا سفر ایک ہی جھٹکے میں سچترا کو دیکھ کر طے ہوگیا۔ وہ ننھے بچے کو کندھے سے لگائے کمپارٹمنٹ سے اسے اترتا دیکھ رہا تھا۔ بھولی ہوئی آوازیں شور کی مانند اس کے کانوں میں گونجنے لگیں، جیسے کسی نے ٹیپ ریکارڈر پوری آواز میں کھول دیا ہو۔ سات سال کے اندر اس کے چہرے مہرے، چال ڈھال اور جسمانی خطوط میں کتنا فرق آ گیا تھا۔ اب وہ معصوم اور الھڑ حسینہ کی بجائے پختہ سن کی عورت معلوم ہو رہی تھی۔ انیل سے اس کی نگاہیں ملیں لیکن اس نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ ادھیڑ عمر کا ایک بدصورت سا آدمی اس کے ساتھ تھا۔ وہ گیٹ کی طرف بڑھنے لگی تو انیل کا جی چاہا کہ وہ سچترا کو روک لے، اس کی خیریت معلوم کرے اور پوچھے کہ وہ اپنی موجودہ زندگی سے خوش ہے؟ لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ کر بھی کیسے سکتا تھا!

سچترا نے پیچھے مڑ کر ایک بار اسے دیکھا پھر تیزی سے گیٹ پار کر گئی۔

ہوٹل کے برآمدے میں چند لمحے کے لئے رک کر اس شخص نے کچھ سوچا اس کے بعد برآمدے کے اس سرے سے اس سرے تک دو تین چکر لگائے اور جب پوری طرح اطمینان ہوگیا کہ اسے کوئی خطرہ نہیں ہے تو کمرے میں آیا۔ اس نے دروازہ اندر سے مقفل کر دیا اور سچترا کی گود سے بچے کو لے کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ ایک چھوٹا سا چاقو جیب سے نکال کر بولا۔"مس سچترا کبھی کبھی تم بہت زیادہ نروس ہو جاتی ہو، یہ بات اچھی نہیں۔" چاقو کی نوک سے اس نے مردہ بچے کے پیٹ کے ٹانکے کاٹ دیے اور پولی تھن کی جھلی میں لپیٹے ہوئے افیم کے گولے نکال کر میز پر رکھنے لگا۔"تمہیں اپنی نروسنس پر قابو پانا ہوگا......ورنہ کسی دن ہم سخت خطرے میں پڑ جائیں گے۔" اس نے ایک اچٹتی سی نگاہ سچترا کے چہرے پر ڈالی۔ جانے کس جذبے کے تحت سچترا کی آنکھوں میں امڈے ہوئے بادلوں کو وہ نہ دیکھ سکا اس نے کہا۔"تم نے مارک نہیں کیا، پلیٹ فارم پر کھڑا ہوا وہ نوجوان تمہیں کس طرح گھور رہا تھا۔ شاید وہ ایکسائز کا آدمی تھا۔"

◆◆◆

اطلاع عام

قارئین کی پرزور فرمائش پر رسالہ "تخلیق" کو فیس بک پر پیش کرنے کا انتظام کرلیا گیا ہے۔ اب آپ فیس بک پر ماہنامہ "تخلیق" پیج (Monthly "Takhleeq" Page) کو Link کر کے "تخلیق" کے ہر شمارے کے حوالے سے معلومات حاصل کر سکتے ہیں اور اپنی پسند کی تحریریں download کر سکتے ہیں۔

لیڈی سیکرٹری

محمد طارق علی

یہ ایک نوجوان اور پردے میں ملفوف لڑکی کا قصہ ہے۔

میں نے اس لڑکی کو ایک روز اپنی گلی سے گزرتے دیکھا اور اگلے دنوں میں کئی بار دیکھا، بہ غور جائزہ لیا اور اُس کے ایک خاص شخصی رنگ سے متاثر ہوا۔ اس لڑکی کا وجود ڈھکا چھپا سا تھا، پورے کا پورا ایک ہلکے سلیٹی برقعے میں پوشیدہ، چہرے پر باریک نقاب، سیاہ غزالی آنکھوں کے سوا چہرہ بھی نقاب پوش لیکن باریک نقاب سے صبیح چہرے کا رنگ چھن چھن کر باہر آتا اور اس خوش جبیں کا پتہ دیتا تھا۔ برقعے کی فال سے پتہ چلتا تھا کہ اُس کا جسم ترشا ہوا ہے، پتے تُلے قدموں، چال کے اچھے انداز اور جسمانی حرکات وسکنات سے ظاہر ہوتا تھا کہ لڑکی بہت اسمارٹ ہے لیکن یہ سب جسمانی خوبیاں ایک سرتاپا چھائے ہوئے برقعے میں محبوس تھیں۔

اس لڑکی کو دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ وہ اپنے ہیلمٹ نما نقاب میں سے کیوں کر آکسیجن اندر کھینچ کر اپنے پھیپھڑوں تک پہنچاتی ہو گی۔ آکسیجن بہ ہر حال بقائے حیات کیلئے ایک بے حد ضروری چیز ہے۔ لیکن مجھے خیال آیا کہ کیا سخت پردہ ہوا سے بھی زیادہ اہم ہے اور اگر واقعی ایسا ہے تو آخر کیوں؟ میں نے یہ بھی سوچا کہ اگر سخت پردہ ہی لازم ٹھہرا تو اس جوان جہان لڑکی پر ایسی کیا افتاد آپڑی کہ وہ روزانہ، بلاناغہ، مقررہ ٹائم پر اپنے گھر کی چاردیواری سے باہر نکل آتی ہے اور وہ بھی ایسے وقت میں جب جون جولائی کی کڑی دھوپ ہر طرف چھائی ہوتی ہے، ایسی دھوپ کہ جیسے سورج کے مونہہ سے ٹپکتی آگ۔ اس جہنم نشان آگ سے پورا ماحول جھلسا ہوا، شدید تپش سے زمین لرزاں اور ہر قسم کی ہریالی سے خالی۔ ہماری پوری بستی لاوا زدہ سی اور حبس کے باعث دم کشی میں مبتلا۔ تیز لُو کے باعث ساری کی ساری بستی پر سناٹا چھایا ہوا۔ ایسے میں کوئی بہت آفت کا مارا ہی اپنے ٹھکانے سے نکل کر باہر آنے کی جرأت کرسکتا تھا۔۔

اور خود میں بھی ایسے ہی آدمیوں میں سے ایک تھا۔

گو میں آفت کا مارا تو نہیں لیکن ''مروّت'' کا مارا ضرور تھا۔ اُن دنوں میں ہفتے میں دو تین بار صبح سویرے اپنی بستی سے نکل کر اسلام آباد ضرور جاتا تھا۔ میرے ایک ریٹائرڈ باس وہاں سے ''اشکال'' نامی ایک ماہانہ ادبی پرچہ شائع کر رہے تھے۔ اے سی والا شاندار آفس ان کی ذاتی کوٹھی میں تھا۔ میں وہیں بیٹھ کر اُن کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ یہ ''مروّت'' والا کام تھا یعنی کسی مقررہ ماہانہ مشاہرہ کے بغیر، جو میں سردی گرمی کی پروا کئے بغیر باقاعدگی سے انجام دے رہا تھا۔ وہ ماشاءاللہ بہت ''ویل آف'' شخص ہیں لیکن میں جب کبھی مہنگائی اور اپنی خالی جیب کا رونا روکر ماہانہ تن خواہ کی بات چھیڑتا تو وہ رونی سی صورت بنا کر دردبھری آواز میں کہتے: ''ہاں، مجھے تمھاری حالت کا بہ خوبی اندازہ ہے لیکن کیا کروں، تم جانتے ہی ہو، ادبی پرچوں سے کوئی انکم نہیں ہوتی، الٹا پلے سے لگانا پڑتا ہے...... میں تو بس ایک خاص مقصد یعنی ادب کی

خدمت کی غرض سے یہ مشکل جھیل رہا ہوں یعنی جیسے تیسے ''اشکال'' نکال رہا ہوں۔'' مجھے ترس آ جاتا کہ باس تو مجھ سے بھی زیادہ ''خستۂ تیغ ستم'' ہیں، حالاں کہ حقیقتاً ایسا نہ تھا۔ ماہ نامہ ''اشکال'' کا ہر شمارہ اچھے خاصے اشتہار لئے ہوتا تھا۔ سو، میرے خیال کے مطابق پرچے کی ماہانہ انکم ٹھیک ٹھاک تھی۔ کبھی کبھار جب باس بہت اچھے موڈ میں ہوتے تو چپکے سے میری جیب میں ایک لفافہ رکھ دیتے اور کہتے:

''لو بھئی، تم بھی اپنا کام چلاؤ، یہ میری طرف سے ایک ہدیہ قبول کرو''۔

میں گھر آ کر لفافہ کھولتا تو اس میں سے مہینے بھر کے سفری اخراجات سے بھی کم رقم نکلتی۔ میں ایک ریٹائرڈ بندہ، قلم کی گھس گھس کے ساتھ خود بھی کافی گھس چکا تھا اور اب بے کاری کے ہاتھوں تنگ تھا لیکن کسی بھی روزنامے یا ماہانہ پرچے میں ایک خستہ حال بوڑھے کو کام ملتا نہیں تھا۔ ''بے کار سے بے گار بھلی'' کے مصداق میں گلے میں بے کاری کا ''پٹہ'' لٹکائے، آئے دن ماہنامہ ''اشکال'' کے آفس میں اپنی فاقہ زدہ شکل دکھانے بڑ بڑ کرتا پہنچ جاتا۔ سو، میرا یہ فعل اُس مشہور کہاوت کے عین مطابق تھا کہ ''آخر مروت بھی کوئی چیز ہے، نبھانی تو پڑے گی''۔ اس کہاوت کے پیچھے ایک انسان کش کہانی چھپی ہوئی ہے۔

ارے، میں بھی کیا ہوں، اپنا ہی قصّہ لے بیٹھا۔ بات تو اُس برقع پوش لڑکی کی ہو رہی تھی، جو سخت گرمی کے عالم میں جانے کس جگہ یا گھر سے نکل کر آتی اور ہماری گلی طے کر کے کہیں آگے چلی جاتی تھی۔ اُس کی کیا خاص مصروفیت یا کام تھا، کچھ علم نہ تھا۔ میں دوپہر کے وقت اسلام آباد کے دُور افتادہ ایف الیون سیکٹر میں ماہ نامہ ''اشکال'' کے آفس سے چھٹی کر کے دو تین ویگنیں بدلتا، اپنے گھر کے دروازے پر پہنچتا تو سہ پہر کے تین بجے ہوتے تھے۔ اس وقت سوا نیزے والے سورج کی گرمی نے مجھے بے حال کر رکھا ہوتا۔ ٹھیک اسی سمے وہی برقع پوس نازنین، سینڈل کھٹکھٹاتی، میرے گھر کے سامنے سے گزر کر آگے بڑھ جاتی تھی۔ میں پسینے میں شرابور، اپنی درماندگی کو بھول کر یہ سوچنے لگتا کہ میں تو ٹھہرا ایک قلم بہ دست بندۂ مزدور اور اوپر سے ''مروّت'' کا مارا ہوا لیکن اس سرتاپا پردہ نشین ماہ جبین پر آخر ایسی کیا افتاد آ پڑی کہ بڑی باقاعدگی کے ساتھ روزانہ ادھر آتی اور ایک خاص سمت کا قصد کیے اگلی گلی میں جا مڑتی ہے اُس کی پُر اعتماد چال اور ''ملفوف'' جسم سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی بڑی ''کومٹڈ'' سی لڑکی ہے۔ موسم کی شدت کا کوئی معمولی سا احساس بھی دل میں لائے بغیر وہ اپنے کام سے کام رکھنا جانتی ہے۔ اس کا یہی عزم میرے لئے بہت متاثر کن تھا۔

ایک دن میرے جی میں کیا آئی کہ میں بھی آہستہ قدموں کے ساتھ اس لڑکی کے پیچھے چل پڑا۔ یہ دیکھنے کیلئے کہ آخر یہ روزانہ کہاں جاتی ہے۔ وہ میری والی گلی سے سیدھی چلتی گئی اور تھوڑا آگے جا کر ایک موڑ کاٹ کر دوسری گلی میں مڑ گئی۔ اسی گلی میں وہ ایک نئے قائم شدہ ''رضوانی کمپیوٹر اسکول'' کے اندر داخل ہوگئی۔ ہوسکتا ہے کہ وہاں پڑھتی ہو، میں نے سوچا۔ یوں تجسس ختم ہوا اور میں گھر واپس چلا آیا۔

اس کمپیوٹر اسکول کے مالک، اختر رضوانی، میرے واقف تھے، ایک صاف ستھری متشرع شخصیت، چھریرا وجود، آنکھوں میں ایک خاص چمک، چہرے کے گرد سنجیدگی کا ہالہ اور اپنے کام کے ماہر۔ وہ پیشے کے لحاظ سے استاد تھے۔ دن میں شہر کے کسی کالج میں کمپیوٹر سائنس پڑھانے کے بعد وہ بارہ ایک بجے اپنے گھر آ جاتے تھے۔ اسی گھر کے ایک حصے میں انھوں نے ایک پرائیویٹ تدریسی ادارہ کھولا ہوا تھا جہاں وہ مختلف درجوں کی کلاسز کو پڑھانے کے ساتھ ساتھ خالی اوقات میں عام گاہکوں کے علاوہ مختلف کمرشل اداروں کے لئے کمپوزنگ کا کام بھی کرتے تھے۔ یوں انھیں معقول آمدن حاصل ہو رہی تھی۔ کام روز بہ روز بڑھ رہا تھا۔ سو، اختر رضوانی نے محسوس کیا کہ اسکول کے روزمرہ کے دفتری امور نمٹانے کیلئے ایک اچھی آفس ہیلپر لڑکی یعنی لیڈی سیکرٹری رکھ لینی چاہیے جو مختلف دفتری کاموں، خط کتابت کے

علاوہ کمپیوٹر کے استعمال میں بھی طاق ہو۔اس سلسلے میں اختر رضوانی نے ایک دو اخباروں میں اشتہار دینے کے علاوہ چمن آباد کے واحد مین بازار اور مختلف گلیوں میں ''ضرورت ہے'' والے پوسٹر بھی چسپاں کروائے۔اس مہم کے بعد جب ایک دن وہ مجھے سرِ راہ گلی میں ملے تو علیک سلیک کے بعد میں نے پوچھا:

''آپ کافی دن پہلے لیڈی سیکرٹری کی تلاش میں تھے،مل گئی؟''

''جی ہاں، دو تین ہفتوں سے ایک لڑکی آنے لگی ہے لیکن وہ بالکل 'راھینڈ'' ہے۔ابھی میں اُسے کمپیوٹر کمپوزنگ اور لیٹر رائٹنگ وغیرہ کا کام سکھا رہا ہوں، وہ چونکہ پڑھی لکھی اور ذہین ہے، امید ہے کہ جلد ہی چل نکلے گی، بلکہ خاصا کام سمجھ چکی ہے۔''

اُن ہی دنوں مجھے معلوم ہوا کہ ایک مقامی ناشر افسانوں کا ایک مجموعہ شائع کرنا چاہتا ہے۔میرا اس سے رابطہ ہوا، اسے میرے افسانے پسند آئے، معاوضہ طے ہو گیا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ افسانوں کی کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ میں خود کرواؤں گا۔چونکہ یہ میری پہلی کتاب تھی، میں نے شرط منظور کر لی اور اپنے پڑوسی اختر رضوانی سے ٹیلی فون پر رابطہ کیا۔بولے''آپ کل نماز عصر سے پہلے آفس آجایئے''۔

اگلے روز اپنے مسودوں کی فائل اُن کے سامنے رکھ دی اور عین اسی وقت وہی برقعہ پوش نازنین چق اٹھا کر اندر آ گئی۔علیک سلیک کے بعد اس نے اپنی سیٹ سنبھال لی۔وہ برقعے میں مستور تھی اور چہرے پر بھی نقاب تھا۔صرف آنکھیں کھلی تھیں، خوب صورت، چمکیلی اور ذہانت سے معمور۔

''یہ مس راشدہ ہیں، ہماری نئی لیڈی سیکرٹری۔اچھی سوجھ بوجھ کے ساتھ کمپیوٹر سیکھ رہی ہیں لیکن کمپوزنگ میں خاصی مہارت حاصل کر چکی ہیں، آفس ورک بھی ان کے ذمے ہے......میں آپ کا کمپوزنگ والا یہ کام اِن ہی کے سپرد کروں گا، تین دن کے بعد معلوم کر لیجئے گا''۔رضوانی نے کہا۔تین دن کے بعد دو کمپوز شدہ افسانے مل گئے۔خلافِ توقع مجھے ان میں بہت کم غلطیاں نظر آئیں۔جلد ہی پروف بینی کا کام مکمل کر کے میں نے یہ میٹر ضروری اصلاح کے لئے رضوانی کے حوالے کر دیا۔کوئی ایک ہفتے کے بعد میں دوبارہ رضوانی کے آفس پہنچا۔وہ اندر موجود نہ تھے، البتہ ان کی پردہ پوش لیڈی سیکرٹری کمپیوٹر پر جھکی ہوئی تھی۔میں نے اُسے ایک نظر بہ غور دیکھا اور اس نے مجھے۔باریک نقاب اس کے سرخ ہونٹوں پر اُتر آنے والی مسکراہٹ کو چھپا نہ سکا۔

''آپ طاہر صاحب ہیں نا؟ رضوانی صاحب تو اس وقت کلاس لے رہے ہیں۔میں آپ ہی کا مسودہ کمپوز کر رہی تھی......بہت اچھا لکھتے ہیں آپ، کئی مشکل سے الفاظ بھی دیکھے لیکن کسی کسی افسانے میں آپ کی لکھی ہوئی کوئی بات پڑھ کر مجھے......پسینہ آ گیا اور یہ بات میں نے رضوانی صاحب کو بھی بتائی تھی''۔راشدہ نے کہا

''پسندیدگی کا شکریہ، آج کل گرمی کا موسم ہے، پسینہ تو آنا ہی چاہیے''۔میں مسکرایا۔

''جی میں موسم کی نہیں آپ کی تحریر کی بات کر رہی تھی''۔میں مسکرا کر خاموش ہو رہا، اُس سے کیا بحث کی جا سکتی تھی۔

میں اٹھنے لگا تو اسی وقت رضوانی آ گئے۔''یہ محترمہ آپ کی تحریر کی فین بن چکی ہیں۔کمپوز کرنے سے پہلے انھوں نے آپ کے سارے افسانے پڑھ ڈالے، سب کے سب پسند آئے، کچھ مشکل الفاظ اپنی کاپی میں نوٹ کئے اور چند بولڈ جملوں پر حیرانی ظاہر کی تو میں نے انھیں بتایا کہ یہ ادبی تحریریں ہیں کوئی مذہبی یا اخلاقی مضامین نہیں، ہر ادیب کا اپنا اپنا انداز ہوتا ہے اور وہ اپنی تحریر کو موضوع کے تقاضے

کے مطابق ڈھالتا ہے۔'' رضوانی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ مجھے دومزید افسانے پروف بینی کے لئے مل گئے اور میں وہاں سے اٹھ آیا۔

آنے والے کئی دن میرے لئے بہت مصروفیت کے تھے اور وہ دونوں افسانے میز پر پڑے میری راہ تکتے رہے۔ میں اُس ''مروت'' والے کام کے علاوہ کئی ضروری گھریلو مصروفیات میں الجھا رہا۔ اس دوران رضوانی کی لیڈی سیکرٹری مقررہ وقت پر باقاعدہ اپنی ڈیوٹی پر کھٹا کھٹ آتی رہی۔ بالآخر میں نے اپنے افسانوں کے پروف پڑھ لئے اور جب قریباً دو ہفتوں کے بعد میں یہ میٹر لئے رضوانی کے دفتر پہنچا تو وہ اپنی سیکرٹری سمیت کمپوزنگ کے کام میں بے حد مصروف نظر آئے، کہنے لگے: ''چند مقامی اسکولوں سے کمپوزنگ کے ارجنٹ کام میرے پاس آ گئے ہیں، مکمل کر کے مقررہ وقت پر دینے ہیں، اس کے بعد ہی آپ کے باقی افسانوں کی کمپوزنگ شروع کی جا سکے گی''۔ میں واپس گھر آ گیا۔

پھر ایک دن موقع ملتے ہی مَیں رضوانی کے آفس جا پہنچا۔ ٹھنڈے ماحول میں پُر تپاک علیک سلیک ہوئی، لیکن مجھے رضوانی تھکے تھکے اور کچھ اداس سے لگے، بولے:

''آپ ہی کے باقی ماندہ افسانوں کی کمپوزنگ میں لگا ہوں، وہ ایمرجنسی والا کام ختم ہو چکا''۔

''لیکن آج آپ تنہا ہیں؟''

''ہاں، تین روز قبل میری سیکرٹری کا فون آیا کہ میں اپنے ہوم ٹاؤن چکوال جا رہی ہوں، بھائی کی شادی ہے۔ اب دیکھئے، محترمہ نے کوئی تحریری درخواست نہیں دی۔ آج کل کے ینگ لوگوں کو اپنی ملازمت والی ذمہ داریوں کا کوئی احساس ہی نہیں۔ ویسے انھیں شکائت رہتی ہے کہ جاب نہیں ملتی، ٹیلنٹ ضائع ہو رہا ہے''۔

مجھے احساس ہو گیا کہ اپنے کام کی تکمیل کیلئے مجھے کچھ انتظار کرنا ہو گا۔

آنے والے کئی دن میرے لئے خالی تھے۔ ان ہی دنوں میرے ایک مدیر دوست نے اپنے ادبی ماہ نامے ''رنگ جمال'' کے لئے مجھ سے ایک افسانہ مانگا اور یہ بھی کہا کہ ان کا کمپوزر چھٹی پر گیا ہے لہٰذا میں خود اسے یو ایس بی میں کمپوز کروا کر ان کے حوالے کروں۔ سو، میں قرطاس و قلم پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ایک افسانے کا پلاٹ کافی عرصہ سے میرے ذہن میں بھٹک رہا تھا۔ میں اسی کو کاغذی پیراہن پہنانے لگا۔ سادہ سی کہانی تھی۔ عنوان تھا ''ٹیوشن''۔ بنیادی طور پر اُس میں اُن نویلی رُتوں کا قصہ تھا جب لڑکے یا لڑکی کے جسم سے بچپن کی رِدا اُتر جاتی ہے اور وہ ہائی کلاسز میں جا پہنچتے ہیں۔ اُس وقت اُن کے دل نوخیز جوانی کے انوکھے جھولوں کی اڑان میں کپکپانے اور بدن ایک عجیب سی زبان بولنے لگتے ہیں، ایسی زبان جو لڑکی لڑکے کو سمجھ میں آتی بھی ہے اور نہیں بھی...... پھر جوں جوں وقت آگے بڑھتا ہے تو یوں ہوتا ہے کہ یہ نوخیز اور ایک دوسرے کے متلاشی بدن جب کبھی اتفاقاً ایک دوسرے کے قریب آئیں یا باہم کبھی ٹکرا جائیں تو لذت و سرور کے ہلکورے انھیں گھیر لیتے ہیں۔ اور وہ باہمی برتاؤ کے نئے اسلوب سیکھنے لگتے ہیں۔ تاہم جسموں کی باہمی تلاش ایک تاعمر ختم نہ ہونے والا کام ہے۔ زندگی کے اور سب رنگ اس خاص رنگ کے سامنے ماند ہیں۔ میرا یہ نیا افسانہ قدرے طویل تھا لیکن جلد ہی مکمل ہو گیا۔ میں نے اسے اپنی یو ایس بی سمیت رضوانی کے حوالے کر دیا۔ ان کی سیکرٹری اپنے بھائی کی شادی اٹینڈ کرنے کے بعد آفس لوٹ آئی تھی۔ حسبِ دستور برقعے میں ملفوف تھی لیکن اس کی آنکھیں ایک خاص سرشاری کی چمک لئے ہوئے تھیں۔ ہر لڑکی ایسے فنکشنوں سے ایسا ہی سرور حاصل کرتی ہے۔ میرا مذکورہ افسانہ کمپوزنگ کیلئے اس کے ہاتھوں میں پہنچ گیا جسے حسبِ معمول پہلے اس نے پڑھنا شروع کر دیا۔ مقررہ دن جب میں اپنی یو

ایس بی واپس لینے رضوانی کے پاس گیا تو مجھے ایک دلچسپ بات سننے کو ملی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا: ''آپ کا افسانہ ''ٹیوشن'' راشدہ صاحبہ نے پڑھا، پسند آیا، لیکن اس کی چند ''خاص'' سچوایشنز ان محترمہ کو عجیب سی لگیں اور مجھ سے پوچھا کہ یہ رائٹر لوگ کہانیوں میں ''ایسی'' باتیں کیسے لکھ لیتے ہیں، اب اس بارے میں آپ خود کیا کہیں گے؟''

''میں اوروں کے بارے میں تو کچھ نہیں جانتا لیکن اپنے متعلق یہی کہہ سکتا ہوں کہ کہانی خود کو مجھ سے لکھواتی ہے۔ پہلے سے اس کا پلاٹ مجھے معلوم ہوتا ہے لیکن اس کی تفصیلات قلم چلنے کے ساتھ ساتھ کہانی میں اترتی آتی ہیں۔ رہی اس افسانے کی چند ''خاص'' سچوایشنز کی بات، تو میرا خیال یہ ہے کہ اگر انھیں نکال دیا جائے تو پھر یہ پوری کہانی دھڑام سے نیچے آ گرے گی اور یوں وہ محض ایک خبرنامے کی طرح ہو کر رہ جائے گی، چند ایک بولڈ جملوں کا مقصد کہانی میں محض ''رنگینی'' لانا نہیں ہے۔''

میری بات سن کر راشدہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور رضوانی نے مسکرا کر مجھے کہا: ''لگتا ہے آپ کا نکتہ ان محترمہ کو اچھی طرح سمجھ میں آ گیا ہے۔''

''اور یہ میرے لئے بڑی خوشی کی بات ہے۔ ایک قابل طالب علم یا ایک ذہین قاری وہی ہوتا ہے جو مطالعے کے بعد کوئی سوال بھی کرے۔''

''میں تو ڈر رہی تھی کہ آپ کہیں ناراض نہ ہو جائیں کیونکہ رائٹر لوگ نازک مزاج ہوتے ہیں''۔

''وہ رائٹر ہی کیا جو کسی اچھے سوال پر ناراض ہو جائے''۔ میں مسکرایا

میری یو ایس بی جس میں افسانہ ''ٹیوشن'' تھا، جلد واپس مل گئی اور فوراً ہی متعلقہ مدیر صاحب تک پہنچا دی گئی۔ تاہم میری کتاب والے افسانے رضوانی کے پاس موجود تھے اور ان کی کمپوزیشن ابھی جاری تھی۔ قریباً آٹھ دس روز بعد میرے ناشر کا فون آ گیا۔ اس نے میٹر فوری طور پر بھجوانے کا تقاضا کیا۔ میں رضوانی سے ملنے چلا گیا۔ اس کی تیوریوں میں بل پڑے ہوئے تھے اور وہ یکا وتنہا اپنے کمپیوٹر پر کام کرنے میں لگا ہوا تھا۔ لیڈی سیکرٹری کی کرسی خالی پڑی تھی۔

''لگتا ہے آج یہ محترمہ نہیں آئیں؟''

''آپ ٹھیک سمجھے، دو روز سے غائب ہیں، طبیعت ناساز ہے، کوئی اپلی کیشن نہیں، ان کی سوتیلی والدہ تشریف لائی تھیں اور اُن کی نصف ماہ کی تن خواہ لے گئی ہیں۔ راشدہ صاحبہ کی دوائی لانی ہے، گویا یہ آفس نہیں کوئی بیت المال ہے۔'' رضوانی کی آواز میں غصہ تھا۔ میں ہنس پڑا۔ وہ پھر گویا ہوئے۔ ''آپ چند دن اور انتظار فرمائیے، میں آپ کا کام نمٹانے کی کوشش میں لگا ہوں''۔ چار دن بعد مجھے چار افسانوں کے پروف مل گئے اور میں اغلاط بینی کا یہ کام مکمل ہوتے ہی میں پروف لئے پھر رضوانی کے دفتر جا پہنچا۔ حیرت ہوئی کہ وہاں راشدہ اسی سدابہار برقعے میں ڈھکی چھپی اپنی نشست پر موجود تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی خوب صورت جھالردار آنکھیں مسکرائیں، چہرہ بدستور مستور تھا لیکن اُس کی جسمانی زبان بتا رہی تھی کہ اسے میرا آنا اچھا لگا، جانے کیوں؟

''رضوانی صاحب تو اوپر فرسٹ فلور پر کلاس لے رہے ہیں اور میں آپ کے افسانوں پر کام کر رہی ہوں۔''

''شکریہ، یہ بتائیے کہ اب آپ کیسی ہیں، پچھلے دنوں آپ بیمار تھیں۔''

''جی ہاں، لیکن بیماری سے زیادہ کچھ ذاتی مسائل میرے لئے پریشان کن ہیں۔''

''حوصلہ رکھئے، وہ بھی دور ہو جائیں گے...... یہ چار افسانوں کے پروف حاضر ہیں، آپ اغلاط لگا دیجئے گا''۔

''آپ ایک ماہر زود نویس ہیں لیکن یہ بتایئے کہ آپ اتنا اچھا اور اتنا کچھ کیسے لکھ لیتے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔ سوالیہ نشان اس کی آنکھوں میں بھی اتر آیا تھا۔ ''ماہر تو میں ہرگز نہیں، افسانہ نگاری سے زیادہ لگاؤ نہیں۔ میں نے زندگی کے عام مسائل پر کافی مضامین لکھے ہیں۔ اب بھی لکھتا ہوں لیکن کم کم......'' ''مجھے قلم کار لوگ بہت اچھے لگتے ہیں؟ آپ مجھے افسانہ نگاری سکھا دیجئے لیکن میری اردو اتنی اچھی نہیں۔''

''زیادہ سے زیادہ مطالعہ کیجئے کتابوں کا اور اور لوگوں کا بھی''۔

راشدہ سے یہ میری پہلی قدرے طویل ملاقات تھی، لیکن چند منٹ ہی رہی...... میں کرسی سے اٹھا اور دو مزید افسانوں کے پروف لے کر گھر چلا آیا۔ راشدہ کی کہی ہوئی بات میرے ذہن میں گونجتی رہی: ''کچھ ذاتی مسائل ایسے ہیں جو میرے لئے پریشان کن ہیں''۔ خدا جانے اس برقع پوش اور اصول پرست سی لڑکی کو ایسے کن مسائل کا سامنا ہے جو اُس کے لئے پریشانی کا باعث ہیں۔ میں نے کچھ دیر سوچا لیکن پھر سر جھٹک کر افسانوں کی مشینی نقول پر جھک گیا۔ اغلاط کی نشان دہی سے فارغ ہوا تو اُسی وقت اسلام آباد سے سابقہ باس کا فون آ گیا۔۔

''بہت دنوں سے نہیں آئے ہو۔ آپ کو یاد تو ہوگا کہ ماہ نامہ ''اشکال'' کا اگلا شمارہ سال نامہ ہے۔ آپ اپنے افسانے سمیت جلد تشریف لایئے۔'' جواب میں میں نے چند عذر پیش کئے کیوں کہ یہ ''مروت'' والا کام میرا خون نچوڑ رہا تھا، اور یہ بھی کہا کہ میری جیب بالکل خالی ہے جبکہ پبلک ٹرانسپورٹ میں ادھار چلتا نہیں۔ وہ خاموش رہے اور پھر ہمارے فون بند ہو گئے۔ ایک دو روز بعد رضوانی نے بقایا افسانوں کے پروف مجھے بھجوا دیئے۔ میں نے ان پر اپنا کام کیا اور خوش گوار حیرت ہوئی کہ ان میں اغلاط برائے نام ہی تھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اسی نو آموز سی لڑکی کا کمال تھا۔ پروف خوانی کے بعد میں تمام کاغذات رضوانی کو واپس کرنے چلا گیا۔ راشدہ کی محنت کی تعریف کی۔ وہ اُس وقت تک آفس نہیں پہنچی تھی۔ رضوانی نے کہا: ''یہ لڑکی ایک غریب گھر سے ہے۔ باپ بیمار ہے، سگی ماں کافی عرصہ پہلے فوت ہو چکی، سوتیلی ماں گھر کی دیکھ بھال کرتی ہے، بہت شکی مزاج خاتون ہے، اکثر چیک کرتی ہے کہ راشدہ آفس ہی میں موجود ہے کہیں اور تو نہیں نکل گئی۔ کبھی وہ فون پر مجھ سے پیسے مانگتی ہے خواہ ادھار یا بیٹی کی تن خواہ سے ایڈونس کی صورت میں......غصہ آتا ہے کہ مجھے ان لوگوں کا گھر بھی چلانا پڑے گا۔ راشدہ کو اس صورت حال سے آگاہ کیا تو اس نے کہا کہ ماں کو ہرگز پیسے نہ دیجئے گا''۔

''ابھی آپ نے کہا تھا کہ وہ ایک غریب گھر سے تعلق رکھتی ہے، اس کا باپ بیمار ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی کام کرتا نہیں ہوگا تو یقیناً گھر کا سارا بوجھ راشدہ کے کاندھوں پر ہی ہوگا۔''

''جی ہاں، یہی بات ہے۔ لڑکی کے دو بھائی جو اپنے ہوم ٹاؤن چکوال میں ہوتے ہیں، ان لوگوں کی کوئی خاص مدد نہیں کرتے۔ کبھی کبھی باپ کو دیکھنے آ جاتے ہیں۔'' ''تو پھر گھر کا گزارہ کیسے چلتا ہے؟'' ''فی الحال اسی تن خواہ سے جو راشدہ یہاں سے لے جاتی ہے۔ یقیناً یہ اُن کی ضروریات کیلئے ناکافی ہے۔ سو، میں یہ درخواست کروں گا کہ آپ، جو کچھ ممکن ہو، اس کی ضرور مدد کیجئے۔''

''جی بہت بہتر''۔ میں نے اجازت لی اور گھر چلا آیا۔

اگلے دنوں میں ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ میرا افسانوں کا مجموعہ، بالآخر چھپ گیا۔ چند اخبارات و رسائل میں اس پر تبصرے

شائع ہوئے، بہی خواہوں کی جانب سے مبارک بادیں ملیں اور جیب میں ایک ہلکی سی رقم بھی آ گئی۔ مجھے رضوانی کی بات یاد تھی۔ ایک روز میں اپنی کتاب کا ایک نسخہ اور لفافے میں پانچ سو روپے کا نوٹ ڈال کر ان کے آفس چلا گیا۔ کتاب رضوانی کو اور ان ہی کی معرفت لفافہ راشدہ کو پیش کیا۔ ان کے شکریئے وصول کئے اور جب چلنے لگا تو راشدہ نے کہا: ''سر جی، کتاب کا ایک نسخہ مجھے بھی دیں، اس کتاب کیلئے کام کرنا میرے لئے ایک اعزاز ہے۔ میں اپنی سہیلیوں اور عزیزوں کو بھی دکھاؤں گی''۔ اُس کی آواز میں سچی خوشی کا عنصر تھا۔ ایک روشن ذہن کتاب کو ضرور چاہتا ہے۔ راشدہ یقیناً ایک کتاب دوست لڑکی تھی۔ ایک نسخہ اُسے بھی مل گیا۔ کتاب کی بہ دولت ادبی اور صحافتی حلقوں میں میری پہچان بڑھ گئی۔ کئی مدیران کرام میرے افسانوں کے خواہاں ہوئے۔ اب میرے لئے اچھے پرچوں کے ذریعے قارئین کی نظروں میں رہنا ضروری ہو گیا تھا۔ سو، میں نے اپنی ایک پرانی فائل میں سے کئی غیر مطبوعہ افسانے نکالے اور نظر ثانی کے بعد کمپوزنگ کے لئے رضوانی کے حوالے کر دیئے۔ اسی اثناء میں ماہ نامہ ''اشکال'' کے مدیر محترم نے مجھے چار ہندسوں والی ماہانہ تن خواہ پر اپنے ہاں کام کی دعوت دی۔ میں نے بے کار بیٹھنے سے کچھ کرنا بہتر سمجھا۔ سو میں اسلام آباد جانے لگا۔ راشدہ نے میرے مسودوں کی تیزی سے کمپوزنگ شروع کر دی۔ کئی دن گزر گئے۔ میں اپنے افسانوں کی مشینی نقول کا انتظار کرنے لگا۔ آخر ایک اتوار کی شام رضوانی نے مجھے اپنے آفس بلایا۔ میں وہاں پہنچا تو دیکھا موصوف کا چہرہ لٹکا ہوا اور آنکھوں میں اداسی کے رنگ جمے ہوئے تھے۔ ''کیا بات ہے رضوانی صاحب، خیریت تو ہے؟''

''خیریت ہی تو نہیں ہے، یہ میری شاگرد صاحبہ.....'' انھوں نے کمرے کے اُس کونے کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک کمپیوٹر سیٹ کے ساتھ راشدہ کی نشست تھی۔ ''اچانک نوکری چھوڑ گئی ہے، اس نے گھر سے لکھ بھیجا ہے کہ اُسے فوری طور پر فارغ کر دیا جائے۔ میرے ٹیلی فونک رابطے پر اُس نے اِس کا سبب ''گھریلو مسائل'' بتایا۔ مزید پوچھنے پر اُس نے کہا کہ ''دونوں بھائی نہیں چاہتے کہ میں نوکریاں کرتی پھروں۔ انھوں نے مجھے گھر والوں سمیت اپنے پاس چکوال بلایا ہے۔ وہ وہیں میری شادی بھی کرنا چاہتے ہیں۔''

رضوانی نے پانی کا گلاس منھ سے لگا لیا۔ راشدہ کا اچانک استعفا دینا میرے لئے بھی حیران کن تھا۔ اس کے مستور لیکن جوان وجود سے کمرے کا وہ مخصوص کونا خوبصورت لگتا تھا۔ کمرے کا ماحول اس کے سانسوں اور بدن کی خوشبو سے مہکا رہتا تھا اور اب سونا لگ رہا تھا۔ رضوانی کے چہرے پر پسینے کے قطرے ابھر آئے۔ انھوں نے جذباتی سے انداز میں پھر اپنی بات شروع کی۔

''میں نے اس لڑکی پر بڑی محنت کی تھی اس توقع پر کہ وہ بہ طور آفس سیکرٹری میرے ساتھ کام کرتی رہے گی لیکن وہ کسی سچے یا جھوٹے بہانے کے تحت اچانک کام چھوڑ گئی ہے۔ ابھی تو م۔م۔ میں نے اُسے اور بہت کچھ سکھانا تھا لیکن اس کی قسمت، میں کیا کر سکتا ہوں؟'' انھوں نے پانی کا دوسرا گلاس منھ سے لگا لیا۔ پھر گویا ہوئے۔ ''میں نے کافی غور کیا تو یہ نتیجہ نکالا کہ یا تو اُسے یہیں کسی ادارے میں بہتر جاب مل گئی ہے یا پھر واقعی اس کے لالچی بھائی اسے چکوال بلا کر اُس سے نوکری کروانا چاہتے ہیں۔'' موصوف چند سیکنڈ کے لئے رُکے، بہ غور مجھے دیکھا اور بولے: ''اور میں نے یہ بھی اندازہ لگایا ہے کہ آپ نے جب اُسے پانچ سو کا نوٹ لفافے میں پیش کیا تو وہ خوش بہت ہوئی تھی، اُس نے گھر جا کر اس انعام کا ذکر کیا ہوگا تو یقیناً اُس کے بھائیوں پر اِس بات کا اچھا اثر نہیں پڑا اور انھوں نے اُسے گھر بٹھا لینا مناسب سمجھا۔ طاہر صاحب، آپ کو اُسے یہ انعام دینے کا کوئی حق نہ تھا، آپ نے ایسا کیوں کیا؟''۔ رضوانی کی آنکھوں میں غصہ تھا اور لگ رہا تھا کہ اُسے کافی بڑا جذباتی جھٹکا لگا ہے، اِسی لئے اُول فول بولنے لگا تھا انداز ایسا تھا گویا میں نے کوئی چوری کی ہے۔

''محترم رضوانی صاحب، میں نے اُس لڑکی کو پانچ سو روپے بہ طور انعام نہیں بل کہ اس کی مدد کی صورت میں دیئے تھے اور اس

کیلئے ایک بار آپ نے خود مجھے کہا تھا۔اپنی کسی ناکامی کی ذمہ داری مجھ پر نہ ڈالئے ، میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں، آپ کا طرزِ تخاطب میرے لئے ناقابلِ برداشت ہے،میرے سارے مسودے مجھے ابھی واپس کر دیجئے۔''میں نے اپنی فائل اٹھائی اور گھر آ گیا۔رضوانی کی غلط بات نے میرے دل میں غصہ بھر دیا تھا۔

چند دن بعد رضوانی نے موبائل پر مجھ سے رابطہ کیا۔اس وقت میں ماہ نامہ ''اشکال'' کے آفس میں بیٹھا تھا۔موصوف نے معذرت پیش کی۔میں خاموش رہا۔کہنے لگے:''اُس روز میں افسوس کے عالم میں آپ کو جانے کیا کیا کہہ بیٹھا۔یہ محض میری زبان کی لغزش تھی۔مجھے آج بھی راشدہ پر غصہ ہے،ویسے سنا ہے کہ وہ یہیں چمن آباد کالونی میں کہیں کام کر رہی ہے،خیر، مجھے کیا،وہ کچھ بھی کرے''۔

''یہ فرمایئے کہ آپ نے اس ناچیز کو کیسے یاد فرمایا؟''

''آپ سے درخواست ہے کہ اپنی فائل سمیت تشریف لے آیئے۔''

''میں اِس وقت اسلام آباد میں ہوں اور رہی فائل تو آج کل وہ کسی اور کمپوزنگ مرکز میں زیرِ کار ہے۔''

''چلئے فائل نہ سہی، آپ شام کسی وقت یہاں آفس میں تشریف لائیں۔''

''کوشش کر سکتا ہوں لیکن وعدہ نہیں۔''لیکن میں نے فوری طور پر ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔

چند ہفتے گزرے،ایک روز بستی چمن آباد کے ایک معروف سکول میں ''یوم والدین'' کے موقع پر مجھے اپنی نواسی کے ساتھ جانا پڑا۔متعلقہ ٹیچر سے شکائت کی کہ بچی کی اچھی پرفارمنس کے باوجود اسے امتحان میں کم نمبر ملے۔ٹیچر نے چند وجوہات بتائیں اور یہ بھی کہا کہ اگر آپ مطمئن نہیں تو پرنسپل صاحبہ سے مل لیجئے۔''میں نے تعمیل کی لیکن وہ آفس میں موجود نہ تھیں۔میں بچی سمیت وہیں بیٹھ گیا۔چند منٹ بعد وہ تشریف لے آئیں۔میں احتراماً سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔محترمہ کھڑی کی کھڑی ٹک ٹک مجھے دیکھتی رہیں۔

''ارے! طاہر صاحب آپ؟ زہے نصیب، آج تو میرے سکول کے بھاگ جاگ گئے کہ آپ تشریف لائے، کہیے،میرے لائق کیا خدمت ہے؟''۔یہ راشدہ تھی اور آج پہلی بار میں اسے نقاب کے بغیر دیکھ رہا تھا،حیران، حیران بل کہ دم بہ خود۔! میرے سامنے ایک حسنِ مجسم تھا جو متبسم ہو کر مجھ سے متکلم بھی تھا!

میری نواسی کا مسئلہ سن کر راشدہ نے متعلقہ ٹیچر کو ضروری ہدایت دیں اور اسی اثناء میں آفس بوائے چائے لے آیا۔

''آپ نے رضوانی کا آفس اچانک کیوں چھوڑ دیا؟''میں نے چائے سپ کرتے ہوئے پوچھا۔

''وہ صاحب مجھ پر مر مٹے تھے، کہتے تھے کہ تمھاری خاطر پہلی وائف کو چھوڑ دوں گا۔میری ماں کو بھی اس رشتے کے لئے راضی کر لیا تھا۔موصوف کی دیدہ دلیری دیکھئے کہ ایک دن نکاح خواں کا انتظام کر لیا۔جب کہ میری نگاہوں کا مرکز کوئی اور ہی تھا۔میں نے فوراً نوکری چھوڑ دی۔میری پسند،انور نے بَروقت مجھے اپنا لیا۔اب میرا نام اُن کے ساتھ ہے اور یہ اسکول بھی ان ہی کا ہے''۔

میں نے راشدہ کو نئی زندگی کا آغاز کرنے پر مبارک باد دی اور اپنے گھر چلا آیا۔اگلے روز میرے پاس کچھ خالی وقت تھا۔میں یوں ہی ٹہلتا ٹہلتا رضوانی کے آفس چلا گیا۔صدر دروازے کے ساتھ لگے ایک بڑے سے اشتہار پر لکھا تھا:''ضرورت ہے لیڈی سیکرٹری کی''۔واقعی یہ ''ضرورت'' اور یہ ''تلاش'' تو ایک تاعمر ختم نہ ہونے والا کام ہے۔''میں نے سوچا اور مسکرانے لگا۔

◆◆◆

ایک اور زخم

نجیب عمر

''امی آج آپ کے لیے بڑی خوشخبری۔'' میں نے ان کے چہرے پر یاس اور امید کی ملی جلی کیفیت دیکھی۔ انہوں نے کہا'' کیا ہے خوشخبری؟ بتاتے کیوں نہیں، کیا یہ امریکہ سے آ رہی ہے؟ مجھے اندازہ ہوگیا کہ جو اچھی خبر میں ان کے لیے لایا ہوں، اس تعلق سے وہ مایوس ہو چکی ہیں۔ انہیں زیادہ انتظار کروانا مناسب نہیں سمجھا۔ ان کا پاسپورٹ ان کے سامنے کر دیا۔'' امی آپ کا انتظار ختم ہوا۔ خالہ جان سے ملنے آپ ہندوستان جا سکیں گی۔'' میں نے بتایا۔ ان کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ یہ خوشی کے آنسو تھے۔ وہ تیس سال بعد اپنی بہن سے ملنے ہندوستان جانے والی تھیں۔

اب گھر میں ہر وقت ہندوستان کا ذکر ہونے لگا۔ جانے کی تیاری کے ساتھ، تحائف خریدے جانے لگے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ امّی ان کی آنکھوں میں ایک روشنی تھی جو اپنے رشتہ داروں سے ملنے کے لیے چمک رہی تھی۔ ماموں جان اگرچہ ان کے اکلوتے بڑے بھائی تھے لیکن ان کے رویئے کی وجہ سے امی ان سے کھینچی کھینچی رہتی تھیں۔ نانا جان کے انتقال کے بعد ماموں جان نے تمام تر جائیداد پر قبضہ کر لیا اور بہنوں کا حق پورا ادا نہیں کیا میری والدہ چونکہ پاکستان آ چکی تھیں لہٰذا ہمارا حصہ وہ سارا ہڑپ کر گئے۔ میرے والد ایک صابر و شاکر انسان تھے۔ خود صبر کیا اور والدہ کو بھی یہی مشورہ دیا۔ لیکن امی کے دل میں ایک پھانس ہمیشہ چبھی رہی۔ بڑا بھائی باپ کی جگہ ہوتا ہے پر انہوں نے مایوس کیا۔

اس سب کے باوجود بہن سے تعلقات غیر معمولی رہے۔ خالہ جان ان سے پانچ برس چھوٹی تھیں۔ دونوں میں بڑی محبت تھی۔ تقسیم کے بعد میرے والدین پاکستان چلے آئے۔ خالو اور ماموں نے وہیں رہنے کا فیصلہ کیا۔ بہن سے دوری میری والدہ کو بہت کھلتی تھی۔ لیکن مجبوری تھی۔ جیسے ہی ویزا کھلنے کی خبر والدہ نے سنی۔ انہوں نے ہندوستان جانے کا قصد کیا۔ بہن سے خط و کتابت ہمیشہ رہی لیکن اس سے صبر اور قرار کی بجائے تڑپ اور بڑھ جاتی۔ چنانچہ میں نے ان کے اور چھوٹے بھائی کے ویزے کی درخواست دے ڈالی۔ اس وقت سے وہ آس لگائے بیٹھی تھیں۔ ویزا آفس میں ایک لمبی قطار تھی۔ بہت سارے لوگ اپنے پیاروں سے ملنے کو بے چین تھے لہٰذا وقت ضرورت سے زیادہ لگ رہا تھا۔

اس دوران میں خالہ جان اور ماموں جان کا ذکر روز ہونے لگا۔ ماضی کی یادوں سے وہ تلخ و شیریں روز سنایا کرتیں۔ ہم سب اسے کسی افسانے کی مانند سنتے۔ ان کی تڑپ کے ہم سب قائل تھے اور ہماری دلی خواہش تھی کہ وہ ایک بار ضرور ہندوستان ہو آئیں تا کہ انہیں قرار آ جائے۔ چھوٹے عامر کو بھی ہندوستان دیکھنے کا شوق تھا۔ وہ میٹرک کا طالب علم تھا۔ اس کی ہندوستان سے متعلق تمام تر معلومات کا

ذریعہ ہندوستانی فلمیں تھیں۔ ایک دن تو عامر نے حد کر دی۔ اپنی بھابی سے کہنے لگا:

''اگر کوئی میرے دل کی پوچھے تو میں ایک ہندو لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

بھابھی نے حیرت سے پوچھا۔ ''وہ کیوں بھئی''

''ہندو عورتیں اپنے شوہروں کی پوجا کرتی ہیں۔ ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہیں''۔ عامر نے جواب دیا۔

''اچھا تو تم اپنی پوجا کروانا چاہتے ہو''۔

''بھابھی آپ سوچیں کتنا مزہ آئے گا جب روزانہ صبح سویرے میری پوجا ہوا کرے گی۔ پاکستان میں تو ایسا ممکن نہیں۔''

میری بیگم نے اسے بتایا ''تصویر کا دوسرا رخ بڑا بھیانک ہے، جس کی تمہیں خبر نہیں۔''

''امی ساتھ جا رہی ہیں اور تمہیں کنوارا ہی واپس لے کر آئیں گی۔ تم خاطر جمع رکھو''۔ بیگم سے یہ سب جان کر مجھے بڑی ہنسی آئی۔

امی کے جانے میں دو دن رہ گئے۔ ان کی تمام تیاری مکمل تھی۔ دوسرے روز چھٹی تھی، ہم سب نے امی کو گھیر لیا اور ان سے ہندوستان میں ان کے بچھڑوں کے بابت دریافت کی۔ امی کہنے لگیں بیٹا کیا کیا سناؤں ایک پوری زندگی ہے۔ بچھڑنے کا دکھ ساری زندگی کا ہوتا ہے۔ اسے بھلایا نہیں جا سکتا۔ لیکن خیر۔ آج میں تمہیں اپنی اکلوتی اور پیاری بہن سکینہ کے بارے میں بتاتی ہوں۔

''وہ مجھ سے کافی چھوٹی تھی۔ میں پانچ چھ برس کی تھی کہ سکینہ ایک کھولنے کی طرح ہمارے آنگن میں اتر آئی۔ سب اسے پیار کرتے حتیٰ کہ نانا، نانی اور بھائی بھی۔ ماں تو ظاہر ہے اس کی دیکھ بھال میں لگی رہتی۔ یا یوں کہیے کہ ایک طرح سے میری نفی ہو رہی تھی۔ صرف والد صاحب مجھ میں دلچسپی لیتے تھے۔ لہٰذا میں نے سکینہ کو اپنا حریف سمجھ لیا۔ ایک طرح کی نفرت میرے دل میں بیٹھ گئی کہ اس کے آنے سے میری اہمیت کم ہوگئی۔ میں نے ماں سے کہا، ''سکینہ کو کہیں پھینک آئیں، یہ مجھے اچھی نہیں لگتی۔'' ماں میرے دل کا حال جانتی تھی لہٰذا مجھے سمجھایا۔ ''سکینہ تمہاری گڑیا جیسی بہن ہے۔ وہ بڑی ہو کر تمہارے ساتھ کھیلے گی۔ وہ تمہیں آپا کہے گی تم سے پیار کرے گی۔''

ماں کی باتوں سے میرے جذبات کچھ ڈھل تو گئے لیکن دل صاف نہیں ہوا۔

لیکن سکینہ جیسے جیسے بڑی ہوتی گئی اس کی بھولی بھالی ادائیں، اس کا مسکرانا، اب مجھے بھانے لگے۔ دھیرے دھیرے اس کی محبت میرے دل میں جاگزیں ہوتی گئی۔ جب اس نے پاؤں پاؤں چلنا سیکھا تو میں اسے چلایا کرتی تو وہ بہت خوش ہوتی۔ پھر جب اس نے بولنا سیکھا، سب سے پہلے آپی کہا۔ میری طرف اشارہ کر کے لوگ پوچھتے یہ کون ہے۔ وہ آپی کہہ کر ہنس پڑتی اور مارے خوشی کے جھوم جھوم جاتی۔ اس طرح ہماری دوستی کا آغاز ہوا اور بڑھتی عمر کے ساتھ ہم ایک دوسرے کے راز داں بن گئے۔

بمبئی سے ہمارے ایک ماموں آئے انہوں نے سکینہ کو بیٹری سے چلنے والا کتا دیا اور مجھے ٹیڈی بیئر۔ ہم دونوں اپنا اپنا تحفہ پا کر بہت خوش ہوئے مجھے بھالو سے ایسی انسیت ہوئی کہ وہ بستر میں بھی میرے ساتھ ہوتا۔ سکینہ اپنا کتا چلا کر سبھوں کو دکھاتی اور خوش ہوتی۔ کھیلتے کھیلتے کتے کا کوئی فنکشن مجھ سے خراب ہوگیا۔ اب اس نے حرکت کرنا بند کر دیا۔ گھر کے سارے لوگوں نے اسے صحیح کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔ سکینہ نے کہا آپی نے میرا کتا خراب کر دیا۔ وہ اس قدر ناراض ہوئی کہ بات چیت ہی بند کر دی۔ میری تو دنیا ویران ہوگئی۔ اسے منانے کے سو جتن کیے لیکن وہ نہیں مانی۔ ماں نے کہا ''زرینہ تو اسے چھوڑ دے خود ہی بولے گی۔'' میرے دکھ کو بابا ہی سمجھتے تھے

اورایک روز انہوں نے تانگہ منگوایا اور ہم دونوں بہنوں کو دلی کی سیر کو لے چلے لیکن تانگے پر بیٹھنے سے قبل سکینہ کے سامنے شرط رکھ دی کہ پہلے زرینہ سے دوستی کرو ورنہ تانگہ واپس کر دیا جائے گا۔ وہ کبھی بابا اور کبھی مجھے دیکھتی۔ پھر دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ میرے تو آنسو نکل گئے۔ اس کے بعد ساری زندگی ہم میں کوئی ناچاقی نہیں ہوئی۔ بڑھتی عمر کے ساتھ ہمارے تعلقات مستحکم ہوتے گئے۔ جب تمہارے والد نے پاکستان آنے کا فیصلہ کیا تو وہ بہت تڑپی۔ جدائی کے احساس نے اسے مضمحل کر دیا تھا۔ لیکن مجبوری تھی۔ سو صبر کیا۔ میرے پاکستان آنے کے بعد اس کی شادی ہوئی۔ ہمارے پیرا بھی جے نہیں تھے لہٰذا ہم شادی میں شریک نہ ہو سکے جس کا اسے قلق تھا۔ اب نہ جانے ملاقات پر ہم دونوں بہنوں کا کیا حال ہو۔''

ایک روز امی اور عامر روانہ ہو گئے۔ ان کا ویزا ایک ماہ کا تھا اور تین ماہ تک توسیع کی گنجائش تھی۔

ابتدائی ہفتے دس روز وہ لوگ دلی کی سیر کرتے رہے۔ عامر کی ضد پر اسے آگرہ لے جایا گیا۔ تاج محل دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ اس نے مجھے فون پر بتایا۔ کوئی عمارت اتنی حسین بھی ہو سکتی ہے۔ تصویر سے تو دس فیصد بھی ابلاغ نہیں ہوتا۔ اور اسے خاص چودھویں کے شب لے جایا گیا۔ عامر تو تاج محل دیکھ کر مسحور ہو گیا۔ امی نے ماموں جان کا خاص ذکر کیا کہ شاید انہیں بہن سے ملنے کی کوئی خوشی نہیں تھی جسے وہ چھپا نہیں پاتے تھے۔

وہ قیام پاکستان کے کٹر مخالف تھے لہٰذا پاکستان انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتا اور پاکستان کے خلاف زہر اگلنے سے ہرگز نہیں چوکتے۔ جبکہ خالہ جان اور خالو جان ہندوستان میں رہ کر پاکستان کے عاشق ہندو سیاست سے سخت نالاں۔

خالہ جان کا بس نہ چلے، وہ اپنی بہن کو آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیں ہر وقت کھانے پینے کا اہتمام۔ تحفے تحائف اور خالو جان ان کے ہم خیال وہ کہتے میں نے اپنی خوش دامن کو نہیں دیکھا تھا اب ان کی ہم شکل اپنی بڑی سالی کو دیکھ کر انہیں قرار آ گیا۔

عامر کی ان سے خوب بننے لگی۔ وہ بھی عامر کا خوب خیال رکھتے اور اسے ترغیب دیتے کہ پاکستان کی خدمت کرو یہ اسلام کا قلعہ ہے اس کا مضبوط اور توانا ہونا ضروری ہے۔ خالہ اور خالو جان نے ماموں جان سے درخواست کی کہ امی کو جائیداد کے حصے کے طور پر کچھ رقم ادا کی جائے، اب وہ صاحب حیثیت ہیں اور لاکھوں میں کھیل رہے ہیں۔ سیاسی اثر و رسوخ کی بنا پر مالی اعتبار سے مستحکم ہیں اور یہ ان کے لیے کوئی بڑی بات نہیں۔

لیکن ماموں جان کو یہ بات سخت ناگوار لگی۔ انہوں نے خالہ اور خالو جان کو ٹکا سا جواب دے دیا کہ وہ ہرگز ایسا نہیں کریں گے۔

والدہ کو پتا چلا تو انہوں نے بھائی کو وضاحت کر دی کہ سکینہ کی بات میں اس کی مرضی ہرگز شامل نہیں۔ وہ اپنے بال بچوں کے ساتھ پاکستان میں خوش ہیں۔ ناصر یعنی میں کوالیفائیڈ انجینئر ہوں۔ عامر بھی جلد بھائی کے نقش قدم پر چل نکلے گا۔

''باپ کی جائیداد میں اس کا حق ہے جس سے وہ کبھی دستبردار نہیں ہو گی تاہم یہ تمہارے صوابدید پر ہے۔ میں ہرگز اس مقصد کے لیے پاکستان سے نہیں آئی ہوں۔''

مہینہ ختم ہونے سے پہلے انھوں نے ویزے میں ایک ماہ کی توسیع کی درخواست دے دی جو مسترد کر دی گئی۔

خالہ اور خالو جان کو حیرت تھی کہ یہ صد فیصد منظور ہونی چاہیے تھی انہوں نے اپنے ذرائع استعمال کر کے سبب دریافت کر لیا کہ

خاندان کے کسی فرد نے حکام بالا کو مطلع کیا کہ عامر رضوی نوجوان کے خیالات ہندوستان مخالف ہیں اور اس سے نقص امن کا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔

امی کو یہ جان کر شدید دکھ ہوا کہ وہ ماموں جان کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

خالہ جان سب سے زیادہ دکھی تھیں کہ وہ سمجھ رہی تھیں کہ اس کی بہن ابھی مزید دو ماہ رکیں گی اور جدائی سر پر آ گئی۔

عامر کہتا ہے کہ دونوں بہنوں کا بچھڑنا سب کو رلا گیا۔

◆◆◆

ماہنامہ ''تخلیق'' ـــــ ایک قدم اور آگے

دوستوں، کرم فرماؤں اور تارکینِ وطن ادیبوں کے ارشادات کی روشنی میں

تخلیق اشاعت گھر

قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے

- کتاب کی فروخت کا انتظام ملک کے ممتاز کتب فروش اداروں کے ذریعے کیا جائے گا۔
- ہر کتاب ملکی اور بین الاقوامی اخبارات و رسائل کے لیے ارسال کی جائے گی۔

''تخلیق اشاعت گھر'' باہمی معاونت کے اصولوں پر کام کرے گا اور مصنف کا اعتماد ہر صورت میں قائم رکھا جائے گا۔ اس ادارے کا بنیادی مقصد اظہر جاوید مرحوم کے اشاعتی نصب العین کی توسیع ہے، اُردو ادب کی ترقی اور مصنفین کا وسیع پیمانے پر تعارف ہے۔

اپنا مسودہ بھیجئے......رابطہ قائم کیجئے

سونان اظہر جاوید......جنرل منیجر ''تخلیق اشاعت گھر''

E-67.A-1, St # 3, Near Defence Chowk, Police Chowki, Super Town, Lahore-Cantt.

فون نمبرز: 04236626008-04236671007......موبائیل فون:03218899007

ای میل:ajavedtakhleeq@yahoo.com......ajavedtakhleeq@gmail.com

شام کا تارا

پنجابی تحریر: اظہر جاوید

ترجمہ : حنیف باوا

عمران خان کی شادی کی خبر پڑھی تو مجھے کچھ جھٹکا سا لگا۔ یہ بات نہیں تھی کہ میرا جمائمہ کے ساتھ کوئی عشق تھا۔ مجھے تو اس عفیفہ کے نام کے کے ہجے تک معلوم نہیں تھے۔ یہ بھی ولایت سے آتی ہوئی ایک حسینہ نے بتائے ہیں۔ عمران خان میرا بھی ہیرو تھا۔ کرکٹ کے حوالے سے اس نے ان ہونی کو ہونی کر دکھایا تھا۔ اسی لئے وہ مجھے اچھا لگتا تھا۔ اُسے پسند کرنے کی ایک اندرونی بات اور بھی تھی۔ جب بھی اُس کے نام کے ساتھ کسی لڑکی کا نام لیا جاتا۔ یا یہ پتا چلتا کہ وہ آج کل فلاں امیر زادی کو ساتھ لئے پھرتا ہے تو دل کے اندر ایک مزے دار سی کھد بد ہوتی......ایسے جیسے کسی نے یہ کہہ دیا ہو کہ وہ لڑکی میں نے ہی پھنسائی ہوتی ہے۔

یہ جھٹکا یادوں کا تھا۔ خبر پڑھتے ہی بیتے سمے کی متعدد باتیں، کتنی ہی کہانیاں یاد آ گئیں اور ثمینہ بھی اُس یاد کا حصہ تھی۔ بعض رشتے اور تعلقات بھی عجیب ہوتے ہیں۔ شام کے تارے کی مانند دل و دماغ کے امبر پر تھوڑی دیر کے لئے جگمگاتے ہیں اور پھر رات کے اندھیروں میں کہیں گم ہو جاتے ہیں۔ یہ رشتے جب استوار ہوتے ہیں تو ان کے لئے کوئی خاص تردد نہیں کرنا پڑتا۔ ایک دو ملاقاتوں کے اندر ہی ایسا لگنے لگتا ہے جیسے یہ آشنائی سالوں پر محیط ہو۔ اور جب ختم ہوتے ہیں تو یہ اپنے عقب میں نہ آنسو، نہ آہیں اور نہ ہی فریادیں چھوڑ کر جاتے ہیں۔ لیکن پھر بھی یہ رشتے ایک مہکتی ہوئی یاد کی طرح سدا زندگی کے ساتھ چمٹے رہتے ہیں۔

ثمینہ بھی ایک ایسی ہی یاد ہے۔ متعدد برس پہلے جب جمیلہ نے ریحانہ کے ساتھ مل کر، یا پھر یہ کہہ لیں کہ انہوں نے میرے اشتراک سے ایک سوسائٹی میگزین کا اجراء کیا تھا تو اُنہیں دوڑتے بھاگتے اور انتہائی مصروف اور بہت ہی خوبصورت دنوں میں ثمینہ سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بھی ہماری طرح شادی کے بندھن میں بندھی ہوئی تھی۔ سانولی سلونی سی، آنکھوں میں گہری اداسی لیکن لبوں پر ناچتی مسکراہٹ، لہجہ دھیما، بات کرنے کا انداز دل آویز اور سر سے پاؤں تک بھرپور جوان عورت......وہ کچھ لکھتی تو نہیں تھی لیکن پڑھنے کا شوق وافر اور ستھرا تھا وہ ریحانہ کی سہیلی تھی۔ میری جمیلہ اور ریحانہ سے بے تکلفانہ دوستی تھی۔ میں نے اپنی عادت کے مطابق دونوں کو اپنے عشق کا یقین دلا دیا تھا۔ ثمینہ کے ساتھ بھی میں نے ویسا ہی کیا۔ وہ سمجھدار اور سنجیدہ عورت تھی۔ اُس نے کسی بھی ردِعمل کو ظاہر نہ کیا جس سے مجھے پتا چلتا کہ اُس نے میری جسارت کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا یا پھر دل کے کسی کونے میں سنبھال کر رکھ لی ہو۔

کچھ ملاقاتوں اور ٹیلی فون کالز کے بعد ہمارا ذاتی تعلق بھی بن گیا۔ کبھی کبھار وہ کوئی ٹھوس بات بھی کر دیتی جس سے میری آس بندھ جاتی اور کبھی کبھی میں خود کو سمجھا بجھا کر واپس لوٹا لاتا۔ میں یہ بات مانتا ہوں کہ مجھ میں کوئی ایسی خوبی نہیں جو عورت بھر ما سکے۔ دل کش

باتیں کر لینا ہی سب کچھ نہیں ہوتا ثمینہ کہتی تھی۔

''آپ باتیں بہت خوبصورت کرتے ہیں۔ کچھ دیر کے لئے تمام دکھ اور سارے غم بھول جاتے ہیں۔ صدیوں کے بعد شہر میں ایک ٹیلی فون ملا ہے جہاں کال کر کے شام کی اداسی ٹالی جا سکتی ہے۔ دکھ بھلائے جا سکتے ہیں نیز اور بہت کچھ مل جاتا ہے، آپ کہاں رہے اتنا عرصہ......؟ پہلے کیوں نہیں مل گئے تھے......؟'' میں ہنس کر کہتا۔ ''آپ کو ہی تو ڈھونڈ رہا تھا......!'' ''وہ فوراً جواب دیتی...... پہنچی تو میں ہی ہوں آپ کے پاس، آپ تو نہیں آئے۔'' میں پھر کہتا...... ''میری دعائیں اور چاہتیں آپ کو کھینچ کر لائی ہیں۔''

اسی طرح سوہنے سوہنے محبتوں بھرے جملے اِدھر سے اُدھر آتے جاتے رہے۔ لیکن ہم دونوں میں سے کسی نے بھی عشق کا اظہار نہ کیا۔ لیکن یہ بات بھی نہیں۔ میں نے متعدد بار اظہار کیا لیکن وہ اپنی سجل ہنسی میں گم کر دیتی۔ اُسے شائد یہ خیال تھا کہ وہ ریحانہ کی سہیلی ہے اور پھر اس کا جمیلہ کے ساتھ بھی تعلق ہے۔ جب یہ تینوں آپس میں ملتی ہیں تو میرے بارے میں یہی رائے دیتیں کہ میری عادت ہی یہ ہے کہ میں سب لڑکیوں سے عشق کا اظہار کر دیتا ہوں...... جمیلہ اور ریحانہ اپنی اپنی جگہ مجھے اپنی ملکیت سمجھتی تھیں اور یہ نہیں چاہتی تھیں کہ مجھے کوئی اور چھین کر لے جائے۔

ثمینہ ان دونوں سے الگ تھی۔ نہ لاابالی پن، نہ بڑھ چڑھ کر باتیں کرنے کا شوق تھا اور نہ ہی اُسے اپنے جذبات اور تاثرات چھپانے کا ڈھنگ آتا تھا۔ یہی تھا جس سے میں اُس کی جانب آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ اس کا شوہر بھی ہمارے ملنے والا تھا۔ لیکن شوہر تو پھر شوہر ہی ہوتا ہے۔ ایک روز اُس نے فون پر مجھے بڑا ترش جواب دیا جس سے میں بڑا پشیمان اور شرمندہ ہوا۔ ثمینہ کو جب پتا چلا تو اس نے مجھ سے سو طرح سے معافی مانگی اور کمال یہ کیا کہ اپنے گھر والے سے بھی معافی منگوائی۔ ثمینہ نے کہا

''اُسے کیا حق ہے کہ وہ میرے معاملات میں دخل دے''

اس حادثے کے بعد میرے اور اُس کے مابین بے تکلفی میں تو اضافہ ہو گیا لیکن اُسے سمجھنے کی گرہ میں مزید الجھاؤ پیدا ہو گیا......

وہ مجھے اپنے گھر بلاتی، میرے من پسند کھانے کھلاتی۔ وی سی آر پر زینت امان کے کھلے ڈانس...... لیکن اُس وقت وہ کسی نہ کسی بہانے دوسرے کمرے میں چلی جاتی۔ دوسرے روز فون پر بات ہوتی تو کہتی۔ ''مجھے معلوم تھا کہ آپ کو زینت امان کے ایسے ہی ڈانس اور گانے پسند ہیں۔ میں نے خاص طور پر منگوائے تھے۔''

''لیکن آپ کیوں چلی گئی تھیں؟'' میں پوچھتا۔ وہ اُسی طرح کھنکتی ہوئی ہنسی سے کہتی۔ ''میری ضرورت کس لئے تھی''

پھر اچانک عمران خان کا واقعہ وقوع پذیر ہو گیا۔ اسے واقعہ ہی کہنا چاہیے۔ اُس نے ایک دن مجھے کہا...... ''عمران خان کی کچھ تصویریں درکار ہیں''

میں نے کہا۔ ''وہ روز چھپتی ہیں''۔

کہنے لگی...... ''نہیں...... میں تو اُسے کبھی ملی بھی نہیں۔ میں اُس کی پرستار ہوں۔ وہ مجھے اچھا لگتا ہے''۔

یہ تو معمولی بات تھی لیکن اُس نے اسے دو تین بار دوہرایا۔ زور دیا اور اُسے یاد کروایا۔ میں نے چند فوٹو گرافروں کو کہا اور بہت ساری تصویریں اکٹھی ہو گئیں۔ میں نے وہ روا روی میں اُسے دے دی۔

شائد یہ ستاروں کی گردش ہوتی ہے۔ تقدیر کا چکر یا کوئی بات کبھی کبھار سبھی کچھ الٹ پلٹ ہونے لگتا ہے۔ ایک کے بعد دوسرا

حادثہ انہونی باتیں...... پہلے میرے اور جمیلہ کے مابین جھگڑا ہوا اور ہم نے الگ ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ پھر کسی بات پر ریحانہ اور ثمینہ ایک دوسرے سے غصے ہوگئیں۔ میرا دفتر کیا ٹوٹا میں تو جیسے اُجڑ ہی گیا...... چند ماہ اسی طرح گزر گئے میں نے اُسے ڈھونڈا......فون کیا۔ اچھی طرح سے گفتگو کی لیکن میں نے محسوس کیا کہ پہلے والی بات نہیں تھی۔ میں نے اس جانب اشارہ بھی کیا لیکن وہ خوبصورتی سے ٹال گئی۔ دوسری بار فون کیا یا نہیں، یہ یاد نہیں۔ ایک روز میں اُسے ملنے چلا گیا۔ وہ بالکل اُسی طرح سے تھی......

آنکھوں میں گہری اداسی اور لبوں پر سجل مسکراہٹ۔

''کیا حال ہے؟ ایک دوسرے سے عرصے کے بعد ملنے پر بات شروع کرنے کے لئے اسی طرح کے بے معنی جملے ہی بولنے پڑتے ہیں...... میں نے بڑا گھمبیر سا ہو کر اُسے پرانے تعلقات کی دنیا میں لانے کی کوشش کی۔ اُس نے شائد زندگی میں پہلی مرتبہ میری جانب نظر بھر کر دیکھا اور اچانک سوالیا انداز میں مجھ سے کہنے لگی۔

''میں نے آپ سے متعدد بار عمران خان کی تصویریں مانگی تھیں'......

''ہاں......تو پھر کیا ہوا؟'' میں عجیب گھبرائے ہوئے اور نہ سمجھنے والے انداز میں ٹوٹا پھوٹا سا جواب دیا۔

''آپ بڑے شاعر، ایڈیٹر اور سیانے بنے پھرتے ہیں'۔ اُس کے لہجے میں طنز، غصہ اور ملال سا نمایاں تھا۔ کیا مجھے عمران خان کی تصویریں اور کہیں سے نہیں مل سکتی تھی بھلا؟'' میں ابھی تک بے وقوفوں کی طرح پریشان سا ہو کر اس کی اور تکے جا رہا تھا۔ اُس نے میرے چہرے پر لکھی حماقت کو پڑھ لیا تھا اور ذرا سا مسکرا کر کہنے لگی۔ ''میں تو ویسے ہی آپ کے اندر جیلسی پیدا کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ آپ کا میرے ساتھ تعلق کتنا ہے۔ افسوس......آپ کو سمجھ نہیں آتی......یا......پھر آپ کو میری ضرورت ہی نہیں تھی۔''

یہ کہتے ہوئے اُس کی آواز کچھ بھر آئی۔ گہری اداس آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ وہ اٹھی کمرے کی باہر کی جانب کھلنے والی کھڑکی کی جانب منہ کیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ میں نے اُس کا ہاتھ دوپٹے کے پلو پر بھر آنکھوں کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔ میں چند لمحوں کے لئے گُم صُم اور ہونقوں کی طرح بیٹھا رہا۔ پھر اٹھا، اُس کے پاس جا کر پیچھے سے اُس کے کاندھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا

''مجھے معاف کردو......''

''کیا معاف کروں، اور کس بات کی معافی۔ اب تو بات ہی ختم ہوگئی ہے''۔ اُس نے یہ بات کرتے ہوئے میری طرف مڑ کر دیکھا۔ اُس کی بڑی مانوس اور باتیں کرتی ہوئی نظروں میں مجھے پہلی بار اجنبیت اور بیگانگی سی محسوس ہوئی۔ میں حیرانگی اور شرمساری سے سر جھکا کر اسے خدا حافظ کہتے ہوئے وہاں سے چلا آیا۔

فاصلے بڑھتے گئے......اور ہم دونوں دنیا کی بھیڑ میں گم ہوگئے۔ نہ اُس نے مجھے ڈھونڈنے کی کوشش کی اور نہ ہی میرا زندگی کے کسی موڑ پر اُس کا سامنا ہوا۔ ایسے لگتا ہے۔ کچھ لوگ شام کے تارے کی طرح رشتوں کے امبر پر پل بھر کے لئے دمکتے ہیں۔ عمران خان کی شادی کی خبر پڑھی ہے اور ایک جھٹکے کے ساتھ پرانی یادوں کی فلم چل پڑتی ہے۔ ثمینہ بے اختیار اور بے سبب یاد آ رہی ہے۔ نہ شائد اُس کی سوچوں اور خیالوں کے آسمان پر میری یاد بھی شام کے تارے کی طرح چمکی ہے یا نہیں؟ عمران خان کی شادی کی خبر پڑھ کر اُس کا کیا حال ہوا ہوگا۔ کون بتائے؟

◆◆◆

ممتاز شاعر، نقاد اور مترجم لطیف قریشی کی کتب

MULTI MEDIA AFFAIRS

21-Nand Street, Sham Nagar, Chowburji,
Lahore-54505, Pakistan. Tel: (92-042) 37356454
Mobile: 0333-4222998, 0322-4222998
E-Mail: multimediaaffairs@gmail.com
multimediaaffair@hotmail.com

RARE BOOKSHOP

دکانچہ نادر کتب

42-B Lower Mall Road, Lahore.
Tel: 042-37246110

سیّد مشکور حسین یادؔ

O

ہم ہیں اپنے خیال میں غلطاں
ہر طرح کے کمال میں غلطاں

اور زمانہ نکل گیا آگے
ہم رہے عرضِ حال میں غلطاں

ایک ہنگامہ ہو گیا برپا
ہم نہ بولے سوال میں غلطاں

وہ ہمیں سمجھے ہم نہیں ہیں یہاں
ہم رہے قیل و قال میں غلطاں

جب ہمیں خال خال آیا نظر
ہم ہوئے خال خال میں غلطاں

آج تک ہم نہیں ہوئے واپس
واپسی کے خیال میں غلطاں

پیار سے دیکھتی رہی ہم کو
جان اپنے جمال میں غلطاں

OOO

حسن عسکری کاظمی

مکالماتی غزل

میں نے کہا، کہ تو مری دھرتی کا پھول ہے
اس نے کہا، بجا ہے مگر دل ملول ہے
میں نے کہا، کہ زُلف طرح دار کیا ہوئی؟
اس نے کہا، کہ سر پہ حوادث کی دھول ہے
میں نے کہا، زمانہ مخالف ہے کس لئے
اس نے کہا، یہ بات ہی کرنی فضول ہے
میں نے کہا، لکھاری کا لکھا ہے بے اثر
اس نے کہا، کہ ہر جگہ اس کا دخول ہے
میں نے کہا، فرنگ بھی جائے اماں نہیں
اس نے کہا، یہ قہر خدا کا نزول ہے
میں نے کہا، کہ دشمن جاں کے قدم ہی لوں
اس نے کہا، غلط، یہ کہاں کا اصول ہے
میں نے کہا، کہ خوب ترا حرفِ حق بجا
اس نے کہا، کہ دل سے تجھے بھی قبول ہے
میں نے کہا، حقیقتِ عشق بتاں ہے کیا
اس نے کہا، کہ یہ دلِ ناداں کی بھول ہے
میں نے کہا، کہ خواب ہے یہ کائناتِ غم
اس نے کہا، کہ اس میں عرض ہے نہ طول ہے
میں نے کہا، کہ دور ہے منزل سے کارواں
اس نے کہا، کہ رہبر کامل رسولؐ ہے

OOO

کنول فیروز

O

تھا اُسے انکار بھی اقرار بھی
اُس کو گھر جانے پہ تھا اصرار بھی

دل میں اُس کے تھے مقاصد اور کچھ
جو بظاہر کر رہا تھا پیار بھی

کچھ تو مَیں بھی چلتے چلتے تھک گیا
راستے میں آ گئی دیوار بھی

کچھ تو مجھ میں بھی وہ اب شکتی نہیں
کچھ گریزاں ہو گئے سرکار بھی

ہم نے کوئے یار بھی چھوڑا نہیں
سامنے رکھے صلیب و دار بھی

تشنگی میں تھی عبادت کی طلب
معبدوں میں آ گئے مے خوار بھی

شوق کے عالم میں تھے جو بے قرار
ہم نے دیکھا ہے اُنہیں بے زار بھی

اُس نے پھر پا کر مجھے پھر کھو دیا
جیت بھی اُسی کی ہوئی اور ہار بھی

دل ہی دل میں چاہتے رہنا بھی خوب
ہے محبت طالبِ اظہار بھی

ہم سفر کوئی ہو زادِ رہ مگر
ساتھ رکھ تُو اپنے یادِ یار بھی

تُو مسیحا ہے شِفا دینے کو آ
منتظر ہے یہ دلِ بیمار بھی

کتنے پانی میں ہے تُو معلوم ہے
سامنے ہے اب ترا کردار بھی

ہر کسی کو اپنی اپنی ہے پڑی
اب نہیں ملتا کوئی غم خوار بھی

تُو ہے عیاری میں ایسا پختہ کار
کھا گیا دھوکا دلِ بیدار بھی

مَیں سمجھ سکتا بھلا کیسے تجھے
ساتھ ہیں تیرے بہت مکّار بھی

یاد آ جاتا ہے دن میں بار بار
بھولنا چاہوں جسے سو بار بھی

امن کا دعویٰ جو کرتے تھے کنولؔ
آج ہیں وہ برسرِ پیکار بھی

OOO

گلزار بخاری

O

دعا نہ دے نئی پوشاک پر توّجہ کی
یہ رُت ہے پیرہنِ خاک پر توّجہ کی

رہا یہ خواب ترے عہد میں کہ دیکھ سکیں
کسی نے دیدۂ نمناک پر توّجہ کی

گنوا دیے کئی نخچیر تو نے غفلت سے
بھلائی رسم ہی فتراک پر توّجہ کی

ذرا سی دیر میں اکسیر کر دیا اس کو
نگاہِ عشق نے جب خاک پر توّجہ کی

ہوس نے مردہ ضمیروں میں جا ٹھکانہ کیا
محبتوں نے دلِ پاک پر توّجہ کی

پھر اس چراغ کدے کا نصیب چمکے گا
اگر نجوم نے افلاک پر توّجہ کی

جگہ ملی نہیں گلزارؔ بزمِ گُل میں تجھے
سزا ہے یہ خس و خاشاک پر توّجہ کی

OOO

نثار ترابی

O

یہی وفا کا یہی رنگ و بو کا حاصل ہے
کہ تیرا غم ہی مری آرزو کا حاصل ہے

یہ کہہ رہی ہے بہاروں سے کھلتی خوشبو
کہ فصلِ گل بھی صبا کی نمو کا حاصل ہے

گئی رُتوں کے مسافر تجھے خبر ہے کہ تو
مری تلاش مری جستجو کا حاصل ہے

جو اَن سنی ہے تری داستاں کا حصّہ ہے
جو ان کہی ہے تری گفتگو کا حاصل ہے

وہ ایک لمحۂ جاں سوز جو نہیں گزرا
انا کی زد میں بجھی آبرو کا حاصل ہے

OOO

حفیظ انجم نگری (انڈیا)

O

دل موہ لینے والی ہے چمکیلی اوڑھنی
وہ آ رہے ہیں اوڑھ کے تمثیلی اوڑھنی

یوں لگ رہا ہے آسماں اُترا زمین پر
اوڑھے ہوئے ہیں آج صنم نیلی اوڑھنی!!

سونا بدن ہے چاندی کی بالی ہے کان میں
اِترا رہے ہیں اوڑھ کے وہ پیلی اوڑھنی

بارش کی بوند بوند شرارت پہ ہے تلی
بھیگے لباس پر ہے سجی گیلی اوڑھنی

کہرہ ہے برف باری دھندلکوں کا ہے سفر
کیا خوب ہے یہ دیکھئے برفیلی اوڑھنی

شرم و حیا کی دیوی ہے کھلتی ہوئی کلی!!
سر پر وہ اوڑھے آئی ہے شرمیلی اوڑھنی

تتلی کہوں میں یا اسے قوسِ قزح کہوں
شانوں پہ ڈالے آئی ہے چمکیلی اوڑھنی

ریشم کی کیا بساط ہے ململ کے سامنے
ریشم سے بھی حسین تو ہے سی لی اوڑھنی

انجم ہمارے ہوش کے طوطے ہوا ہوئے
اب کیا بتائیں کیا تھی وہ بھڑکیلی اوڑھنی

OOO

اکرام تبسّم

O

دھوپ ہی دھوپ ہے، سایہ دے دے
کچھ نہیں ہے تو غم اپنا دے دے

ڈوبنے کے لیے دل کافی ہے
دل سمندر سے بھی گہرا دے دے

زندگی اپنی سجا دوں جس میں
قرب کا اپنے وہ لمحہ دے دے

خرچ کرنی ہے محبت تیری
جس قدر ہے مرا حصّہ، دے دے

جو فقط تیری طرف کھلتا ہو
روح کو ایسا دریچہ دے دے

اپنی آنکھوں سے کروں گا سجدے
اپنے قدموں کا مصّلیٰ دے دے

OOO

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال

O

کیا عجب شخص تھا، کیا ہوا، کیا ہوا؟
چاند سا پھول سا، کیا ہوا؟ کیا ہوا؟
شور ہر سو بپا روشنی روشنی
اک جہاں بجھ گیا، کیا ہوا، کیا ہوا؟
کوئی منزل نہیں کوئی راہبر نہیں
کھو گیا راستہ، کیا ہوا، کیا ہوا؟
تیری مخلوق پہ جھوٹ کا راج ہے
میرے سچے خدا، کیا ہوا، کیا ہوا؟
ہر گھڑی دل نشیں خواب آنے لگے
سو گیا جاگتا، کیا ہوا، کیا ہوا؟
کس طرح دل لگی دردِ دل بن گئی
سوچتا ہوں سدا، کیا ہوا، کیا ہوا؟
دیپ جلتے بھی ہیں دیپ بجھتے بھی ہیں
آسماں بجھ گیا، کیا ہوا، کیا ہوا؟
کیا زمیں پھٹ گئی وحشتِ وقت سے
آسماں شق ہوا کیا ہوا، کیا ہوا؟
پیار کے کھیل میں مَیں اکیلا نہیں
اپنا سب کچھ لٹا، کیا ہوا، کیا ہوا؟

OOO

وِشال کھلّر (انڈیا)

O

حادثہ اک حادثوں کے درمیاں ہوتا ہوا
وقت کی دہلیز پر میں رایئگاں ہوتا ہوا

میں زمینوں پر زمانوں میں فقط چلتا چلوں
میرے سر میں آسماں ہی آسماں ہوتا ہوا

جس میں سارے راز پنہاں، جس میں پنہاں کائنات
دھوپ کی پہلی کرن میں وہ عیاں ہوتا ہوا

ایک منظر، ایک لمحہ، ایک چہرہ، ایک روپ
عمرِ رفتہ کے اشاروں پر دُھواں ہوتا ہوا

یوں کہ رُخ پر دھوپ سی کھلتی ہوئی آشام کی
جسم اندر بارشوں کا سائباں ہوتا ہوا

لوچ میں تیرا تصوّر، ذہن میں تیرا خیال
ایک پودا، ایک بچّہ سا جواں ہوتا ہوا

تو کہے تو شعر لکھوں، تو کہے تو خامشی
میں تجھے سنتا ہوا اور تو بیاں ہوتا ہوا

دردِ دل کی آرزو یہ دھڑکنوں کا شور سا
کاروانِ شوق کُھلّر حسبِ جاں ہوتا ہوا

OOO

شفیع ہمدم

O

ان سے تجدیدِ دوستی کی ہے
دل کی بستی میں روشنی کی ہے

عشق کا وہ عذاب کیا جانے
محتسب نے تو دل لگی کی ہے

میں نے جھانکا ہے ان کی آنکھوں میں
آپ کہتے ہیں مے کشی کی ہے

ہم پہ احسان ہے یہ جگنو کا
گھپ اندھیرے میں روشنی کی ہے

زخم رستے ہوئے کیے تسطیر
لوگ کہتے ہیں شاعری کی ہے

بات کہہ کر مُکر گیا ہمدؔم
بات اس نے ابھی ابھی کی ہے

OOO

طاہر شیرازی

O

یوں ہوا اللہ پھر میری مدد کرنے لگا
میں بلا کی پیاس میں پانی کو رد کرنے لگا

یہ کوئی بے چہرگی یا بدگمانی ہے کہ آج
آئینہ ہر عکس کو بے خال و خد کرنے لگا

میرے ہونے کے ہر اک امکان کو رد کر دیا
ایک دن میرا تخیل بھی تو حد کرنے لگا

بے یقینی سی کچھ اتنی ہے، ترے امکان کو
ایک لمحے کے لیے میں مسترد کرنے لگا

چار سو پھیلی ہوئی تاریکیوں میں پھر مجھے
روشنی کے واسطے وہ نامزد کرنے لگا

ایک دن اثبات کے اک مرحلے پر آ کے میں
قابلِ تفریق شے کو بے عدد کرنے لگا

خاک کی نسبت سے میں جو لائقِ سجدہ ہوا
تھا فلک زادہ کوئی مجھ سے حسد کرنے لگا

OOO

شاہین زیدی

O

چار سو مایوسیوں کے ابر ہیں چھائے ہوئے
چاند تارے ہیں مرے آنگن میں شرمائے ہوئے

حال کی جانب مرے ماضی کو بھی ہے لوٹنا
ہوں اسی اُمید پر اس دل کو بہلائے ہوئے

دوسروں کے واسطے ہو تم سراپا التفات
تم فقط میرے لیے ہو دِل کو پتھرائے ہوئے

مَیں ہمیشہ چاہتی ہوں، دُکھ تمہارا بانٹنا
کیوں مرے محبوب ہو تم آج گھبرائے ہوئے

کیا خبر تجھ کو، مجھے درپیش ہیں مجبوریاں
میرے دامن میں پڑے ہیں، پھول مرجھائے ہوئے

بھول جانا تم مری ساری وفاؤں کو، مگر
یاد رکھنا تم فقط اپنے، ستم ڈھائے ہوئے

موت کی صورت مجھے لگتی ہے اُن کی زندگی
جی رہے ہیں، کس طرح، یہ لوگ ٹھکرائے ہوئے

OOO

گلفام نقوی

O

دیارِ جاں میں کبھی آ اُتار کر آنکھیں
اِدھر بھی دیکھ ذرا مجھ سے چار کر آنکھیں

کہاں کہاں ہے تو اے محوِ آئینہ داری
جو تیری سمت لگی ہیں شمار کر آنکھیں

تیری تلاش کا یہ بھی سفر اُدھورا رہا
اُفق کے پار سے لوٹی ہوں ہار کر آنکھیں

تیرے جمال کی حِدّت عجیب حِدّت تھی
میں جیسے آگ سے لائی گزار کر آنکھیں

خیالِ یار کبھی دِل کی رہگزر سے گزر
وصالِ یار کبھی گُل بہار کر آنکھیں

OOO

اسلم سحاب ہاشمی

O

شب کے زنداں میں چاند کا روزن
چہرہ امکاں کا ہو گیا روشن

رکھ لے آنکھوں میں خواب منزل کے
ہٹ بھی جائے گی دھند کی چلمن

چھنتی جاتی ہیں گٹھڑیاں سب کی
دیکھو ہم میں کوئی تو ہے رہ زن

سوکھے دریا، تو بانجھ ہونے لگے
میرے دہقاں کے کھیت اور خرمن

جس کو سردار چُن لیا ہم نے
وہ قبیلے کا ہو گیا دشمن

ہم ہیں دوزخ کے سانس کی زَد میں
گرمیوں کا سحاؔب ہے جوبن

OOO

سعید باقر رضاؔ

O

شہر میں لائقِ دشنام نہیں ہے کوئی
ہم ہیں، اور موردِ الزام نہیں ہے کوئی
جانے پہچانے بھی پہچانے نہیں جاتے ہیں
ان دنوں ہم سے انہیں کام نہیں ہے کوئی
چاہنے والوں کے ہیں حُسنِ نظر سے جلوے
ورنہ مہتاب لبِ بام نہیں ہے کوئی
صحنِ گلشن میں تہی دست صبا جاتی ہے
ہاتھ میں نامہ و پیغام نہیں ہے کوئی
کوچۂ یار میں کس کس کو بتائیں جا کر!
یوں ہی آ جاتے ہیں اور کام نہیں ہے کوئی
صبح بے لطف نہیں آپ کی ہم راہی ہیں
اور بے کیف کہیں شام نہیں ہے کوئی
آئینہ خانۂ ہستی میں ہے اک ذات کا عکس
اب یہاں پر صنم اصنام نہیں ہے کوئی
اے وطن تیری محبت کی سزا کاٹتے ہیں
جبکہ ثابت ابھی الزام نہیں ہے کوئی
حسرتیں، خواہشیں، اُمیدیں، تمنائیں تھیں
دل کے بجھ جانے کا ہنگام نہیں ہے کوئی
آخری گھونٹ کہ ہو بزم کا انجام بخیر
ساقیا! دُردِ تہۂ جام نہیں ہے کوئی
وقت پروازِ تخیّل سے لرزتا ہے رضاؔ
اس قدر تیز سبک گام نہیں ہے کوئی

OOO

مسعود تنہاؔ

O

شیشۂ دل اُجال کر دیکھیں
ہم بھی کوئی کمال کر دیکھیں

جس کو رکھا عزیزِ جاں، اُس کو
آج دل سے نکال کر دیکھیں

کوئی کتنا ہے آپ سے مخلص
بوجھ کوئی تو ڈال کر دیکھیں

دُکھ سے شاید نجات مل جائے
آج اُن سے وصال کر دیکھیں

اُس پری وش سے آج برسوں بعد
رابطے پھر بحال کر دیکھیں

وہ سخی ہے تو اُس کی چوکھٹ پر
دلبری کا سوال کر دیکھیں

OOO

ابراہیم عدیلؔ

O

تری لگن مجھے کچھ ایسے موڑ دیتی ہے
جہاں انا بھی مرا ساتھ چھوڑ دیتی ہے

کوئی بناتا ہے شیشہ بڑے ہی پیار کے ساتھ
کوئی ہوس اُسے ملتے ہی توڑ دیتی ہے

ہوا جہاں بھی بجھائے تعلقات کی لو
وہاں کئی نئے رشتے بھی جوڑ دیتی ہے

غمِ زمانہ سے میں جنگ جیت لیتا ہوں
تری جدائی کلائی مروڑ دیتی ہے

فلک پہ آتا ہے سورج تو مسکراتا عدیلؔ
اُسے زمیں کی ضرورت نچوڑ دیتی ہے

OOO

اکبر مروّت

O

آغاز میں اچھے تھے نہ انجام میں بہتر
اس شہر سے تھے قریۂ گمنام میں بہتر

اک جام نہ سمٹے کبھی مے نوش کے ہاتھوں
دُنیا ہی سمٹ آئے کبھی جام میں بہتر

خوبی جو سناؤں تیری اوروں کو یہی ہے
تجھ سے نہیں برتر کوئی الزام میں بہتر

تفصیل نہ کہنا کبھی اے نامہ بر اُس سے
باتیں وہ سمجھتا ہے تو ابہام میں بہتر

یہ دل بھی عجب شے ہے کبھی کچھ تو کبھی کچھ
رنجیدہ ہے آرام میں کہرام میں بہتر

ہاں دل نہ لگے ہم سے وہ بے رُخ تو نہیں ہے
ہے ذوقِ تعلّق تیرے ہم نام میں بہتر

اپنی تو گزرتی ہے گزر جائے گی لیکن
ساتھی ملے تجھ کو تو ہر ہنگام میں بہتر

مروّت کو بنایا تو اُسی شوخ نے شاعر
کیا اس سے بھلا دے گا وہ انعام میں بہتر

OOO

وقاص عزیز

O

فضا کی ہتھیلی اچانک کھلے گی
مہک گم شدہ منظروں کی اُڑے گی

سفر دائرے سے نکل کر کیا ہے
یقیناً مجھے میری منزل ملے گی

مرے خواب کی پور میں ہے جو دھڑکن
نئی زندگی کی علامت بنے گی

کھلا ہے یہ دل روشنی کے سفر میں
مری سانس بھی اب چمکتی ملے گی

وقاص آنکھ سے کچھ دیے گر گئے ہیں
سو اطراف میں تیرگی تو بڑھے گی

OOO

قاسم خیالؔ

O

میں بے چینی کے عالم میں کہاں شب بھر رہا یارو
کہ مجھ پہ اک قیامت کا سماں شب بھر رہا یارو

کئی انمول سے موتی مری پلکوں سے بہہ نکلے
سمندر آنکھ سے غم کارواں شب بھر رہا یارو

مکیں تو چین سے سوتے رہے اندر سکوں کی نیند
ٹھٹھرتا بارشوں میں ہی مکاں شب بھر رہا یارو

ہمارے گھر کے آنگن میں بنے یہ نقش کہتے ہیں
کوئی ٹوٹے پروں والا یہاں شب بھر رہا یارو

وہاں روٹی پڑی ہی سوکھ جاتی ہے مگر قاسم
یہاں روٹی کی خاطر ہی فغاں شب بھر رہا یارو

OOO

یاسمین کنول

O

حال دل کا بیاں نہیں ہوتا
کچھ تو ہے جو عیاں نہیں ہوتا

بات ہم کو وہ سننا پڑتی ہے
جس کا وہم و گماں نہیں ہوتا

آؤ کچھ دیر اس جہاں میں چلیں
جہاں غم کا نشاں نہیں ہوتا

دل لگانا ہے ایسی آتش میں
جس کا ظاہر دھواں نہیں ہوتا

ہم سہاروں کو ڈھونڈتے ہیں کنولؔ
وقت جب مہرباں نہیں ہوتا

OOO

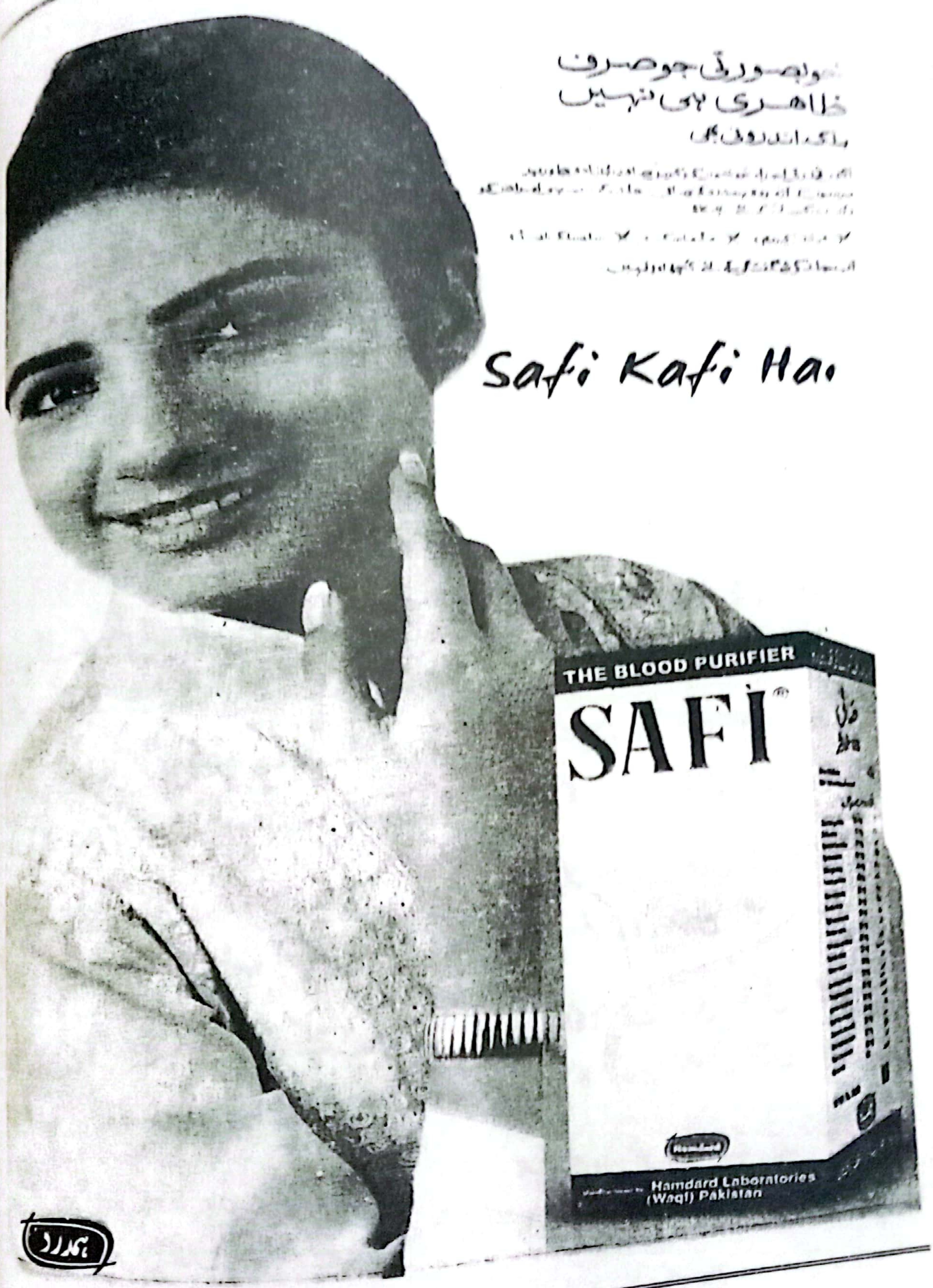
خوبصورتی جو صرف
ظاہری ہی نہیں
بلکہ اندرونی بھی
Safi Kafi Hai
THE BLOOD PURIFIER
SAFI
Hamdard Laboratories
(Waqf) Pakistan
ہمدرد

انشائیے

بھول جانا

سلیم آغا قزلباش

بھول جانا ایک فطری امر ہے۔ یہ ایک ایسی کیفیت ہے جس میں بڑے بڑے صوفی اور گیانی دھیانی تمام عمر ازسرتاپا ڈوبے رہے اور بعض ذرا پہنچے ہوئے بزرگ تو اپنے آپ کو بھول کر ایسی بستی میں داخل ہونے کا اجازت نامہ پانے میں کامیاب ہو گئے جہاں کوئی عاقل و بالغ بھول کر بھی جانا پسند نہیں کرتا۔ داستانِ آدم خا کی کو ذرا یاد کیجئے کہ اس تمثیل کا پہلا ایکٹ ہی آدم اور حوا کی رُومان پرور بھول سے شروع ہوتا ہے اور پردہ اٹھتے ہی دونوں بہشت کے اوپن ائیر سبزہ زار میں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے خوش گپیوں میں مصروف خراماں خراماں ٹہلتے ہوئے نظر آتے ہیں، اچانک عقبی دروازے سے ابلیس دبے پاؤں داخل ہوتا ہے۔ جب آنکھیں چار ہوتی ہیں تو ابلیس مسکراتا ہوا بے تکلفی سے دونوں کی جانب بڑھتا ہے اور اُن کے کان میں کچھ کھسر پھسر کرتا ہے، جس سے ان کے چہرے لحظہ بھر کے لیے متغیر ہو جاتے ہیں، مگر پھر دوسرے ہی پل اُن پر تجسّس اپنا رنگ جما لیتا ہے اور اس کے بعد وہ ایک ایسی بھول کر بیٹھتے ہیں جس کا نتیجہ زوالِ آدم کی داستان ہے۔ یہ ایک ایسی داستان ہے جس کا ہر نیا ایکٹ کسی نہ کسی موٹی تازی بھول سے شروع ہو کر قرنوں تک پھیلی ہوئی ایک مسلسل بھول میں ڈھلتا دکھائی دیتا ہے۔ یوں بھی بھول جانے کا مادہ انسانی سرشت کا جزوِ اعظم ہے۔ جب ہم کسی بات، حکم یا تجربے کو بھول جاتے ہیں تو درحقیقت اپنے اُس اجتماعی لاشعور کی کارکردگی کا کھلم کھلا مظاہرہ کر رہے ہوتے ہیں، جو روزِ ازل سے ہمارے کھاتے میں ڈال دیا گیا ہے اور جس کا کام اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ہماری بہت سی یادداشتوں کو فائل کر کے ہمیں ان کے بوجھ سے آزاد اور سبک بار کر دے۔

بھولنا ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ ایک پاگل شخص کا سارا کرب اس میں ہے کہ وہ کسی مخصوص حادثہ یا واقعہ سے خود کو اس طور پیوست کر لیتا ہے کہ پھر اُسے بھلا نہیں سکتا، جب کہ ایک نارمل شخص کا مقدر وہ تیرِ نیم کش ہے جو کبھی پار نہیں ہوتا، سو جب جلن ختم ہوتی ہے اور زخم مندمل ہو جاتا ہے تو وہ گزشتہ را صلوٰۃ کہہ کر آپ کی جانب دوستی و یگانگت کا ہاتھ بڑھاتا ہے تاکہ اپنے تجربات میں مزید عبرت آموز ابواب کا اضافہ کر سکے۔

دنیائے سائنس کی ساری حیرت انگیز ترقّی ایک بے ضرر سی بھول ہی کی مرہونِ منت ہے اور ایسا سننے میں کئی بار آیا ہے کہ محترم سائنسدان صاحب نے لیبارٹری میں تجربات کی الجھی لٹوں کو سنوارتے ہوئے کسی گیس کا سلنڈر یا بھانڈا کسی دوسری نامحرم گیس کے برتن میں رکھ دیا اور پھر بھول گئے۔ اگلے روز حسبِ عادت ناشتہ سے فارغ ہو کر اور بیگم سے تُو تُو مَیں مَیں، کے بعد سگار کے زوردار کش لگاتے ہوئے اور کسی مردہ زبان میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے وہ اپنی تجربہ گاہ میں داخل ہوئے اور بیوی کا غصہ دو چار سلنڈروں، نلکیوں اور بلّوریں بوتلوں وغیرہ پر نکالنا چاہا تو سامنے ایک اور ہی نقشہ پایا، باچھیں ممکنہ حدود تک کھل اٹھیں۔ پھر بے اختیار یوریکا! یوریکا! کا بلند بانگ نعرۂ مستانہ

بلند کیا اور عمر کے تقاضوں کو یکسر فراموش کر کے اپنی نئی نویلی دریافت کی خوشی میں ساری لیبارٹری کا ناچ ناچ کر چکر لگانے اور تالیاں پیٹنے لگے۔ بات یہیں تک رہتی تو خیریت تھی مگر پے درپے انہونی دریافتوں کے سبب انسان اور کمپیوٹر میں حجابات تیزی سے کم ہو رہے ہیں اور جو باقی ہیں محض "بھول جانے" کے وصف کی وجہ سے ہیں۔ مثلاً کمپیوٹر اور اولادِ آدم میں جو چند مہین حجابات حائل ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ کمپیوٹر کو جو کچھ گھول کر پلا دیا جائے وہ اسے حتیٰ المقدور نہیں بھلاتا اور یوں گوناں گوں معجونوں اور خمیروں کی دست برد سے بچ گیا ہے، جو بندۂ خدا کو بھول جانے کی پاداش میں آئے دن زہر مار کرنے پڑتے ہیں۔ تاہم اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ کسی چیز یا خیال کے بھول کر دوبارہ یاد آنے میں جو قندِ مکرر کا سا مزہ ملتا ہے وہ کمپیوٹر کے نصیب میں کہاں! ابھی پرسوں کی بات ہے کہ میں کچھ مسودات کی نوک پلک درست کرتے کرتے تھک گیا تو خود کو تازہ دم کرنے کے لیے قریبی ریستوران میں چلا گیا، گرم گرم چائے پی اور ایک عدد پان چبا کر اپنے مسکن میں لوٹ آیا، اب جو اپنے خیالات کو مجتمع کر کے دوبارہ لکھنے کا ارادہ کیا تو پتہ چلا کہ قلم ندارد، گھبرا کر قرینے سے پڑی کئی چیزوں کو الٹ پلٹ دیا۔ اس کے باوجود قلم ہاتھ نہ آیا تو گھبرا کر ضروریات اور تعیّشات کے زمرے میں آنے والی تمام اشیاء کو تہہ و بالا کرنا شروع کر دیا۔ اوّل اوّل صوفوں کے چپک دار کشن سر بسجود ہوئے، پھر جب بک شلف کی باری آئی تو پہلے ہی ہلّے میں مذہب اور سائنس کی کتب ایک دوسرے سے معانقہ کرتی چلی گئیں۔ دوسرے ہلّے میں "ماورا" اور "دستِ صبا" ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئیں۔ معاً فسانۂ آزاد قرولی لے کر علی پور کا ایلی پر جھپٹا اور توبۃ النصوح، یادوں کی بارات کو "چھیاں" دینے لگی۔ آخر آخر میں علم الانسان اور علم الحیوان کی کتابوں نے ایک دوسرے کا منہ کالا کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد بڑے حملے کا آغاز کیا۔ پردوں کے پیچھے، صوفوں کے نیچے، میز کی ظاہری و باطنی درازوں حتیٰ کہ ردّی کی ٹوکری اور اُگلدان تک کو اٹھا کر اس میں سے گوہرِ گم گشتہ کو تلاش کیا مگر صد حیف!

اس سارے معرکے کے بعد میری پیشانی پر شبنمی قطروں کی ایک لکیر سی کونجوں کی ڈار بن کر لرزنے لگی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کئی کونجیں ڈار سے بچھڑ کر فرش پر آن گریں۔ ایک گہرا سانس لے کر میں اپنی نشست پر بیٹھ گیا اور کمرے کی اُن تمام اشیاء پر نفرت بھری نگاہ دوڑائی جو میری تاتاری یلغار کے باعث بغداد کا نقشہ پیش کر رہی تھیں۔ اور پھر نامعلوم کیسے جھنجھلاہٹ کی سیاہی میں امید کے شہاب ثاقب کی ایک قوس سی نمودار ہوئی اور میری نگاہ اس کے عقب میں اسی رفتار سے دوڑتی ہوئی اپنے ہی گریبان تک جا پہنچی جہاں وہ قلم منہ چھپائے بیٹھا تھا۔ میں نے انگشتِ شہادت سے اسے سہلایا اور پھر سوچنے لگا کہ کچھ دیر پہلے کی بھول نے مجھے جسمانی طور پر متحرک کر کے دوبارہ یوں پُر سکون کر دیا ہے کہ میں تمام بوجھل جذبوں سے جان چھڑا کر تخلیق کی روح افزا کیفیت سے سرشار ہونے لگا ہوں۔ بھول جانے کے بغیر یہ جمالیاتی حظ، سیرابی کا یہ لذیذ احساس مجھے کیسے حاصل ہو سکتا تھا۔ جہاں تک شاعری کا قصہ ہے تو اس کا بنیادی جوہر ہی بھول جانے کی لذتِ نایاب میں ہے۔ شاعر کا محبوب بھول کر بھی وعدہ ایفا نہیں کرتا اور شاعر بیچارا خواب میں کیے گئے وعدے کو بھی نہیں بھول پاتا۔ چنانچہ اس بات میں شک کی گنجائش نہیں کہ جس شاعر کے محبوب میں بھول جانے کی جتنی استعداد ہو گی اُسی تناسب سے اس شاعر کا کلام بھی اعلیٰ و ارفع ہو گا، بصورتِ دیگر اس کی شاعری بہت جلد نذرِ نسیان ہو جائے گی۔ لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ بڑے ذہن کی نشانی یہ ہے کہ وہ اکثر بھول جاتا ہے تو اس میں رتّی بھر کھوٹ نہیں، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ سارا فلسفہ کسی بھولی ہوئی شے کی تلاش کا دوسرا نام ہے۔ اس کائنات کے عُقدے کو حل کرنے کے لیے جس اسمِ اعظم کی ضرورت ہے وہ انسان نے بھلا دیا ہے اور اب اس کو یاد کرنے کی کوشش میں اَن گنت فلسفے عالمِ نیست اور عالمِ ہست میں دھڑا دھڑ قطار اندر قطار اترتے ہی چلے آ رہے ہیں۔

انسانی فطرت بڑی بھولی بھالی ہے، وہ عموماً مصائب کی گرمی سردی کو جلد ہی بھول جاتی ہے اور اپنے لیے از سرِ نو عالم گیر جنگ کے سامان پیدا کرنا شروع کر دیتی ہے۔ وہ یہ سمجھتی ہے کہ آلاتِ حرب وضرب سے آخری فیصلہ کرلے گی، شاید یہی اس کی سب سے بڑی بھول ہے۔ دوسری طرف انسان اپنی ذات کی بھول بھلیوں میں سے سوجتن کر کے بھی نہیں نکل پایا اور اس کی ساری تگ ودَو اس چوتھی کھونٹ کی طرف جانے میں صرف ہوتی ہے جس کے آگے ایک خواب کی سی دنیا آباد ہے۔ وہ راہ میں حائل ہونے والی ہر رکاوٹ کو عبور کرتا، نئی نئی جادونگریوں اور پرستانوں کے خواب ناک طلسمات سے گزرتا منزل کی جانب رواں دواں بڑھتا ہی چلا گیا ہے۔ آج کا فن کار بھی دراصل اپنے لاشعور کی انہیں پُراسرار نگریوں میں خود کو بھلا دینے کا خواہاں ہے تاکہ وہاں سے تازہ افکار کی آبِ حیات، مضامینِ نو کی سنہری اُون اور آگہی کا امروسیا حاصل کر کے لوٹ آئے اور پھر ان سے اپنے اور اپنے سماج کی شبِ دیجور کو منوّر کر سکے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ پروفیسر صاحبان اکثر غیر حاضر دماغی کا ثبوت دیتے ہیں جو اصل میں بھول جانے کی طرف پہلے قدم کے مترادف ہے اور اسی میں ان کی پروفیسری کا راز نہاں ہے، کیونکہ ہر چیز کو حرف بہ حرف یاد رکھنا ایک خود ساختہ عذابِ عظیم ہے جس سے ہرا بھرا ذہن بھی دیکھتے ہی دیکھتے اجڑ کر بیابان بن جاتا ہے اور اس میں رٹے رٹائے، قاعدے، اصول وضابطے سائیں سائیں کرنے لگتے ہیں۔ طفلِ مکتب اکثر آموختہ بھول جاتا ہے، وجہ یہ ہے کہ وہ یاد رکھنے کی غیر فطری روش سے منحرف ہوتا ہے اور اس کے ہاں بھول جانے کا مادہ اپنی فطری سطح پر کارفرما ہوتا ہے۔ البتہ استاد اور اس کا ہم زاد مولا بخش اُسے سرزنش کرتا رہتا ہے، تاکہ وہ بھول جانے کی فطری معصومیت سے جلد از جلد دست کش ہو کر یاد رکھنے کی بھیڑ چال کو اپنا لے کیونکہ صرف ایسی صورت میں ہی وہ خود کو زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر سکتا ہے۔ عارفِ کامل نے ہمیشہ ''یاد رکھنے'' کے اس عمل کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھا ہے اور معرفت کے حصول کے لیے محض ایک لفظ پر خود کو مرتکز کر کے باقی سب کچھ بھلا دیا ہے۔ غالباً بچپن اور بڑھاپا اسی لیے معصومیت سے لبریز دکھائی دیتے ہیں کہ ان دونوں زمانوں میں یاد رکھنے کی مصیبت نہیں اٹھانا پڑتی، بلکہ دیکھا جائے تو عالمِ پیری دورِ طفولیت کی طرف مراجعت ہی کی ایک صورت ہے کیونکہ اس کے وارد ہوتے ہی انسان بہت سے خانگی اور بنیادی معاملات کو بھولنے لگتا ہے اور پھر ایک ایسی منزل پہ پہنچ جاتا ہے جہاں اس کے چہرے مُہرے سے بچوں ایسی احمقانہ حیرت مستقل طور پر ٹپکنے لگتی ہے اور وہ برس ہا برس پرانے حفظ کیے ہوئے قواعد وضوابط کے طوق وسلاسل اتار کر ذہنی، جسمانی ہر دو سطحوں پر یادداشت کے بوجھ سے یکسر آزاد ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ جو ہر بات یاد رکھتے ہیں اُن کے چہروں پر عیاری اور دنیاداری کی چھاپ صاف نظر آتی ہے، وہ ایک ایک قدم پھونک پھونک کر اٹھاتے ہیں اور اپنی سابقہ اور موجودہ دوستیوں دشمنیوں کو جمع تفریق کر کے اور اُن کے حاصل کو اپنے ذہن میں اچھی طرح محفوظ رکھ کر ہی کسی کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ لوگ جنہیں بھول جانے کی نعمت عطا ہوئی ہوا اکثر ہشاش بشاش نظر آئیں گے اور آپ کی گزشتہ بدسلوکی کے باوجود وہ آپ سے بغل گیر ہونے میں قطعاً ہچکچاہٹ محسوس نہیں کریں گے، ہچکچاہٹ تو اُسی صورت میں ہوسکتی ہے جب انہیں یاد رہا ہو کہ آپ کون ہیں اور پچھلی بار آپ نے اُن سے کیا سلوک کیا تھا!

◆◆◆

دن ڈھل چکا تھا، اور پرندہ سفر میں تھا ساراا لہو بدن کا رواں مشتِ پر میں تھا وزیر آغا

راز داں کیسے کیسے

نیر رانی شفق

انسانی احساسات و جذبات کی دنیا میں قلب و نظر کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔قلب یعنی ''دل'' انسانی جسم کی سلطنت کا نہ صرف دارالحکومت ہے (جو کہ وفاق کی علامت ہے) بلکہ ایسا حکمران بھی ہے جو اپنی پارلیمنٹ میں تمام قرار دادیں جذبات کے قرطاس پر سجا کر خود ہی پیش کرتا ہے اور خود ہی منظور کرتا ہے۔عقل و خرد حزبِ مخالف کی سیٹوں پر بیٹھ کر لاکھ واویلا مچاتے رہیں مگر دل پر رتی بھر بھی اثر نہیں ہوتا۔ بہت کم مواقع ایسے آتے ہیں جب دل عقل و خرد کے آگے ہارتا ہے مگر اس میں بھی مضبوط اعصاب کے مالک کی کارستانی شامل ہوتی ہے کہ وہ عقل کے آگے دل کی نہیں چلنے دیتا۔دل جو بند مٹھی کی شبیہہ لئے بظاہر خون کا بھرا ہوا لفافہ نظر آتا ہے مگر بہت اہم۔بقائے حیات کا ضامن و امین اور ہماری سانسوں کی ڈور توڑنے کا قصوروار بھی یہی دل ہے۔تمام احساسات کا تعلق دل کی نگری سے ہے۔دل کے ہزار قصے، لاکھوں کہانیاں، اس سے وابستہ کروڑوں باتیں اور اس میں چھپے بے شمار راز کبھی دل ناداں بنا، کبھی من کرچی ہوا۔کبھی دل بسمل بن جاتا ہے۔ اداس اور غمگین دل، ناراض دل، بجھا ہوا دل اور خوشی سے جھومتا گاتا دل ''محبوب ستائے تو'' دل کو جلانے والا'' یا ''دل کو ستانے والا'' ستم گر کہلاتا ہے۔

دل کو آئینہ خانے، صنم خانے اور آبگینے سے بھی تشبیہہ دی گئی ہے۔جبکہ ظالم انسان کو پتھر دل بھی کہا جاتا ہے۔دل تمام روحانی و جسمانی اور تمام حقیقی و مجازی احساسات و جذبات، نفرت اور محبت کا جادۂ خاموش ہے۔بظاہر خاموش مگر سب سے زیادہ شور اسی جگہ پایا جاتا ہے۔دل میں کتنے ہنگامے ہو جائیں۔دل لاکھوں بار چھناکے سے ٹوٹے۔دل عاشق اپنے محبوب کو دیکھ کر کتنی ہی ہائی جمپ اور لانگ جمپ لگالے یا دھڑ دھڑ کر کے سینے سے باہر آنے کو مچل اٹھے اور کتنا ہی شور کرے۔کسی کو بھی ان ہنگاموں کی اطلاع نہیں ملتی۔

ہر دل میں مختلف النوع راز پنہاں ہوتے ہیں۔دل ہمارا بہترین دم ساز و راز داں ہوتا ہے۔دل ایک ایسا گھر ہے جہاں نفرتوں اور محبتوں کو ہم مہمان بنا کر رکھتے ہیں۔اور خوب تواضع کرتے ہیں۔دل کے اندر ایک وسیع جہاں آباد ہوتا ہے اور ایسی بزم آرائی ہوتی ہے جو سطحی آنکھ اور عام انسان کی دید سے بالاتر ہوتی ہے۔یہ بصیرت کی باتیں ہیں جو دل سے دل تک سفر کرتی ہیں۔کہتے ہیں کہ دل خدا کا گھر ہے مگر لوگ اس کی پرواہ نہیں کرتے اور اس مقدس گھر کو روندنے اور توڑنے سے باز نہیں آتے۔جب کیوپڈ کا تیر چلتا ہے تو انسان بے اختیار اپنے محبوب کی چاہ میں بے تاب ہوتا ہے اور سینے میں بائیں طرف قیامت سی آجاتی ہے۔سوچنے کی بات ہے ایک ننھا سا دل اور کائنات کے تمام رشتوں اور جذبوں کا بوجھ مگر غم جاناں اور غم دوراں مل کر نازک دل پر جو ستم ڈھاتے ہیں وہ دل کی تباہی کا باعث بنتے ہیں۔اور بالآخر تمام رومانوی اور نازک احساسات کی راجدھانی کا بے تاج شہنشاہ یہ دل ڈاکٹروں کی چیرہ دستیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔

اسی طرح نظر یعنی بصارت کے سوتے آنکھوں سے پھوٹتے ہیں۔دل کی طرح آنکھیں بھی انسان کی اہم راز داں ہوتی ہیں۔ آنکھیں کائنات کی جلوہ آرائیوں کو دیکھنے،رنگوں اور روشنیوں سے لطف اندوز ہونے کا اہم ذریعہ۔لیکن آنکھیں کاشف ہوتی ہیں۔دل کے بالکل برعکس تمام راز اگل دیتی ہیں۔ادھر دل نے سات پردوں میں بات چھپائی اُدھر آنکھوں نے چُغل خوری کر ڈالی۔اگر کبھی ہم کسی سے نفرت کو دل میں جگہ دیں،دل تو بیچارہ چپ چاپ رہے گا مگر یہ آنکھیں ہمدردی اور تعاون میں پیش پیش فوراً نفرت کا اظہار کر دیں گی۔شکارِ ستم دل بے چارے پر ہزار ستم ٹوٹیں مگر وہ اس طرح چپ چاپ تڑپ کر رہ جائے گا کہ لاکھوں کے مجمعے میں بھی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکے گی۔مگر آنکھیں مچل کر فوراً اظہار کر دیں گی۔آنکھوں کے جام چھلک چھلک جائیں گے افسردہ و غمگین آنکھیں ساون بھادوں برسا دیں گی۔

آنکھوں کی دو قسمیں اہم ہیں۔چھوٹی آنکھ اور بڑی آنکھ۔چھوٹی آنکھ کبھی مار لو پتا ہی نہیں چلتا مگر بڑی آنکھ کا جھپکنا بھی قیامت بن جاتا ہے۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں چہرے کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہیں۔جھیل جیسی گہری آنکھوں میں نہ جانے کتنی سوہنیوں کے گھڑے تیرتے ہیں اور نہ جانے کتنے رانجھوں کے دل کی کشتیاں حسین آنکھوں کے چناب میں ڈوبتی ہیں۔ آنکھیں جو دیکھتی ہیں دل کے آئینہ پر اس کا عکس چھوڑ دیتی ہیں۔

دل کی طرح آنکھوں پر بھی دیوان کے دیوان لکھے گئے۔آنکھوں کو نت نئے خطابات سے نوازا گیا مثلاً نین کٹورے'اب اچھی بھلی آنکھوں کو کٹوروں سے ملا کر استعاروں میں اضافہ کرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔استعارات و تشبیہات کا جمِ غفیر ہے جن میں سے یہاں صرف چند تحریر کر رہی ہوں مثلاً نین کنول،ساگر جیسی آنکھیں،آنکھوں کے چراغ،سمندر جیسی گہری آنکھیں،جھیل سی آنکھیں وغیرہ۔

ان کے علاوہ بھی آنکھوں کی مندرجہ ذیل اقسام ہیں مثلاً کینہ پرور آنکھیں،حاسد آنکھیں،قاتل آنکھیں،شرابی آنکھیں،مکار آنکھیں،چیتے جیسی آنکھیں اور چیل جیسی آنکھ کچھ آنکھیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ جنہیں دیکھتے ہی بڑے دل گردے والا بھی ٹھنڈا پڑ جائے۔ آشوبِ چشم اور موتیا کی شکار آنکھیں تو امراض چشم کے مسیحاؤں کے ہاتھوں ہی بصارت سے بھرپور اور قابل دید ہو پاتی ہیں۔جبکہ یک چشم دجال کا تصور توبہ کی طرف راغب کرتا ہے۔جہاں یہ آنکھیں ہر طرح کے جذبات کا بھری بزم میں اظہار کر کے راز فاش کرتی ہیں۔اور دل میں چھپی باتوں کا بھانڈا اس طرح پھوڑتی ہیں جیسے سیر کی ہنڈیا چوراہے پہ پھوٹتی ہے وہاں بھیگی پلکوں والی متورم گلابی آنکھیں صنفِ مخالف کو مرغِ بسمل بھی بنا دیتی ہیں۔آنکھیں کسی بھی قسم کی ہوں جذبات واحساسات کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ان کا تعلق کسی بھی قسم کی فیملی سے ہو وہ چغل خور ضرور ہوتی ہیں۔مگر شاید یہ چغل خوری نہیں بلکہ بہادری ہے۔دل کی بات بآسانی آنکھوں سے امڈتے جذبوں کے ذریعے مدمقابل تک پہنچ جاتی ہے۔مشرقی خواتین کی شرمیلی آنکھیں محبوب تک حالِ دل پہنچانے میں بڑی مددگار ثابت ہوتی ہیں۔درحقیقت آنکھیں چھوٹی ہوں یا بڑی،جھیل جیسی ہوں یا سمندر جیسی گہری اور شربتی ہوں یا نیلی،آنکھوں کا اصل حسن شرم وحیا ہی میں مضمر ہے۔

اور اگر آنکھوں سے راز چھپانا مقصود ہو تو دل کو بھی راز داں نہیں بنانا چاہیے۔بقول شاعر

؎ نہ لکھ دل کے پردے پر راز کی باتیں　　　آنکھ کی کھڑکی کھلی ہے عکس باہر آ جائے گا

◆◆◆

اظہؔر تھا اس جہان میں "اک بے نوا فقیر"　　　اپنی خودی کا نقش دِکھا کر چلا گیا　(انور سدید)

خاکے

فلمی دنیا اور عزیز میرٹھی

علی سفیان آفاقی

عزیز میرٹھی بہت سینئر قلمی مصنّف تھے۔ جن دنوں ہم صحافت سے وابستہ تھے عزیز میرٹھی کئی فلمیں لکھ چکے تھے۔ ان کی تحریر کردہ سب سے کامیاب فلم ''سسّی'' تھی۔ اس فلم نے ہر جگہ کامیابی حاصل کی، یہاں تک کہ مشرقی پاکستان میں بھی کمائی کی، جس سے مغربی پاکستان کے فلم سازوں کو پہلی بار علم ہوا کہ مشرقی پاکستان اُردو فلموں کے لیے بھی کتنی بڑی مارکیٹ ہے۔ اس کے بعد مشرقی پاکستان کے سرکٹ سے بھی معقول ایم۔ جی ملنے لگی۔

عزیز میرٹھی کی سب سے بڑی خوبی ان کا حُسنِ کلام تھا۔ وہ جب کسی بھی موضوع پر گفتگو کرتے یا کوئی واقعہ بیان کرتے تو آواز کے اُتار چڑھاؤ اور صحیح جگہوں کو اُجاگر کر کے ایسا فسوں پھونک دیتے کہ سننے والا اس میں کھو کر رہ جاتا۔ عزیز میرٹھی ان چند کہانی نویسوں میں شامل تھے جو محض زورِ بیان سے سننے والوں، خصوصاً فلم سازوں اور ہدایت کاروں کو متاثر کر دیا کرتے تھے۔ لیکن سچ پوچھیے تو ان کی سنائی ہوئی کہانی میں جو گھن گرج اور کشش ہوتی تھی وہ ان کی لکھی ہوئی فلموں میں اس شدت سے نظر نہیں آتی تھی۔ اس میں قصوروار کون ہے؟ ہدایت کار یا فلم ساز جو مطلوبہ ضرورتیں پوری نہیں کرتا یا پھر خود سکرپٹ رائٹر، سکرین پلے کسی فلم کی جان ہوتے ہیں۔ اگر موضوع یا کہانی میں جان نہ ہو لیکن سکرین پلے بہت اچھا لکھا جائے تو اس کے باوجود فلمیں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ بدقسمتی سے سکرین پلے کے ہنر پر پاکستان میں کبھی توجہ نہیں دی گئی، نہ کوئی سکھانے والا، نہ تربیت دینے والا۔ یہاں کام افراد سے افراد کو منتقل ہوتا رہا ہے۔ ہدایت کار کے اسسٹنٹ اگر ذہین ہیں تو ہدایت کاری میں نام پیدا کر لیتے ہیں۔ عکاس کے ہونہار شاگرد اپنے استاد سے سیکھ کر مکمل کیمرہ مین بن جاتے ہیں۔ ہماری فلمی صنعت کے ہر شعبے میں سیکھنے سکھانے کا یہی طریقہ رہا ہے۔ آج 65 سال گزر جانے کے بعد بھی کوئی تربیتی معیاری ادارہ موجود نہیں ہے۔ ہماری حکومتوں کی اس صنعت پر کبھی نظرِ کرم نہیں رہی۔ مغرب زدہ بیوروکریسی اردو فلموں خصوصاً پاکستانی فلموں کو ہمیشہ حقارت کی نگاہ سے دیکھتی رہی۔

باقی کام تو سیکھے جا سکتے ہیں، لیکن سکرین پلے اور سنیاریو لکھنے کا ہنر کوئی استاد سبق کی طرح یاد نہیں کرا سکتا۔ اس لئے کہ اس کو سیکھنے کے لئے شوق، لگن، تخلیقی صلاحیت اور ذہانت کی ضرورت ہے۔ جنھوں نے اس میدان کو سر کر لیا وہ کامیاب کہلائے۔ پھر ہمارے ہاں ہمیشہ سے یہ دستور رہا ہے کہ ہدایت کار، سکرین پلے اور کہانی میں مستقل مداخلت کرتا رہتا ہے۔ کبھی جبر سے تو کبھی محبت سے، بہلا پھسلا کر اپنے مشورے فلم میں ٹھونستا رہتا ہے۔ ہم نے پاکستان کے بہت سے نامور اور کامیاب ہدایت کاروں کے ساتھ ان کی اس بات کی وجہ سے یا تو کام ہی نہیں کیا یا پھر ایک فلم کے بعد ہی بہتر تعلقات کے باوجود خوش اسلوبی سے ان کے ساتھ کام نہ کرنے کے فیصلے پر قائم رہے۔

ہم نے سکرین پلے بھی دیکھ کر سیکھا۔ ہالی وڈ اور انڈیا کی بہت اچھے ہدایت کاروں کی فلموں کو ہم بڑے غور سے دو یا تین بار بھی دیکھ لیتے اور پھر سوچتے کہ انہوں نے کہانی کو کس طرح آگے بڑھایا ہے۔ اس زمانے میں بہترین ہدایت کاروں کی فلمیں پاکستان میں ریلیز ہوا کرتی تھیں۔ آج کل کی سائنسی اور مار دھاڑ کی تیکنیکی طریقے سے بنائی جانے والی فلموں سے کوئی کیا سیکھے۔ ہم نے اس زمانے میں لاہور کے امریکن انفرمیشن سنٹر سے کتابیں اور مشہور ہدایت کاروں کی فلموں کے سکرپٹ لے کر پڑھے پھر ان کی بنائی ہوئی فلموں کو دوبارہ دیکھا اور موازنہ کیا۔ ہالی وڈ کے ہدایت کاروں کی کتابیں پڑھیں کہ انہوں نے فلاں فلم کیوں بنائی اور اس کو کس طرح اپنے سانچے میں ڈھالا۔ خوش قسمتی سے صحافی کی حیثیت سے اس دور کے نامور تحقیقات سے گھنٹوں ملاقاتیں رہتی تھیں اور ہم خاص طور پر یہ دیکھنے کے لیے سٹوڈیو جاتے تھے کہ وہ کہانی کو کیمرے کے ذریعے کیسے پیش کر رہے ہیں۔ پھر ہمیں ڈبلیو زیڈ احمد، شوکت حسین رضوی، سبطین فضلی اور سب سے بڑھ کر سعادت حسن منٹو سے اس بارے میں دریافت کرنے اور سیکھنے کا موقع ملا ڈبلیو زیڈ احمد ہندوستان میں بھی بہترین سکرین پلے لکھنے کی شہرت رکھتے تھے۔ انہوں نے کئی فلموں کے سینز کے حوالے دے کر ہمیں بتایا کہ ان میں ہدایت کار نے کس طرح روانی، حقیقت اور دل کشی پیدا کر دی۔

بہرحال، یہ ہمارا آج کا موضوع نہیں ہے۔ دراصل ہم عزیز میرٹھی صاحب کی یادوں کے حوالے سے کچھ کہنا چاہتے تھے۔ عزیز صاحب غالباً حافظے کی کمزوری کی بنا پر بہت سے ایسے واقعات تحریر کر گئے ہیں جن کے ہم بھی شاہد رہے ہیں۔ واقعات کے دھندلا جانے کے باعث ہی غالباً وہ واقعات اور حقائق میں مبالغہ آرائی بھی کر دیتے ہیں۔

''تخلیق'' کے جون کے شمارے میں ان کی یادیں پڑھ کر کچھ تکلیف سی ہوئی، انھوں نے ہدایت کار منور۔ ایچ۔ قاسم کے بارے میں اپنے تجربات کا تذکرہ کیا ہے۔ مضمون کے آغاز ہی میں پڑھنے والے کو یہ احساس ہو جاتا ہے کہ وہ انھیں پسند نہیں کرتے۔ پھر انھوں نے جس طرح ان کا تذکرہ صیغۂ واحد میں کیا ہے، مثلاً ''وہ بولا''، ''اس نے کہا''، ''آپے سے باہر ہو گیا'' وغیرہ۔ یہ بھی اچھا نہیں لگا۔ ایک ایسا شخص جو اعتراضات اور الزامات کا جواب دینے کے لیے دنیا میں موجود ہی نہیں ہے، اس کے بارے میں اس تحقیر آمیز انداز میں لکھنا اچھا نہیں لگا۔ منور ایچ۔ قاسم کی کوئی ایک بھی فلم کامیابی سے ہم کنار نہیں ہوئی مگر ناکام فلمیں تو بڑے بڑے ہدایت کاروں نے بنائی ہیں۔ خود عزیز میرٹھی صاحب کی لکھی ہوئی درجنوں سے بھی زیادہ فلموں میں سے کتنی کامیاب ہوئیں؟ محض فلم کا نہ چلنا کسی قلم کار یا ہدایت کار کی خرابی نہیں کہی جا سکتی۔ دلیپ کمار اور مینا کماری کی ''جوگن'' ضیاء سرحدی صاحب کی ''فٹ پاتھ'' اس کا ثبوت ہیں۔ یہ فلمیں فلاپ ہو گئیں مگر ہندوستان کے فلمی ذخیرے میں انھیں کلاسیکی فلموں کے خانے میں رکھا گیا ہے، تو ثابت ہوا کہ فلم کا چلنا یا نہ چلنا اس کے معیار پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ اس کی مثالوں سے ہالی وڈ، انڈیا اور پاکستان بھرا پڑا ہے۔

دوسرا مسئلہ انھوں نے یہ پیش کیا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے بیشتر اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات ناکامی سے ہم کنار ہوئے جبکہ محبوب اور شانتا رام جیسے ان پڑھ ہدایت کاروں نے نہایت معیاری اور کامیاب فلمیں بنائیں۔ جب ہم فلم سے وابستہ ہوئے تو یہی دلیل ہم نے بھی فلمی محفلوں میں سنی۔ دراصل فلم کی ہدایت کاری بھی شاعری یا افسانہ نگاری کی طرح خصوصی صلاحیتوں کی طلب گار ہوتی ہے۔ مذکورہ بالا دونوں حضرات ان پڑھ ہونے کی وجہ سے عروج پر نہیں پہنچے۔ یہ ان کی خداداد صلاحیتوں کا نتیجہ تھا۔ شاعروں ہی کو دیکھ لیجئے احسان دانش اور ساغر صدیقی قریب قریب غیر تعلیم یافتہ ہی تھے مگر ان کی ذہانت شوق اور سب سے بڑھ کر قدرتی صلاحیتوں نے انھیں بامِ عروج تک پہنچا

دیا۔احسان دانش جو پنجاب یونیورسٹی کی تعمیر کے وقت وہاں مزدوری کرتے تھے آج ان کی کتابیں اسی یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہیں۔ حفیظ جالندھری حساب میں کمزور تھے لہٰذا سات جماعتیں پاس کرنے کے بعد ہی بھاگ کھڑے ہوئے،اپنی ذہانت لگن اور سب سے بڑھ کر مطالعے کے باعث وہ اعلیٰ مقام تک پہنچے۔کیا تمام تعلیم یافتہ افراد نے شاعری یا فلمی ہدایت کاری میں وہ کامیابیاں حاصل کیں؟

ہندوستان میں تعلیم یافتہ لوگوں نے بہت اچھی فلمیں بنائیں، وہ ناکام ہوگئیں۔مگر آرٹ یا حقیقت پسندانہ فلمیں کہلائیں۔ پاکستان میں بھی ایسی مثالیں موجود ہیں۔کم پڑھے لوگوں نے بہت اچھی فلمیں بنائیں لیکن یہ کلیہ درست نہیں ہے کہ تعلیم یافتہ سب کے سب افراد ناکام رہے۔مسعود پرویز،اقبال شہزاد،راشد مختار،فرید احمد،نذر الاسلام اس کی چند مثالیں ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی ہنر کو سیکھنے کے لئے علم کے علاوہ ذہانت اور خداداد صلاحیت بھی لازمی ہے۔جنھوں نے ہدایت کاری اور سکرین پلے لکھنا ڈھنگ سے سیکھا ہی نہیں اور فلم بنانے کھڑے ہوگئے تو ظاہر ہے کہ ان کے مشاہدے،مطالعے اور علم میں کمی تھی۔احمد بشیر کی فلم فلاپ ہوگئی مگر بہت کامیاب اور معیاری فلم ہے۔اگر فلم بینوں کے ذوق اور ضرورت کو مدنظر رکھا ہوتا تو اس موضوع پر بنائی جانے والی فلم کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیتی ہے۔دراصل (کم از کم پاکستان میں) ہم نے یہ دیکھا کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ کم تعلیم یافتہ لوگوں کو حقیر سمجھتے ہیں جبکہ ان پڑھ یا کم پڑھے لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کو اناڑی سمجھتے ہیں جو کسی حد تک درست بھی ہے۔ہندوستان میں فلم سازی کا آغاز ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں نے کیا۔وہ اپنے ساتھ مغربی ہدایت کار اور دوسرے ہنرمند بھی لائے۔کسی ان پڑھ یا کم تعلیم یافتہ شخص نے برصغیر میں فلم کی داغ بیل نہیں ڈالی۔یہ فرض ہمنسو رائے، دیویکا رانی اور اردشیر ایرانی، دادا بھائی پھالکے نے ادا کیا تھا۔آغاز میں ہندوستان کی فلمی صنعت اعلیٰ تعلیم یافتہ اور عالی دماغ لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔ آج وہاں اُسے فلمی تربیت اور تعلیم یافتہ ہونا لازمی ہوگیا ہے مگر عالی دماغ نہ ہونے کی وجہ سے وہ گھٹیا، سنسنی خیز اور عوامی پسند کی فلمیں بنا رہے ہیں۔لیکن وہاں معیاری کمرشل فلمیں بھی بنتی ہیں اور آرٹ فلمیں بھی۔ان کا مارکیٹ بہت وسیع ہے۔تجربہ کرنے والوں کے پاس سرمایہ نہیں ہوتا۔وہ کم لاگت اور نئے غیر فلمی چہروں کو لے کر فلمیں بناتے ہیں اگر فلم ناکام بھی ہو جائے تو لاگت پوری کر لیتی ہے لیکن ہماری مختصر سی مارکیٹ اور ان پڑھوں، دیہاتیوں کی کثرت انھیں منہ تک نہیں لگاتی۔انڈیا کی شہری آبادی یہ فلمیں دیکھتی ہے جبکہ ہمارے شہروں میں بھی دیہاتی افراد اور سوچ کا غلبہ ہے۔بمل رائے کی فلم ''دو بیگھہ زمین'' کوئی سپرہٹ فلم نہ تھی مگر وہ انڈیا کی فلمی آرکیو کی زینت ہے۔

عزیز میرٹھی صاحب نے تحریر کے تیسرے پیراگراف میں ہی منور ایچ قاسم صاحب کے ساتھ اپنی ناپسندیدگی بلکہ نفرت کا اظہار کر دیا ہے۔اس کے بعد کے واقعات میں بھی پڑھنے والے کے نزدیک منور ایچ قاسم ایک شرابی، کبابی اور مجہول العقل انسان کی صورت میں پیش کئے گئے ہیں۔ممکن ہے عزیز صاحب کے یہ تجربات اور مشاہدات درست ہوں لیکن اسی زمانے میں ہم نے بھی منور ایچ قاسم صاحب کے ساتھ کام کیا۔ہمارے تجربات قدرے مختلف ہیں۔

فلم ''جٹی'' غالباً 1956ء میں بنائی گئی تھی۔1959ء میں منور ایچ قاسم نے فلم ''آجکل'' کا آغاز کیا۔ہم ایک سال پہلے صحافت ترک کرکے فلم سے وابستہ ہوئے تھے۔ٹھنڈی سڑک، ایاز اور آدمی کے سوا کوئی سکرپٹ نہیں لکھا تھا مگر سیکھ کر آئے تھے۔

معروف فلمی شاعر تنویر نقوی سے ہمارے گہرے تعلقات تھے۔وہ منور ایچ قاسم صاحب کی بیگم کے کزن بھی تھے۔ایک روز انھوں نے بتایا کہ منور صاحب ایک فلم کی کہانی آپ سے لکھوانا چاہتے ہیں اور آپ سے ملنے کے خواہش مند ہیں۔منور ایچ قاسم کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اعلیٰ خاندانی پس منظر کا ہم نے بھی ساتھ دیا۔اس خیال سے بہت خوشی ہوئی کہ ایک اچھے ہدایت کار کے ساتھ کام کرنے کا

موقعہ ملے گا۔ایک اہم نکتہ جو بیان کرنے سے رہ گیا وہ ہندوستان سے آئے ہوئے ہدایت کاروں کے بارے میں عزیز صاحب کے بقول وہ بس ''یوں ہی'' سے تھے، پاکستان آ کر انھوں نے کوئی کامیاب فلم نہیں بنائی۔ یہ بات اور لوگ بھی کرتے ہیں۔آیئے دیکھتے ہیں کہ ہندوستان سے کون سے ہدایت کار پاکستان آئے تھے۔سید شوکت حسین رضوی جو پاکستان میں خاندان اور انڈیا میں زینت، نوکر اور جگنو جیسی فلمیں بنا چکے تھے۔ پاکستان آ کر وہ سٹوڈیو کی تعمیر میں مصروف ہو گئے۔انھوں نے فلمیں بھی بنائیں۔ان کی فلمی ہدایت کاری اور ہنرمندی کی مثال ہیں۔ ہندوستان کی فلمی صنعت میں ایک مسلمان کا نام پیدا کرنا ہی اس کی صلاحیتوں کی دلیل ہے۔اسی طرح ڈبلیو زیڈ احمد آئی سی ایس کا امتحان دینے کے لیے انگلستان جا رہے تھے مگر بمبئی پہنچے تو فلموں نے دامن کھینچ لیا۔''پریم سنگیت''، ''من کی جیت''، ''ایک رات''، جیسی فلمیں بنا کر ہی اور برصغیر کے عظیم ہدایت کار اور سکرین پلے رائٹر بن گئے۔ ہر طرف ان کی دھوم مچ گئی۔ پھر انھوں نے پونا میں اپنا شالیمار سٹوڈیو بھی بنا لیا۔بمبئی کے بڑے بڑے سیٹھ ان کو سرمایہ دینے کے لئے ان کے در پر بیٹھے رہتے تھے۔سبطین فضلی صاحب نے بھی کامیاب فلمیں بنا کر ہندوستان میں اپنی دھاک بٹھا دی تھی۔ان کے موضوعات عموماً مسلم سوشل ہوتے تھے مگر ان کی فلمیں ہندو اور مسلمان سبھی دیکھتے تھے۔

ایس۔ایم یوسف پاکستان آئے تو اپنی پہلی فلم ''سہیلی'' سے ہی سب کو چونکا دیا۔انھوں نے اور بھی اچھی اور کامیاب فلمیں بنائیں اس لئے ہندوستان سے آنے والے ہدایت کاروں کی پاکستان میں ناکامی کو ان کی نالائقی یا نااہلی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔

سوال یہ ہے کہ یہ بڑے بڑے ذہین لوگ جنہوں نے سخت مقابلوں کے بعد انڈیا میں اپنے آپ کو منوایا تھا پاکستان آ کر کیا یہاں کی آب و ہوا نے انھیں ناکارہ بنا دیا؟ میں ان سب سے بہت قریب رہا ہوں۔ان کی فلم نہ بنانے کی وجوہات سے واقف ہوں۔ مختصر یہ کہ وہ جس ماحول سے وسیع پیمانے پر فلمیں بناتے ہوئے آئے تھے وہ یہاں میسر نہ تھا۔نہ ہنرمند تھے نہ اداکاران کی تھے پسند کے تنے۔ میں ان سب کی ذہنی بے چینی اور رکاوٹوں سے واقف ہوں۔

منور ایچ قاسم مالی اعتبار سے بہت مضبوط تھے۔وہ سکرین اینڈ ساؤنڈ سٹوڈیو میں حصہ دار تھے۔لکشمی چوک میں ان کا دفتر بہت شاندار تھا۔ میرے سامنے ایک قدآور، خوبصورت نقش و نگار اور گندمی رنگ والا شخص بیٹھا تھا۔ میرے نووارد ہونے کے باوجود یا شاید تنویر صاحب کے لحاظ میں انہوں نے اٹھ کر مصافحہ کیا۔ وہ ایک نرم گفتار انسان تھے اور بااخلاق بھی تھے۔ وہ مجھے انتہائی شائستہ انسان لگے۔ ابتدائی گفتگو کے بعد طے پایا کہ میں ہر شام کو دوسرے کاموں سے فرصت پا کر ان کے پاس جایا کروں گا۔انھوں نے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور انتہائی شائستہ میوزک ڈائریکٹر مصلح الدین کا انتخاب کر لیا تھا۔ ہماری اور مصلح الدین کی گاڑھی چھنتی تھی۔ وہ بھی ابتدائی دور میں تھے۔ چند فلموں کی موسیقی ترتیب دی تھی۔گلبرگ کی ایک کوٹھی میں وہ پے انگ گیسٹ کے طور پر رہتے تھے۔ ہماری رہائش ماڈل ٹاؤن میں تھی۔اس زمانے میں سات آٹھ بجے لاہور میں رات ہو جاتی تھی۔ ماڈل ٹاؤن بس سروس کی آخری بس دس بجے رخصت ہو جاتی تھی۔ تانگہ یا کوئی دوسری سواری دستیاب نہیں ہوتی تھی۔ اکا دکا گڈے یا دودھ والوں کے ریڑھے کبھی نظر آ جاتے تھے۔ہم نے کئی بار ان سواریوں میں ماڈل ٹاؤن تک سفر کیا۔ فیروز پور روڈ ایک ویران، سنسان اور روشنی سے محروم سڑک تھی۔ راستے میں چھوٹی چھوٹی آبادیاں تھیں مگر دور دور۔ سردیوں کے دن تھے اور اس زمانے میں لاہور میں سردی اور گرمی دونوں موسم کڑا کے دار ہوتے تھے۔

منور ایچ قاسم اس زمانے میں شاہ جمال روڈ کی ایک شاندار کوٹھی میں رہتے تھے۔کوٹھی کے ایک حصے میں انہوں نے اپنا ایڈیٹنگ

روم بنا لیا تھا۔ اپنی فلموں کی ایڈیٹنگ بھی وہ خود ہی کرتے تھے۔ اب تو لاہور کا حلیہ ہی بدل گیا ہے۔ اس زمانے میں فیروز پور روڈ سے شاہ جمال روڈ پر داخل ہوں تو تھوڑے ہی فاصلے پر برلب سڑک ان کی شاندار کوٹھی تھی۔

اسی سڑک پر کسی زمانے میں صبیحہ خانم، راگنی اور سید کمال بھی رہتے تھے۔ کمال ہمارے لنگوٹیا تھے یعنی سکول کے زمانے کے دوست۔ انھیں "آجکل" میں ہیرو منتخب کیا گیا تھا۔ صبیحہ خانم ہیروئین تھیں۔ منور صاحب اور کمال کی کوٹھی آمنے سامنے تھیں۔ اُس زمانے میں کفایت شعاری کی وجہ سے وہ ایک کوٹھی کے حصے میں رہتے تھے، گلی میں ان کا گھر منور ایچ قاسم کے گھر کے عین سامنے تھا۔

شام کو ہم مصلح الدین کے ساتھ منور صاحب کی کوٹھی پہنچے جہاں کمال بھی موجود تھے۔ ان کا منور صاحب کے گھر میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ کبھی کوئی تکلف والا مہمان آجائے تو وہ اپنا ملازم بھیج کر منور صاحب کے گھر سے چائے بھی منگا لیتے تھے بہترین پیالیوں اور ٹکوزی سے ڈھکی ہوئی چائے دانی ایک ٹرے میں رکھ کر بھیجی جاتی تھی۔ منور صاحب نے بڑی گرم جوشی سے مصلح الدین کا اور ہمارا استقبال کیا اور دفتر کی بجائے اپنے ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ سلیقے سے سجا ہوا ڈرائنگ روم تھا۔ انہوں نے کہا کہ تھوڑی دیر چائے کافی پی کر تازہ دم ہو جاتے ہیں پھر کام شروع کریں گے۔ ان کی بیگم اور صاحب زادیاں بھی آگئیں جن سے ہم دونوں کا تعارف کرایا گیا۔ مصلح الدین اور ہم گرم سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ میچنگ موزے اور ٹائی تھی۔ ہمیں اس لباس میں دیکھ کر عموماً فلم والے حیرت کا اظہار کرتے تھے کیونکہ اس زمانے میں فلمی صنعت میں خوش لباس لوگ بہت کم دیکھنے میں آتے تھے۔

چائے یا کافی کے بعد خشک میوہ بھی آگیا۔ منور صاحب گھر میں شلوار قمیص استعمال کرتے تھے۔ شانوں پہ ایک گرم شال ہوتی تھی۔ چائے پینے کے بعد انہوں نے کہا "مجھے تو قالین پر بیٹھنا اچھا لگتا ہے۔ آپ چاہیں تو آپ بھی آرام سے قالین پر بیٹھ جائیں۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔ ان کے گھر والے بھی موجود تھے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ہم لطیفے بھی سنا دیتے تھے جس کی وجہ سے ہمارے پاس سب کا جمگھٹا ہو جاتا تھا۔ منور صاحب بھی لطیفے سُن کر لطف اٹھاتے تھے۔ ان کی چھوٹی صاحب زادی کو گھر میں ککو کہا جاتا تھا۔ وہ ایک معصوم اور خوش شکل لڑکی تھی۔ کچھ عرصے بعد ککو اور کمال کی منگنی بھی ہوگئی تھی جو بعد میں ٹوٹ گئی۔ اس کی داستان علیحدہ ہے۔ ایک دن کمال نے ہم سے شکوہ کیا کہ تم ککو سے بہت بے تکلف ہو گئے ہو۔ حالانکہ میری اس کے ساتھ منگنی ہونے والی ہے۔ یہ وضاحت کرنا ضروری ہے کہ کہانی کے بارے میں ملاقاتوں میں کمال کبھی شریک نہیں ہوئے۔ ہم نے ان سے کہا کہ بھائی تمہاری منگیتر تمہیں مبارک ہو۔ اگر سب لوگ ہماری باتوں میں دلچسپی لیتے ہیں تو یہ اور بات ہے۔

کہانی کے سیشن کافی عرصے جاری رہے۔ اس کا طریقۂ کار یہ تھا کہ میں اور مصلح الدین شام کو پانچ بجے منور صاحب کی کوٹھی پر پہنچ جاتے تھے۔ جہاں وہ ہمارے منتظر ہوتے تھے۔ ہمیں اندر ڈرائنگ روم میں لے جایا جاتا جہاں کہانی کے بارے میں اور گانوں کی کمپوزیشن کے بارے میں کچھ گفتگو ہوتی۔ پھر چائے یا کافی آجاتی تھی جس کے ساتھ منور صاحب کی بیگم اور صاحبزادیاں بھی آجاتی تھیں۔ چائے یا کافی پیتے ہوئے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع ہو جاتی تھیں۔ منور صاحب کی ایک عجیب عادت یہ تھی کہ جو مناظر لکھ لئے جاتے تھے وہ ہم سے کہتے تھے کہ آپ پڑھ کر سنائیے۔ پڑھنے سے ہماری جان جاتی ہے مگر وہ سرگوشی میں کہتے کہ آفاقی صاحب جب آپ پڑھیں گے میں سب کے تاثرات نوٹ کرتا رہوں گا کہ ان کو سین لینا آرہا ہے یا نہیں۔

اتنی دیر میں ڈنر کا وقت ہو جاتا تھا۔ قالین پر ہی دسترخوان بچھا دیا جاتا اور ہم سب مل کر کھانا کھاتے۔ درمیان میں فقرہ بازی اور

لطیفہ بازی بھی چلتی رہتی تھی۔منور صاحب بھی لطف اندوز ہوتے تھے۔کھانے کا دسترخوان اٹھتا تو خشک میوہ آجاتا۔ہماری کوشش ہوتی تھی کہ کچھ کام کی بات بھی ہوجائے مگر منور صاحب کہتے وہ بھی ہوجائے گی۔آپ میوہ کھائیں۔میوہ ختم ہوتے ہی پھلوں کی ٹرے آجاتی تھی۔منور صاحب کا کہنا تھا کہ کھانے کے بعد تازہ پھل کھانا صحت اور ذہن کے لئے بہت مفید ہے۔اس طرح گیارہ بارہ بج جاتے گھر والے رخصت ہوجاتے تو کہانی اور سکرین پلے کے بارے میں گفتگو ہوتی تھی جس میں مصلح الدین بھی حصہ لیتے تھے۔بارہ ساڑھے بارہ بجے ہم تھک جاتے اور اجازت طلب کرتے۔منور صاحب کوٹھی کے برآمدے تک اور کبھی کبھی گیٹ تک ہمیں رخصت کرنے آتے۔انھوں نے کبھی ہمیں ڈرائیور کے ذریعے گھر بھیجنے کی دعوت نہیں دی۔

اب ہمارا مشکل سفر شروع ہوتا۔کڑکڑاتا ہوا جاڑا۔سواری کا نام ونشان تک نہیں تھا۔کبھی گڈا یار یڑھا مل جاتا تو ہم دونوں سوٹ بوٹ پوش اس میں سوار ہوکر ماڈل ٹاؤن کی طرف چلتے۔گلبرگ بولیوارڈ پر ہماری منزلیں مختلف ہوجاتیں۔وہ گلبرگ کی طرف اور ہم ماڈل ٹاؤن کی طرف چل پڑتے۔رات، سناٹا، سنسان سڑکیں اور ہم۔

یہ روز کا معمول تھا جو کئی ماہ جاری رہا۔ڈسکشن کے بعد ہم نے منظر نامہ اور مکالمے لکھنے شروع کردیئے۔منور صاحب پڑھ کر اپنی تجاویز اور مشورے دیتے۔ہم اپنا نقطۂ نظر بیان کرتے۔اہم مناظر کے بارے میں وہی طریقہ کار تھا یعنی تمام گھر والے سن کر اپنی رائے دیتے تھے مگر اصل فیصلہ ہم پر اور منور ایچ قاسم پر منحصر تھا۔منور صاحب نے سکرپٹ مکمل ہونے کے بعد ہماری اطلاع اور مرضی کے بغیر اس میں کچھ تبدیلیاں بھی کیں جو فلم کا پرنٹ دیکھنے کے بعد معلوم ہوا۔''آجکل'' ایک ہلکی پھلکی رومانی فلم تھی فلاپ بھی نہیں ہوئی، ہٹ بھی نہیں ہوئی۔اس فلم نے اوسط درجے کا بزنس کیا۔ اب کچھ ذکر منور ایچ قاسم کی شخصیت کا ہوجائے۔وہ ایک خالص گھریلو قسم کے آدمی تھے۔تقاریب وغیرہ میں جانے سے گریز کرتے تھے۔پانچ چھ ماہ ہم نے (مصلح الدین اور راقم الحروف) رات گئے تک ان کے ساتھ کام کیا۔انھوں نے کبھی شراب نوشی کی اور نہ ہی شراب کی خواہش کا اظہار کیا۔ہم نے انہیں کبھی نشے کے عالم میں نہیں دیکھا۔نرم لہجے میں بات کرتے تھے۔کبھی انہیں چلّاتے یا اپنے بال نوچتے نہیں دیکھا۔وہ دوسروں کا بھی احترام کرتے تھے۔کم از کم ہمارا تجربہ تو یہی ہے۔ہمیں ان سے شکایت یہ رہی کہ کام کے علاوہ دوسری باتوں میں بہت وقت ضائع کرتے تھے اور یہ کہ انہوں نے کبھی جاڑوں کی راتوں میں ہم دونوں کو کار کے ذریعے گھر بھیجنے کی پیشکش بھی نہیں کی۔نہ ہم نے کبھی خواہش ظاہر کی، نہ شکوہ کیا۔ہم نے انہیں ہمیشہ بااخلاق اور معقول ہی پایا۔انہوں نے 'آجکل' کے بعد فلم نہیں بنائی۔ان کے دوسرے ذرائع آمدنی بھی تھے۔سکرین اینڈ ساؤنڈ سٹوڈیو کے وہ حصے دار تھے۔خوش لباس اور خوشحال بھی تھے۔کمال سے ان کی بیٹی کی منگنی ٹوٹ جانے کے بعد وہ لندن چلے گئے تھے۔پھر خبر ملی کہ ان کی بیٹی کی معروف بینکر حسن عابدی صاحب سے شادی ہوگئی ہے مگر براہ راست یا بالواسطہ ان سے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ایک دن خبر ملی کہ ان کا انتقال ہوگیا۔اناللہ وانا الیہ راجعون۔برادرم عزیز میرٹھی نے ان کا جو نقشہ کھینچا ہے ہم نے انھیں اس کے مطابق نہیں پایا بلکہ ان کا مضمون پڑھ کر حیرت ہوئی۔بہرحال اپنے اپنے تجربات اور مشاہدات ہوتے ہیں لیکن عزیز صاحب نے ان کا جو وحشیانہ اور عقل سے عاری انسان کا نقشہ کھینچا ہے وہ اس کے مستحق نہ تھے۔

◆◆◆

سب سے پہلا پتھر اظہرؔ اس نے مجھ کو مارا تھا   برسوں جس کی عزّت کی تھی، جس کا عقیدت مند رہا   (اظہر جاوید)

ڈاکٹر وزیر آغا کی یاد میں

(92ویں سالگرہ پر)

انور سدید

مئی کا مہینہ ڈاکٹر وزیر آغا کی پیدائش کا مہینہ ہے۔ آغا صاحب زندہ تھے تو یہ مہینہ معمول کے مطابق آتا اور ان کے یوم پیدائش 18 مئی (1922) کو عبور کرتا ہوا گزر جاتا۔ انہیں یاد دلایا جاتا کہ آج ان کی سالگرہ ہے، تو ایک دھیمی سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر بیدار ہوتی اور کہتے "زندگی کا ایک سال کم ہونے پر خوشی کیسی"؟ اس سادہ سے جواب سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ وزیر آغا زندگی کو نعمتِ خداوندی شمار کرتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ انسان کو دنیا کی امتحان گاہ میں وقت گزارنے کی صرف ایک معیاد (Term) ملتی ہے اور اس کے بعد عالمِ آخرت کی حیات دائمی ہے جو ارضی دنیا میں سانس لینے والے انسان کے تجربے سے باہر ہے۔

وزیر آغا کو اپنے گاؤں کی فضا سے موانست کا زیادہ عرصہ نصیب ہوا۔ اور یہیں انہوں نے اپنے والد گرامی آغا وسعت علی خان سے جو تصوف کی باطنی گہرائیوں کا مطالعہ کرنے والے انسان تھے، زندگی کی معنویت کا درس لیا، دکھ اور مسرت کی ماہیت کو سمجھا اور پھر ایم اے اقتصادیات کرنے کے باوجود کاشتکاری کو زندگی گزارنے کا وسیلہ بنایا۔ انہوں نے اسرارِ حیات کی دانش کے لیے مختلف علوم کا مطالعہ کیا اور ادب کو جس میں شاعری، تنقید و تحقیق اور انشائیہ کو فوقیت حاصل ہے۔ اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ اردو ادب میں طنز و مزاح "مسرت کی تلاش"......"نظم جدید کی کروٹیں"......"اردو شاعری کا مزاج......تصوراتِ عشق و خرد......اقبال کی نظر میں......""خیال پارے""تخلیقی عمل"......"انشائیہ کے خدوخال"......تنقیدی تھیوری کے سو سال" جیسی نثر کی فکری کتابوں اور شاعری میں "شام اور سائے""دن زرد پہاڑ"......"نردبان"......"غزلیں"......"اک کتھا انوکھی"......اور کلیات "چہک اٹھی لفظوں کی چھاگل" وغیرہ کتابوں کے مصنف کی حیثیت میں انہیں ایک ایسا ادبی دانشور تسلیم کیا گیا جس نے آزادی کے بعد پاکستان میں اردو ادب کو سب سے زیادہ متاثر کیا اور نئی نسل کی تربیت اپنی تنقیدی و تخلیقی کتابوں کے علاوہ رسالہ "اوراق" سے کی۔

ادب ڈاکٹر وزیر آغا کی زندگی کی اہم ترین سرگرمی تھی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انہوں نے معاشرتی سرگرمیوں کو کبھی نظر انداز نہیں کیا اور وہ نام و نمود کی خواہش کے بغیر ملک و قوم کی تعمیری ترقی میں اپنا کردار خوش اسلوبی سے ادا کرتے رہے۔ ان کے اسلاف گھوڑوں کے سوداگر تھے۔ جنگِ عظیم میں انگریزی سرکار کو گھوڑوں کی ضرورت سامان حرب کی نقل و حرکت کے لیے پڑی تو نہری نظام کے دوآبوں میں زمینداروں کو گھوڑے پالنے کے لیے زمینیں الاٹ کی گئی تھیں۔ فیض احمد فیض کے والد محترم اور ڈاکٹر وزیر آغا کے دادا کو ضلع سرگودھا میں زمین دی گئی۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد انگریزی سرکار کو گھوڑوں کی ضرورت نہ رہی تو یہ گھوڑے پال مربعے اجناس کی کاشت کے لیے

استعمال ہونے لگے۔ وزیر آغا کے والد آغا وسعت علی خان انہیں گھوڑوں کا سوداگر بنانا چاہتے تھے۔ ان کی دوسری خواہش یہ بھی تھی کہ وزیر آغا فوج میں کمیشن حاصل کریں۔ لیکن انہوں نے کاشتکاری کو ترجیح دی اور فوج میں انگریزی سرکار کی غلامی کو یکسر مسترد کر دیا۔ سماجی سطح پر وزیر آغا کی پہلی نمایاں خدمت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے گاؤں کی بے آباد زمینوں کو زراعت کے جدید اصولوں کے مطابق قابل کاشت بنایا۔ وزیر آغا نے اپنی خودنوشت سوانح ''شام کی منڈیر سے'' میں لکھا ہے:

''میرے لیے یہ سارا ماحول جنگلی گلاب کی ان جھاڑیوں پر مشتمل تھا جن کی کبھی تراش خراش نہ کی گئی ہو۔ مگر ۱۹۵۴ کے طلوع ہوتے ہی زمین سے میرے تعلق خاطر میں ایک نئے بُعد کا اضافہ ہوا''

چنانچہ وزیر آغا نے کاشت کی جانے والی زمین کے ایک خاص پیٹرن کو ملحوظ رکھ کر کچی سڑکیں بنانی شروع کیں۔ پھر پانی کے کھالوں کی طرف متوجہ ہوئے کہ پانی تو زراعت کے لیے خونِ گرم کا درجہ رکھتا ہے۔ انہوں نے بل کھاتے کھالوں کے برعکس سیدھے کھال بنائے اور پھر انہیں تنگ کر پانی کی رفتار کو تیز کر دیا۔ اچھی زراعت کے لیے انہوں نے کھیتوں کا سائز برابر کیا اور ان کی ناہمواری رفع کر دی۔ وزیر آغا نے لکھا ہے:

''میں صبح پانچ بجے اٹھتا۔ جلدی جلدی ناشتہ کر کے اور فل بوٹ پہن کر کھیتوں میں نکل جاتا۔ وہاں لوگ پہلے سے موجود ہوتے۔ میں فیتہ ہاتھ میں لیے کھیتوں، سڑکوں اور کھالوں کے بل نکال نکال کر انہیں سیدھا کرنے کے عمل میں جتا رہتا......اور ۱۲۰ درجہ حرارت میں بھی سر پر سولا ہیٹ رکھے سارا سارا دن کھیتوں میں کام کرتا رہتا''۔

وزیر آغا کی یہ محنت رنگ لائی اور ان کی زمینیں جو پہلے صرف انگریزی سرکار کے گھوڑوں کے لیے چارہ اگاتی تھیں، سونا اگلنے لگیں اور انہیں اس علاقے کا نمایاں ترین کاشتکار قرار دیا گیا جس میں اپنی اراضی کے مناسب حصے کو کارآمد فصلوں کے لیے وقف کیا اور معتدبہ زمین کو پھل دار درختوں کی کاشت کے لیے مختص کر دیا۔ وزیر آغا نے یہاں اپنے زراعتی مطالعے اور تجربے کی اساس پر آم، مالٹا اور کنو کے تجربات کیے۔ جنہیں بعد میں بے شمار زمینداروں نے قبول کیا۔ اہم بات یہ ہے کہ امریکہ سے ایک زراعتی وفد آیا تو حکومت پاکستان نے اس وفد کے ایک امریکی نوجوان کو وزیر آغا کے فارم پر دو ہفتے کے قیام کے لیے بھیجا اور اس نے نہ صرف وزیر کوٹ کی زراعت کا مطالعہ کیا بلکہ معاشرتی مزاج کی پرکھ پڑچول بھی کی۔ وزیر آغا اس امریکی نوجوان کو ایک جاگیردار جی، ایم، ٹنگیانہ کی عالی شان کوٹھی پر لے گئے۔ صبح اٹھے تو دیکھا کہ امریکی نوجوان کوٹھی کے پورچ میں زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ امریکی نوجوان کہنے لگا:

''میں اس بات پر غور کر رہا ہوں کہ انسان کو رہنے کے لیے کل کتنی جگہ درکار ہے۔ مثلاً دیکھو مسٹر ٹنگیانہ کو اتنے بڑے محل کی کیا ضرورت ہے، جبکہ اسے اپنی رہائش کے لیے دو کمروں سے زیادہ جگہ درکار نہیں۔''

وزیر آغا اس بات سے اتنے متاثر ہوئے کہ اپنے زرعی فارم پر کام کرنے والوں کو ان کے کنبے کی ضرورت کے مطابق مکان بنانے کے لیے زمین دے دی۔ اور مکان کی تعمیر کے لیے سرمایہ بھی فراہم کیا۔ میرا ذاتی مشاہدہ یہ ہے کہ وزیر کوٹ فارم پر آجر اور اجیر، زمیندار اور مزارع کا امتیاز مفقود تھا۔ وزیر آغا نے کاشتکاروں کے بچوں کی تعلیم کے لیے گاؤں میں سکول کھولا اور تعلیم کا ایسا ذوق پیدا کیا کہ کئی نوجوان کالج کی تعلیم کے لیے سرگودھا۔ فیصل آباد اور لاہور کے کالجوں تک پہنچے۔ اور اب اعلیٰ ملازمتوں پر بھی فائز ہیں۔ وزیر آغا اپنے ایام جوانی میں گاؤں میں کھیلوں کا خصوصی انتظام کرتے تھے۔ سال میں ایک مرتبہ دوسرے دیہاتوں کے ساتھ ٹورنامنٹ منعقد کراتے اور

انعام تقسیم کرتے۔ مجھے جب کبھی شام وزیر کوٹ میں گزارنے کا موقعہ ملتا تو میں دیکھتا کہ وزیر آغا والی بال کے کھیل میں گاؤں کے نوجو
کے ساتھ شامل ہیں اور رات کے وقت ان کے ساتھ چارپائیوں پر بیٹھ کر ان کی باتیں سنتے اور اپنے تجربات بیان کرتے تھے۔ ان کا
گاؤں ایک کنبہ تھا جس کے باشندے امارت اور غربت کے امتیاز سے ناآشنا تھے۔

''ون یونٹ'' کے دور میں پورے مغربی پاکستان کے لیے بیس بائیس ممبروں پر مشتمل ایک زرعی مشاورتی کمیٹی کا اعلان کیا گیا
گورنر امیر محمد خان نے وزیر آغا کو بھی اس میں شامل کیا۔ آغا صاحب نے اپنے ادبی راہنما مولانا صلاح الدین احمد سے کہا کہ وہ اصولاً و
مزاجاً اس میں شرکت کے خلاف ہیں لیکن مولانا نے جواب دیا ''یہ کوئی سیاسی ادارہ نہیں۔ محض ایک مشاورتی کونسل ہے۔ آپ اس کے
اجلاس میں شریک ہو کر اب زراعت، تعلیم اور ادب کے سلسلے میں مشورے دے سکتے ہیں۔'' چنانچہ انہوں نے متعدد مفید تجاویز کے علاوہ
ایک یہ تجویز بھی منظور کرائی کہ دیہاتی مدرسوں میں زرعی تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے...... انہیں دکھ یہ تھا کہ اس مشاورتی کونسل کی بے شمار
تجاویز پر عمل درآمد نہیں ہوا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا زمین سے ناتہ بے حد مضبوط تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے دورِ حکومت میں زرعی اصلاحات
نافذ کیں تو انہوں نے اراضی کی منظور شدہ حدود پر قناعت کی اور قانون کی تعمیل میں زائد اراضی حکومت کی نذر کر دی۔ ۷ ستمبر ۲۰۱۰ کو انہوں
نے لاہور میں وفات پائی لیکن ان کا جسدِ خاکی وزیر کوٹ لے جایا گیا اور اس مٹی میں دفن کیا گیا جس نے ان کی پرورش کی تھی۔

''ادبی دنیا'' وزیر آغا کی زندگی کے اس عملی پہلو سے ناآشنا ہے اور بے پر کی اڑائی جاتی ہیں۔ ان کی 92 ویں سالگرہ پر میں یہ
جہت سامنے لا رہا ہوں۔

◆◆◆

بین الاقوامی کارٹونسٹ جاوید اقبال

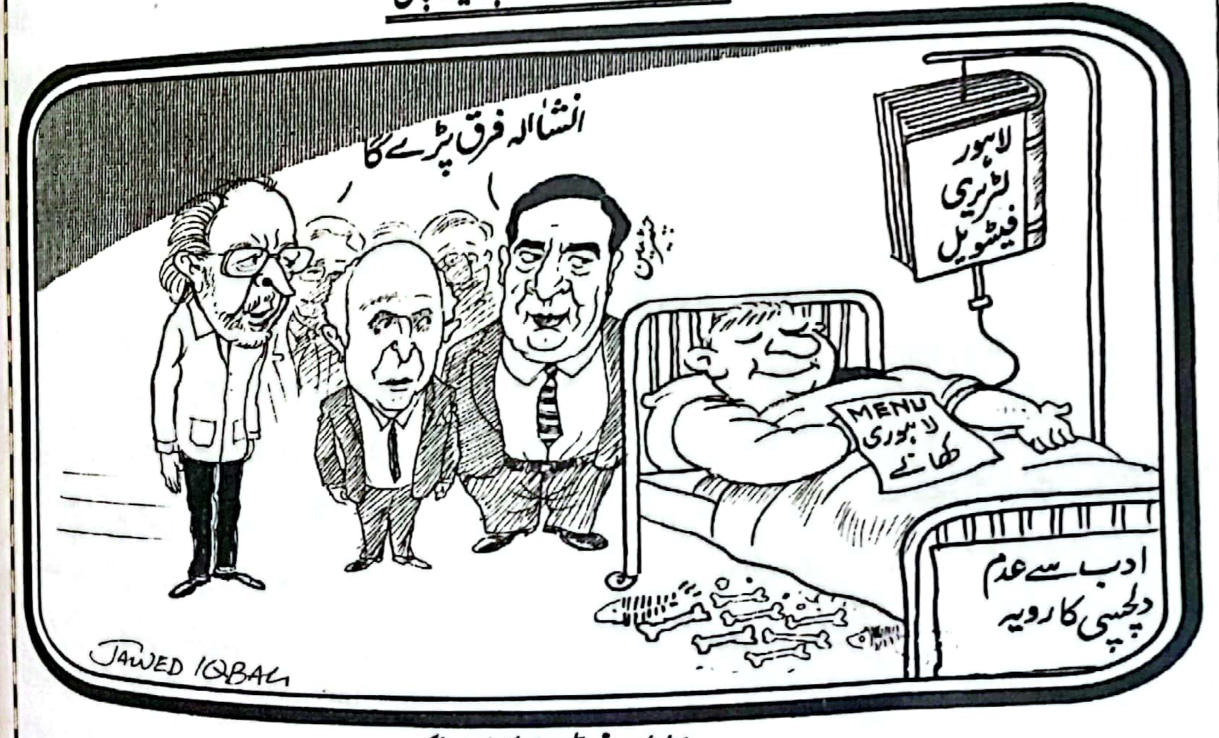

لٹریری فیسٹویل کا آغاز ہو گیا۔ !

بہتا دریا —— بابا عرفان الحق

ڈاکٹر ابدال بیلا

شہر کے ایک نفیس اجلے علاقے میں بینک اسکوئیر چوک میں بنے، ایک صاف ستھرے ریسٹورنٹ میں روز شام کو دو چار علم دوست، دوستوں کی منڈلی لگا کے عرفان صاحب بیٹھ جاتے اور اپنے علمی ادبی گھرانے سے ملی میراث لوگوں میں بانٹتے رہتے۔ لوگ انہیں ایک مدبّر، پڑھا لکھا، دانش ور بینک آفیسر سمجھتے تھے۔ اس وقت تک لوگوں کو علم نہیں تھا کہ بینک افسر کے لبادے میں ایک مہان درویش چھپا ہوا ہے۔ نہ انہوں نے کبھی اندر کی کوئی کھڑکی کھولی، نہ باہر سے کسی نے دستک دی۔ مگر اس روز انہونی ہونا تھی اور ایک ایسی آندھی کو آنا تھا کہ سب دیکھ لیتے کہ، دروازہ کھلتا ہے۔ ہوٹل کی کھڑکی سے باہر انکے سڑک پار بینک کے نیلے شیشوں سے سجی عمارت نظر آیا کرتی، اسی بینک کے وہ مینجر تھے۔ بینک بند ہوتا تو وہ اس ریستورانت میں علم و گیان کا اکاؤنٹ کھول کے بیٹھ جاتے۔ شہر میں جو بھی صاحب علم آتا، ادھر حاضری دیتا۔ ایک دن، ایک معروف پامسٹ سیف الدین حسام ادھر آ گیا۔ چائے کی پیالی پکڑے، وہ اپنے علم کے نشے میں اپنے تجربے کی چسکیاں لینے لگا۔ کس کس کا ہاتھ دیکھا؟ کس کو کیا بتایا؟ جو بھی بتایا سچ نکلا۔ بولا بہت سے مشاہیر کے ہاتھ بھی دیکھے اور جو دیکھا وہ پھر زمانے بھرنے دیکھا۔'' بتہیرے نام اس نے گنوا دیے۔ مولانا مودودی کا ہاتھ دیکھا، ذوالفقار علی بھٹو کی ہتھیلی دیکھی، امام خمینی کے ہاتھ دیکھنے کی سعادت بھی ملی۔ یہ دو دوست چائے کی بھاپ بھری پیالیوں اور سگریٹ دھوئیں کے مرغولے میں مگن دل جمعی سے باتوں میں لگے تھے۔ انہیں احساس نہ ہوا کہ ان کے برابر کی میز پہ بیٹھا کوئی شخص شدید تجسس سے انکی باتیں سن رہا تھا۔ آخر وہ اجنبی اضطراری کیفیت میں اپنی میز سے اٹھا اور ایک دم سے انکے میز کی کرسی کھینچ کے آ بیٹھا۔ بولا ''سرکار میں نے ساری باتیں سن لیں۔ آپ اتنی شکتی والے بندے ہیں، جو ہونا ہوتا، ہاتھ دیکھ کے بتا دیتے ہیں۔ مجھے بھی ایک بات پوچھنی ہے۔'' اس نے اپنی ہتھیلی قمیض سے رگڑ کے صاف کی اور ہاتھ کھول کے عرفان کے ساتھ بیٹھے پامسٹ سیف الدین حسام کے آگے کر دی۔ سیف الدین حسام ترنگ میں بیٹھا تھا ''بول کیا پوچھنا ہے؟''

اجنبی بولا ''میرا ایک کزن مجھے بہت پیارا تھا۔ اکیس سال سے وہ لاپتہ ہے۔ خدا جانے زندہ ہے، مردہ ہے، کہاں ہے؟ اس کا پوچھنا ہے۔'' اس نے اپنے دونوں ہاتھ کھول کے حسام کے سامنے رکھ دیے۔ حسام نے اسکی بات سن کے اپنے ماتھے پہ ہاتھ مارا۔ بولا، اللہ کے بندے میں ہاتھ دیکھنے والے کا مستقبل بتاتا ہوں، تیرا ہاتھ دیکھ کے تیرے اکیس سال پہلے گم ہوئے کزن کا کیسے بتاؤں، تمہاری عقل کدھر ہے؟ ہے کوئی دنیا میں ایسا تیس مار خان جو تجھے دیکھ کے تیرے رشتے داروں کا برسوں پرانا بھید بتائے؟'' بول؟'' میرا چیلنج ہے۔''

اجنبی نے جھینپ کے اپنی کھلی ہتھلیاں بددلی سے ہولے ہولے بند کرنا شروع کردیں۔ اسکے چہرے پہ امید کی ایک کرن جو چند لمحے پہلے چمکی تھی اسکی بتی بجھ گئی۔ وہ شرمندگی اور بے بسی سے ادھر اُدھر گردن گھماتے ہوئے، عرفان الحق سے آنکھ ملا بیٹھا۔ یہاں کہیں عرفان صاحب کی آنکھ میں جہاں بھر کو اپنی آنکھ سے دیکھنے والی ہستی نے اسکی بے بسی دیکھی اور مسکرا دی۔

عرفان صاحب کے ظہور عرفان کا لمحہ اتر آیا۔ زندگی بھر جنہوں نے کوئی دعویٰ نہیں کیا تھا، کوئی پیشین گوئی نہ کی تھی۔ پتہ نہیں، بیٹھے بیٹھائے انکے اندر کیا بھونچال آیا، ہاتھ میں پکڑی چائے کی پیالی میز پہ رکھی اور اجنبی سوالی کو مخاطب کر کے بولے،

''تیرے سوال کا جواب میں دیتا ہوں۔'' سوالی کے چہرے پہ حیرت کی روشنی کا ہیولہ ابھرا۔ ساتھ بیٹھا پامسٹ بھی تعجب سے انکی طرف مڑا۔ عرفان صاحب نے اجنبی سوالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بات شروع کی۔ بولے،'' پہلی بات یہ کہ تیرا کزن زندہ ہے۔ اسے کسی نے اغوا نہیں کیا۔ اپنی مرضی سے وہ گیا تھا۔ اس وقت وہ فلاں شہر کی فلاں تحصیل کے فلاں گاؤں کی بڑی گلی کی نکر پہ بنی کریانے کی دکان چلاتا ہے۔ اُسی گاؤں میں اسکی بیوی اور بچے ہیں۔ جا جا کے مل آ۔'' سوالی کے ساتھ حسام بھی کرسی سے دو انچ اوپر اٹھ گیا۔ اتنا مفصل جواب، اس قدر باریک بینی سے۔

اکیس سال سے گم ہوئے بندے کا سارا احوال۔ دونوں کی آنکھوں کی پتلیاں حیرت سے پھیل گئیں، ہونٹ گنگ ہو گئے۔ اجنبی سوالی کے چہرے پہ اطمینان کا ایک ریلا آیا، پھر شک کی دراڑیں پڑ گئیں۔ وسوسوں نے سر اٹھایا اور وہ ہولے سے بولا،'' اگر یہ سچ نہ ہوا تو؟''

عرفان صاحب کے چہرے پہ کسی اور کا چہرہ تھا۔ تیقن اور جلال سے بھرا ہوا۔ انہوں نے ہوٹل کی کھڑکی کا پردہ ہاتھ سے سرکایا، بولے'' وہ سامنے نیلے شیشوں والا بینک دیکھتے ہو'' سوالی نے گردن لمبی کر کے وہ بجی بلڈنگ دیکھی اور بولا،'' جی!'' '' میں اس بینک کا مینجر ہوں۔ اگر میری بات غلط ہوئی تو آ کے اس بینک کے سارے شیشے توڑ دینا۔ وہ جرم تیرا نہیں میرا ہوگا'' عرفان صاحب نے اپنی نوکری اور اپنا بینک داؤ پہ لگا دیا۔

''یہ حسام گواہ ہے۔''

وہ بندہ عجیب تذبذب میں یقین اور بے یقینی آنکھوں میں لیے کچھ دیر تک عرفان صاحب کو خاموشی سے دیکھتا رہا، پھر ایک دم سلام کر کے چلا گیا۔ حسام سر پکڑ کے بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کتنے ہزار کا نقصان ہوگا اگر اس بندے نے سارے شیشے توڑ دیے۔ حسام جو چند لمحے پہلے، اپنے پامسٹری کے علم سے عرفان صاحب کو مرعوب کرنے کے لیے ڈینگیں مار رہا تھا، عرفان صاحب کو اسطرح دیکھ رہا تھا جیسے اسکے سامنے کوئی اجنبی بیٹھا ہو۔ جو کسی اور سیارے سے ابھی اترا ہو۔ انسان نہ ہو، کوئی غیر انسانی مخلوق ہو۔ اسکی عقل یہی سمجھی بیٹھی تھی کہ چند دن بعد وہ اجنبی ہاتھ میں پتھر اور لاٹھی لے کے آئے گا اور انکے بینک کے سارے شیشے توڑ کے پورا بینک ننگا کر دے گا۔ عرفان صاحب کے اپنے بینک کے ذاتی اکاؤنٹ میں تو مہینے کی تنخواہ کے علاوہ پھوٹی کوڑی نہیں ہوتی، ٹوٹے شیشوں کا سارا بل اسکے کھاتے پڑ جائے گا، گواہ جو ٹھہرا۔

لیکن ہوا الٹ، پانچویں دن وہ آدمی چار لوگوں کے سروں پہ مٹھائی اور پھلوں کے ٹوکرے لے کر بینک کی چوکھٹ پہ ایسے کھڑا تھا جیسے وہ دہلیز بینک کی نہ ہو کسی درگاہ کی ہو۔ اندر آ کے عرفان صاحب کے پیروں کو چھو کے بولا،'' سرکار، آپ عرفان الحق نہیں، عین الحق

ہیں، جو کہا وہی جا دیکھا''

شہر میں چہ مے گوئیاں شروع ہو گئیں۔ یہ بینک منیجر، گولڈ لیف کے کش لگانے والا، ایک پروفیشنل بینک آفیسر کون سے الوہی سٹیٹ بینک کا ایجنٹ ہے، جو اکیس سال پہلے گم ہوئے بندے کے رشتے دار کا چہرہ دیکھ کے گمشدہ بندے کا پورا اتا پتا بتا دیتا ہے؟ لوگوں کے ذہنوں کے فیوز اڑ گئے۔ انکی عقل کی انڈیکیٹر بتیاں جلنے بجھنے لگیں۔ انکی منڈلی بڑھ گئی۔ سوالی بھی بڑے بڑے سوال لے کے آنے لگے۔

ایک دن کسی کروڑ پتی نے کروڑوں کے کسی متوقع نفع کو سوچ کے کوئی سوال کر دیا۔ پھر ایک شام جیب میں ایک لاکھ روپے ڈال کر ان کی محفل میں آ بیٹھا۔ بولا،''سرکار مجھے تو امید نہ تھی آپ کی دعا کام کر گئی۔ یہ میری طرف سے حقیر ہدیہ ہے۔'' اس نے دونوں ہاتھوں کو کھول کے اندر رکھی نوٹوں کی گڈی عرفان صاحب کی طرف بڑھا دی۔ عرفان صاحب تو تھے ہی نوٹوں میں کھیلنے والے بینکر، پیسے لے کر پیسے والوں کے ہی اکاؤنٹ میں رکھتے تھے۔ ایک دم پیچھے ہٹ گئے اور سٹ پٹا کے بولے،''آپ کے پیسوں سے میرا کیا تعلق؟''

وہ بندہ عقیدت میں گڑگڑاتا گیا۔ یہ ٹس سے مس نہ ہوں۔ اس نے پاس بیٹھے عرفان صاحب کے دوستوں سے کھسر پھسر شروع کر دی۔ ان میں سے ایک نے اسے کہا،''آپ میرے ساتھ آئیں۔'' اس بندے کو لے کے اپنے گھر گیا، اندر سے اس نے بھی ایک لاکھ روپیہ نکالا اور اسکے روپوں کی گڈی کے ساتھ لفافے میں ڈالا، اور بولا،''آؤ، ایک اور جگہ چلیں۔'' دونوں عرفان صاحب کے ایک تیسرے عقیدت مند کے پاس جا پہنچے۔ تیسرا عقیدت مند راجہ افضال تھا۔ جہلم شہر کے مضاف میں ڈگری کالج کے برابر اسکی وسیع اراضی تھی۔ کھیت تھے، کھلیان تھے۔ ساری بات سن کے وہ بولا،''میرے پاس نقد تو کچھ نہیں، زمین کافی ہے۔ ایسا کرتے ہیں اس زمین پہ سڑک کنارے دو تین کنال جگہ پر ایک ڈیرہ بناتے ہیں۔ بابا عرفان سے شام سے ہوٹل میں آ کے سوالی جمگھٹا لگاتے ہیں۔ انہیں ہم ادھر بٹھا کے لوگوں کے لیے آسانی کریں گے۔'' انہوں نے آپس میں ساز باز کر لی۔ سستا زمانہ تھا، ڈیرہ بنانے کا سارا معاملہ طے ہو گیا۔ پھر عرفان الحق سے اجازت مانگنے پہنچے۔ عرفان صاحب بولے،''تم لوگوں کی جگہ، تم لوگوں کے پیسے، جو مرضی آئے کرو، مگر یاد رکھو، میرا اس جگہ یا ڈیرے سے کوئی تعلق ہے، نہ ہو گا۔'' وہ ہاتھ جوڑ کے بولے، سرکار آپ شام کو جتنی دیر ہوٹل میں بیٹھ کے لوگوں کے سوال سنتے ہیں، اتنی دیر ادھر آ جایا کیجیئے گا۔'' عرفان صاحب نے کہا،''ٹھیک ہے لیکن ایک مہمان، ایک مسافر اور ایک دوست کی طرح صرف۔ یاد رکھنا، ڈیرے کی ایک انچ جگہ اور ایک اینٹ روڑے پہ بھی میرا کوئی حق نہیں ہو گا۔'' ڈیرہ بن گیا۔

یہ 1996 کی بات ہے۔ شہر کے ڈگری کالج کے برابر سڑک پہ ان دنوں کوئی آبادی نہ تھی۔ لوگ آنے لگے۔ ڈیرے سے کوئی ڈیڑھ کلو میٹر دور عرفان صاحب کا اپنا گھر ہے، پانچ مرلے کا۔ جتنا اس زمانے میں تھا اتنا ہی اب ہے۔ بینک سے ریٹائر ہوئے تو بلا معاوضہ اس ڈیرے کی نوکری پہ آ بیٹھے۔ جمعہ اور منگل کے علاوہ ہر روز شام تین بجے سے رات نو بجے تک کی نوکری۔ لوگ بڑھتے گئے۔ ڈیرے میں بھی وسعت آتی گئی۔

سوال یہ ہے، لوگ کیا سوال لے کے آتے ہیں؟ کیا جواب ملتا ہے! مجھے بڑا تجسس تھا۔ ایک دن خود ہی بولے،''میرے پاس بیٹھ جایا کرو۔'' میں نے بیٹھنا شروع ہو گیا۔

سوالی مجھے دیکھ کے ہچکچانے لگتا، تو کہتے ''اپنا ہی بندہ ہے، آپ بے دھڑک بولیں۔'' وہ بولنے لگتے۔ کسی کی شادی نہیں ہو رہی، کسی کی ہوئی ہوئی ہے مگر جان پہ آ گئی ہے۔ کوئی ساس سے تنگ، کسی نے ساس کو پریشان کیا ہوا ہے۔ کوئی دوبئی جانے کے لیے بے تاب، کسی کو کویت سے ادھر بلوانے کی عرضی۔ کوئی جگر کی بیماری میں مبتلا پیلی آنکھوں والا، کسی کی لال آنکھوں میں خون کا ابلتا فشار۔ کوئی جوڑوں کے درد سے ٹیڑھا ہوا، کسی کی گردن میں پڑا سریا اسے جھکنے نہیں دیتا۔ کسی کو غصے پہ قابو نہیں، کوئی سارا کاروبار، یاری دوستی میں اڑا گیا، نوکری کے لیے مارا مارا آتا، کسی کو ساتویں کارخارنے کی بنیادیں رکھنے کی جلدی، کوئی کروڑوں کا مالک مگر نیند کا محتاج۔ کسی کی بڑے بڑے صدموں سے آنکھیں پلٹی ہوئی، کوئی مدہوش آنکھیں لیے خوشیوں کا متلاشی۔

عرفان صاحب کے ساتھ بیٹھ کے مجھے دنیا کے دکھوں کی سمجھ آنے لگی۔ وہ جو ظاہری شان و شوکت اور کھڑکتی ٹین بھرے چہرے سجائے دنیا بھر میں اکڑتے پھرتے، انکے سامنے آ کے پھٹی بوری کی طرح ڈھیر ہو جاتے، ریزہ ریزہ ہو جاتے، کسی کو اولاد کے نہ ہونے کا غم اور کوئی اولاد کی گستاخیوں سے دکھی۔ کوئی کاروبار میں نقصان کا واویلا کرتا، کوئی سونا چاندی پہن کے بلبلاتا کہ جسم میں کینسر پل رہا ہے۔ اب ان سب سوالوں کے جواب میں عرفان صاحب کیا کرتے۔ کسی نے کہا، ''بلڈ پریشر بڑھا ہوا ہے'' بولے، ''تین اخروٹ روزانہ اور ساتھ یہ وِرد۔'' ایک بولا ''کینسر ہے۔'' بولے، ''مہندی کا پاؤڈر ایک چمچ صبح ایک شام، ساتھ یہ قرانی آیت۔'' پیٹ پکڑ کے کوئی آتا، کہتے، ''پودینے کی چٹنی، مرچ کے بغیر اور ساتھ یہ وظیفہ پڑھنا'' ذہنی اور نفسیاتی مسائل پہ بھی اسی طرح کے سیدھے سادھے ٹوٹکے۔

لوگ آ آ کے کہتے، ''سرکار! آپ کی دعا سے اب بیٹا نافرمانی نہیں کرتا'' کوئی آ کے ہاتھ چومنے کو بڑھتا، یہ ہاتھ کھینچ لیتے، وہ کہتا ''جناب نوکری مل گئی۔'' کوئی ساس کہتی ''بابا جی، بہو اب بدتمیزی نہیں کرتی۔'' کوئی بہو آ کے مسکرانے لگتی، ''بابا جی، آپ کی دعا سے ساس تو ماں بن گئی۔''

میرا ان کے ساتھ بیٹھنے کا تجربہ حیران کن تھا۔ میں ان کا کہا علاج بھی سنتا۔ علاج کے بعد لوگوں سے فیڈ بیک بھی۔ میرے اندر ہل چل مچ گئی۔ میں جدید علوم کا پڑھا لکھا، ایم بی بی ایس ڈاکٹر، ستائیں کتابوں کا مصنف، دنیا کا اکثر علم پڑھا، پوری دنیا گھومی۔ میرا سر چکرا گیا۔ یہ بابا کیا جادوگر ہے۔ کون اسے پڑھاتا ہے۔ کون اسے بتاتا ہے، لوگ کیا سارے پاگل ہیں۔ صبح دس بجے آ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ تین بجے قطار ہلتی ہے۔ عقل کیسے مانے۔ وہ بھی ایک ایسے بندے کی جسے اپنی عقل پہ ناز ہو۔ میں نے سوچ لیا، بابا کے بھید کھولوں گا۔

جب یہ کرسی پہ بیٹھے، سائلوں کی باتیں سنتے، تو بات چیت کی گنجائش نہ رہتی۔ اکیلے ہوتے تو میں جان نہ چھوڑتا۔ سوال پہ سوال۔ ایک دن پوچھ لیا، ''سرکار! یہ جو آپ پھل پھول سبزیوں اور جڑی بوٹیوں سے علاج تجویز کرتے ہیں، کیا حکمت پڑھی ہے؟ بولے، ''توبہ کر، میری سات پشتوں میں کوئی حکیم نہیں ہوا''...... ''پھر آپ کیسے فر فر بول دیتے ہیں، یہ کھاؤ یہ نہ کھاؤ'' کہتے، ''جو لکھا نظر آتا ہے، وہ بول دیتا ہوں۔'' ''آپ کو لکھا لکھایا نظر آتا ہے؟'' کہنے لگے ''کبھی آتا ہے، کبھی اسکا خیال دل میں۔'' پوچھا ''آپ مریض دیکھ کے مرض کی تشخیص بھی کرتے ہیں، کبھی ڈاکٹری پڑھی؟'' بولے، ''ڈاکٹر تو تم ہو، کوئی غلط تشخیص دیکھی ہو تو کہو۔''

''یہی تو حیرانی ہے، تشخیص بھی سولہ آنے سہی، یہ بتاتا کون ہے؟

بولے،''وہی، کبھی لکھا نظر آیا، کبھی دل میں اترا۔

میں سوچنے لگا یہ تو انٹرنیٹ پہ بیٹھے ہیں جیسے گوگل کھول کے کوئی سوال لکھے، نیچے جواب آ تا ہے۔ یہ تو ہم کمزور انسانوں کے بنائے ہوئے عجوبے ہیں۔ بابا عرفان، خدا جانے کونسی ویب سائٹ کھول کے بیٹھے ہوتے ہیں۔ پوچھا،''کیا کوئی اسم اعظم ہے، آپ کے پاس؟''بولے،''تمہیں پوچھ کے کیا لینا؟''میں نے عرض کیا''تجسس ہے۔''بولے،''اسم اعظم، ہر ایک کے لیے الگ۔''

''آپ کے لیے؟''

شاید ہو۔کیا؟

پرانی بات ہے، بچپن میں کوٹ مومن کے مروڑ والا کے رہنے والے صوفی ابراہیم نے ایک ورد بتایا تھا۔ کیا تھا؟''اللہ الصمد''۔میں نے کہا''پوری کہانی کہیں، سرکار۔میں چھوڑنے والا تھوڑی ہوں۔بولے،''دیکھ، میں نے ساری عمر بینک کی نوکری کی ہے، تیرہ بینک برانچوں کا مینجر رہا۔ بینک کی دنیا میں کامیاب مینجر سمجھا گیا۔سب کامن سنس کے اصول اپنائے۔وقت سے آدھا گھنٹہ پہلے دفتر جانا۔ ذاتی کام، اخبار پڑھنا سب بینک کے اوقات سے پہلے یا بعد۔روز کا کام روز۔اگلے دن پہ کبھی نہ ٹالا۔جو خط آیا، ساتھ ہی جواب لکھ دیا۔ بینک کے جتنے کلائنٹ ہوتے انکی فہرست میز پہ۔روزانہ میں سے دس بارہ کو فون کر کے حال احوال معلوم کرتا۔انکی خوشی غمی میں شامل ہوتا۔ کوئی دعوت نامہ آیا، گیا تو ٹھیک نہ گیا تو شکریہ کا خط۔''

''سرکار، بات کا رخ نہ موڑیں۔''

''کیوں؟''''یہ تو سب وہ چیزیں ہیں جن کے دم سے آج مغرب مشرق سے کئی صدیاں آگے ہے۔''

''مگر سرکار، میں وہ سوال پوچھ رہا ہوں جن کی وجہ سے آپ جیسے مشرقی بابوں نے مغرب کو کئی صدیاں پیچھے چھوڑ دیا ہے۔''''کیا مطلب؟''''یہ جو آپ بیماروں، بے چاروں، دکھیوں کے دکھ سن کے بغیر مہنگی انوسٹی گیشن کی ٹکٹکی پہ باندھے سیدھے سادھے اور سستے طریقے سے شفا دیتے ہیں، انہیں انکے دکھوں سے نکال لاتے ہیں، یہ کیسے؟

بولے،''اس میں میرا کوئی کمال نہیں، یہ اسکا کام ہے۔''

''کیسے؟ سوالی تو آپ کے پاس آتا ہے۔''بولے،''جسے اللہ نے شفا کے لیے چن لیا ہو انہیں شاید میری طرف بھیج دیتا ہے۔ میرا کوئی چمکتار نہیں۔وہ سارے رستے خود دکھاتا ہے۔بیماری اور الجھن ختم ہوگئی پھر بھی اسکے اندر اسکا ذکر نہیں مرتا۔ملا رخ نہیں ٹلتا۔یہ تو اسکا کھیل ہے۔جسے وہ اپنانا چاہتا ہے، اسے کسی مٹے ہوئے مجھ سے فقیر کے پاس بھیج دیتا ہے۔اپنا لیتا ہے۔یہ سب اسکا کرتب ہے۔میں تو ڈھکوسلا ہوں۔''میں نے بات آگے بڑھائی۔مگر سرکار، یہ ڈھکوسلا ملا کیسے؟ بولے،''تم جان نہیں چھوڑو گے۔''

''تو سنو!''گھر میں ہم سات بہن بھائی تھے۔چار بھائی، تین بہنیں۔میں سب سے بڑا۔14 اگست 1946 کو نجیب آباد، بجنور، یوپی میں پیدا ہوا۔دادا تمہاری طرح ادیب آدمی تھے۔دو ناول بھی انہوں نے لکھے۔خان بہادر کا خطاب ملا۔حویلی انہوں نے بنائی۔گھر میں کتابیں رکھیں۔انوار الحق نام تھا ان کا۔پاکستان بنا، سارا کنبہ ادھر رہا، جدھر حویلی تھی، مگر میرے ابا احسان الحق حویلی چھوڑ کے

ہمیں ادھر لے آئے۔ ادھر جہلم میں ٹھہر گئے۔ فوج کے ٹھیکہ دار تھے۔ علم و گیان سے دلچسپی تھی۔ شام کو گھر میں علم کے متلاشی بوند بوند علم لینے پہنچ جاتے۔ مگر ابا کو اللہ نے عمر زیادہ نہ دی۔ میں اٹھارہ سال کا ہوا تو وہ فوت ہو گئے۔ گھر میں سات بہن بھائیوں کا میں اکیلا کفیل رہ گیا۔ تعلیم بھی ادھوری تھی۔ کام شروع کیا۔ جو کماتا، لا کے ماں کو دیتا۔ ماں محبت میں میری پیالی میں گھی زیادہ ڈالنے کی کوشش کرتی۔ میں یوں کرتا، جب تک سب بہن بھائی کھانہ لیتے لقمہ نہ توڑتا۔ بس اس احساس ذمہ داری نے مجھے وقت سے پہلے وقت کی عقل دے دی۔ میں سامنے پڑے پھل، ہانڈی میں پڑی بوٹیاں اور دستر خوان پہ پڑی چیزیں گن کے طے کر لیتا کہ میرا کھانے کے لیے نمبر آخری ہے۔ میں نے پہلا سبق یہ سیکھا کہ اپنے حق سے کم لینا ہے۔ پھر ماں تو ہر وقت خدمت میں لگی رہتی تھی۔ مگر مجھے اس وقت تک ماں کی خدمت کرنا نہ آئی تھی۔ ایک رات بھائی نے مجھے جھنجوڑ کے جگایا کہ ماں ساتھ لیٹی درد سے کراہ رہی ہے، تم سو رہے ہو۔ میں اٹھا، ماں کے لیے دوا دارو کیا۔ ماں تو اللہ نے ٹھیک کر دی، لیکن باقی کی ساری عمر ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آیا کہ ماں نے چھینک ماری ہو اور میں پاس نہ کھڑا ہوں۔ شاید ماں کی کوئی دعا کام دے گئی۔ والد کی وفات کے بعد رشتے دار انڈیا سے کیسے ادھر پر سادینے آتے۔ ماں اور بہن بھائی غم سانجھا کرنے کے لیے انڈیا چلے گئے۔ میں پیچھے گھر میں اکیلا تھا۔ اٹھارہ سال کی عمر۔ سردیوں کے دن، یتیم اور بے آسرا۔ لحاف میں لیٹا روتا رہتا۔ مجھے عبادت کرنا نہ آتی تھی۔ رونا آتا تھا۔ دن کو باپ کی قبر پہ جا کے روتا، رات کو لحاف میں منہ دے کے روتا۔ بس جو بات لبوں سے نہ ہو سکی شاید آنسوؤں نے کر دی۔ ایک رات جاگ رہا تھا، کمرے میں اچانک تیز روشنی ہو گئی۔ جیسے کوئی بڑا سا جلتا ہنڈا اٹھا کے آ گیا اور بولا ''سیدھے ہو کے بیٹھ جاؤ، سرکار تشریف لاتے ہیں۔'' میں اٹھ کے بیٹھ گیا، بیٹھا کھڑا ہو گیا۔

''کن کی آمد تھی؟'' بولے ''حضرت غوث پاکؒ تشریف لائے تھے۔'' میں نے پوچھا ''کچھ کہا سرکار نے؟''

''باتیں تو کئی کیں، مگر ایک خوش خبری عجیب تھی۔'' سرکار غوث پاکؒ نے فرمایا، ایک وقت آئے گا، جب ایک زمانہ تم سے سیراب ہوگا۔'' میری حیرت بڑھی۔ ''تو وہ آپ کو دریا بنا گئے۔''

''یار، میں کچھ نہیں بنا، مجھے نہ بناؤ، بگاڑو۔'' پوچھا ''سرکار یہ مریضوں کے علاج کا علم بھی انہیں سے عطا ہوا۔'' بولے ''یہ سرکار بابا فریدؒ کی عطا ہے۔''

سوال کیا، ''آپ جو اکثر کھڑی شریف جایا کرتے تھے، ادھر سے کیا لائے؟'' بولے ''کبھی کسی سوال کے جواب میں تاخیر ہو جاتی تو ادھر حاضری دیتا۔ سوال کا جواب آناً فاناً آ تا۔

صابر پیاؒ سے کیا لائے؟..... فرمایا ''صبر۔'' میں نے نقطہ لگایا۔'' اور جلال بھی؟'' بولے ''جلال میرے آقا غوث پاکؒ نے جمال کر دیا۔ جلال اور جمال دونوں کا فہم دے دیا۔'' اور کدھر کدھر جاتے رہے؟ فرمایا ہر جگہ گیا۔ علی ہجویریؒ سے علم لیا، اقبالؒ کی پراندی بیٹھا۔ میاں میرؒ سے خصوصی تعلق رہا۔ دہلی کے قطب صاحبؒ اور نظام الدین اولیاءؒ کے ہاں بھی حاضر ہوتا رہا۔ سب دیالو بابے ہیں، خالی ہاتھ نہ لوٹاتے۔

ادھر محفل میں ایک عقلی آدمی بیٹھا تھا۔ عقلی آدمی کی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنی عقل کو ملکہ برطانیہ سمجھتا ہے۔ وہ ملکہ جو کبھی پوری دنیا پہ

راج کیا کرتی تھی۔ وہ کیسے گیان وجدان اور عرفان کی ریاستوں کو توجہ دے۔ وہ سمجھتا ہے اسکی جیب میں کھرے ملکہ کی تصویر والے عقلی پاؤنڈ ہیں۔ امریکی کھڑکتے ڈالر ہیں۔ خالص مہکتے سعودی ریال ہیں۔ وہ دل اور احترم کی باتوں کو ریز گاری سمجھ کے ہاتھ نہیں لگاتا۔ تھوڑی دیر تک وہ عقلی آدمی عرفان صاحب کو تشکیک سے تکتا رہا پھر بولا ''عرفان صاحب، جو بزرگ پردہ فرما گئے، دنیا سے چلے گئے۔ ان کا تصرف ادھر کدھر باقی؟ عرفان صاحب کے چہرے پہ صابر پیاؒ کا چہرہ آ گیا۔ بولے ''ایک واقعہ سن لو۔ پہلے جا کے تصدیق کرنا، پھر آ کے بات۔ اسی شہر کا فلاں بندہ ہے۔ فلاں محلّہ۔ اسکا بیٹا ادھر جہلم میں ڈوب گیا۔ وہ مارا مارا پھرے۔ کہے بیٹا تو ڈوب گیا، اسکی لاش ہی مل جائے۔ میرے پاس آیا۔ میں نے کاغذ پہ کچھ لکھ کے اسے دیا کہ دریا میں ڈال دو۔ وہ کاغذ دریا میں ڈال آیا۔ بچہ پھر بھی نہ ملا۔'' آپ نے کاغذ پہ لکھا کیا تھا؟'' وہ میری طرف دیکھ کے کچھ ہچکچائے پھر بولے، ایک فقرہ لکھا تھا۔

''جہلم دریا اس بندے کا بیٹا واپس کر دو''۔

''دریا نے پھر بات مانی؟''

''نہیں، مگر مجھے بچہ دکھا دیا۔ دیکھا کہ بچہ دریا کی تہہ میں اُگی جھاڑیوں میں الجھا ہوا ہے اور اسکے گلے میں پہنی مالا کا کنٹھا ایک ٹہنی میں پھنسا ہے۔ اس وقت ایک اشارہ بھی مل گیا کہ فلاں بزرگ کے مزار پہ جاؤ۔ گیا۔ کہا ''حضور، اس بچے کی لاش دریا سے لینی ہے۔ اس کے گلے کا ہار جھاڑیوں سے نکال دیں۔'' اگلے دن لاش دریا کی سطح پہ تھی۔

بولے، ''دیکھ، تصرف اور طاقت پہ صرف خدا کی بادشاہی ہے۔ جسے چاہے جتنا مرضی حصہ دے دے۔

اسکے سامنے ہم جیسے زندہ ویسے مرے۔ ادھر دونوں حیثیتوں میں موجود۔ ہماری روحیں، زندہ ہو یا مرے ہو، دست بدستہ اسکے ہر حکم کی پابند۔ یہ تم ہم لوگوں نے اپنے جسموں میں مغالطے پالے ہوئے ہیں۔ موج کریں، مانیں نہ مانیں۔ میرا مقصد کسی کو منوانا نہیں۔ میں تو اس تھوڑی سی خدمت کے لیے ہوں، جس کی اجازت ملی ہوئی ہے۔

عرفان صاحب کے ساتھ برسوں کی دوستی ہے، پہلی ملاقات پہ بھی انہوں نے کسی خاتون سے کہہ کے مجھے بلوایا تھا۔ رفتہ رفتہ محبت بڑھتی گئی۔ اب کچھ دن ان سے ملاقات نہ ہو تو ایک نشئی کی طرح جسم میں نشہ ٹوٹنے کی علامات ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ کئی دکھ اور وسوسے تو انہیں دیکھ کے دور ہو جاتے ہیں۔ درمیانہ قد، قدرے بھاری جسم، چہرے پہ سفید گھنی داڑھی میں کچھ کالے سیاہ بال، آنکھوں میں بچوں جیسی معصوم چمک اور ٹھہر ٹھہر کے دھیمی آواز میں بولنے کا انداز۔

اشفاق احمد صاحب اپنی زندگی کے آخری دنوں میں لاہور سے جہلم خاص طور پہ بابا عرفان الحق سے ملنے آیا کرتے تھے۔ وہ اشفاق احمد جن سے بہتر علمی اور دانش بھری گفتگو کرنے والا آدمی پچھلے سو سال میں پیدا نہیں ہوا وہ چپ چاپ ٹکٹکی لگا کے گھنٹوں عرفان صاحب کو دیکھتے اور سنتے رہتے۔ ''ممتاز مفتی اور اشفاق احمد کے بعد میری زندگی میں انسانی معراج کا بہترین مشاہدہ عرفان الحق ہیں۔ کسی کو مجھ سے لاکھ اختلاف ہو، مگر وہ یہ کبھی نہ کہہ سکے گا کہ میں نے کبھی کسی کے لیے ناجائز قصیدہ لکھا۔ انکا کمال یہ ہے کہ ان سے کسی بھی موضوع پہ کوئی سوال، کوئی بھی نکتہ پوچھ لیں، عین دولفظی کھرا جواب آئے گا جو قرآن، حدیث، سیرت پاک، کامن سنس اور تمام تر انسانی علوم کی ہر پرکھ سے پرکھا جا سکے۔ بلکہ اکثر وہ جوابات بھی ہوتے ہیں، جہاں انسانی پرکھ کو پہنچنے میں ابھی شاید کچھ صدیاں اور لگیں۔''

انکی گفتگو جو چھوٹی سی دوستوں کی منڈلی میں شروع ہوئی تھی اب ایک ملک گیر بلکہ عالمی پنڈال میں بدل گئی ہے۔شروع میں جنہیں فرد فرد بندے کی انگلی پکڑنے کی ذمہ داری ملی تھی، لگتا ہے انکے ہاتھ میں ہجوم کا ہاتھ دے دیا گیا ہے کہ وہ انہیں لوہے سے مقناطیس بنائیں، بے ترتیبوں کو کوئی ترتیب دیں۔سماجی، معاشی، معاشرتی، ملکی، عالمی اور مذہبی تمام ترباتوں پہ مرتب ہونے والی انکی کتابوں کی تعداد اب درجنوں میں ہے۔اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی انکے تراجم چھپے ہیں۔مگر عرفان صاحب کی ذات میں تکبر نہیں۔انہوں نے عہد حاضر کے دوسرے مذہبی رسہ گیروں کی طرح اپنے سننے اور ملنے والوں میں طبقاتی درجہ بندی روانہیں رکھی۔اشرافیہ الگ نہیں بیٹھتی نہ بڑی کار پہ آنے والے کا نمبر پہلے۔نہ اونچے رینک نہ اہم پوزیشن کے بندے کے لیے کوئی خصوصی نشست یا برتاؤ۔ڈیرے پہ ایک سفید بورڈ لگا ہے۔جو بندہ آتا ہے وہ اپنے ہاتھ سے نمبر شمار کے ساتھ اپنا نام لکھ کے انتظار گاہ میں بیٹھ جاتا ہے اور ملاقات کے بعد اپنا نام خود کاٹ دیتا ہے۔انکے سامنے نہ کوئی اونچا نہ کوئی نیچا۔نہ انہوں نے پلازے بنائے نہ پورا محلّہ خریدا۔نہ پٹرول پمپ چلائے۔نہ جرنیلوں اور سیاستدانوں سے یاریاں گانٹھیں۔نہ کہیں بکے، نہ کسی کو خریدا۔جو سچ دل میں آیا وہ ڈنکے کی چوٹ پہ منہ پہ کہا۔

عرفان صاحب کسی مسلک کسی فرقے کی بات نہیں کرتے انکا اللہ تمام انسانوں کا خدا ہے۔وہ آفاقی سچائیوں کا وہ حسن کمال ہیں جنہیں ہر مذہب ہر دور میں پذیرائی دے گا۔وہ اس عہد میں انسانیت کی کندہوئی قدروں کے ایسے ترجمان ہیں جن کی نظیر شاید اس عہد میں کوئی اور نہ ہو۔کوئی بھی کسوٹی لے کے کوئی پرکھ لے، وہ عین چوبیس قیراط کا سونا ہے جس میں ذرہ بھر ذات کے منافع کی کھوٹ نہیں۔پوری دنیا میں انکے نام پہ حق ملکیت کی کوئی چیز نہیں۔نہ اپنا پانچ مرلے کا گھر، نہ کوئی پلاٹ نہ کہیں زمین۔کہنے کو لاکھوں لوگ انکے عقیدت مند ہیں۔ ایک دفعہ میں محبت سے انکے لیے کچھ خربوزے لے گیا۔انکے چہرے پہ اس قدر تکلیف کی لکیریں ہلیں کہ میں ڈر گیا، لفافے میں پڑے خربوزے تک خوف سے چیخ گئے۔انکی مصروفیات بہت ہیں۔گھر میں اپنے غسلخانوں کی صفائی، گھر والوں کے جاگنے سے پہلے یہ اپنے ہاتھ سے کرتے ہیں۔ان ہاتھوں سے جنہیں شام کو لوگ چومنے کو ترستے ہیں۔گھر کا سودا سلف خود لاتے ہیں۔اپنی زندگی کا ایک وقت انہوں نے اپنی فیملی کے لئے رکھا ہے۔قائدؒ کے تینوں اصول، ایمان، اتحاد، تنظیم انکی زندگی کا نصب العین ہیں۔اقبالؒ انکی سوچوں کا رخ متعین کرتا ہے۔اور پاکستان کی محبت انکے لہو کا چلن ہے۔انکی زندگی کا سارا فلسفہ بہت سیدھا سادھا مفاد عامہ پہ مبنی اور عین عملی ہے۔

دوستوں سے اکثر کہا کرتے ہیں، کہ بلاوجہ نہ محبت کے دکھاوے دکھائیں۔کم آئیں، بلاضرورت نہ بیٹھیں۔کم سوئیں، کم کھائیں اور زیادہ خدمت۔سلطان باہوؒ کا ایک مصرعہ انکی اندر کا چلن ہے۔"جودم غافل سودم کافر۔"

مجھے یاد ہے، صوفی برکت علی لدھیانویؒ نے ایک بار قسم کھا کے کہا تھا کہ خدا کی قسم، میرے پاس خدا کے سوا کچھ نہیں۔میں بھی یہ تصدیق کرتا ہوں کہ بابا عرفان الحق کے پاس خدا کی قسم، خدا کے سواء کچھ نہیں۔لیکن ہیں وہ اتنے دیالو کہ جو سائل آئے وہ اسے اپنا واحد اثاثہ، اپنا رب بھی سونپ دیتے ہیں۔

◆◆◆

کام و نمود سے تو رہے بے نیاز ہم گم نامیوں میں ڈوب کے شہرت تلاش کی (اظہر جاوید)

میرے مُرشد اشفاق احمد

اظہر جاوید

میں یہ تو نہیں کہتا کہ اشفاق احمد کا میں سب سے قریبی نیاز مند تھا، مگر مجھے یہ ایمان کی حد تک یقین ہے کہ وہ اپنی شفقت بھری فطرت کے تحت جہاں ساری دُنیا میں مسرتیں تقسیم کرتے تھے، وہیں مجھ سے بھی بے انتہا حُسنِ سلوک رکھتے تھے۔ وہ کتنے ہی مصروف کیوں نہ ہوں، کیسا ہی وقت ہو، میں فون کرتا تو وہ ضرور سُنتے تھے، بغیر طے کئے ملاقات کے لئے چلا جاتا، تو کُھلے دِل سے ملتے تھے۔ ایک ہجوم تھا، جو میری ''سفارش'' پر اُن سے ملاقات کا متمنی رہتا تھا، اور اپنی گونا گوں مصروفیات کے باوجود اُنہوں نے کبھی انکار نہیں کیا تھا۔

میں بانو آپا کا ذکر نہیں کرتا...... اُنہوں نے تو ممتا کی ایک چادر اوڑھ رکھی ہے کہ شفقت اور برکت بانٹتی رہیں، بانٹتی رہیں، پھر بھی سمندر کی طرح خالی نہیں ہوتیں۔ اُن کا مجھ سے تعلق کا رشتہ شاید اشفاق صاحب سے بھی گہرا ہو —— نہیں، میں غلط کہہ رہا ہوں۔ شفقت اور عنایت کو کسی پیمانے سے ناپا نہیں جا سکتا۔ میں ایک گہری شام کو ''داستان سرائے'' پر گیا۔ اشفاق صاحب اپنے حلقہ بگوشوں میں گھرے ہوئے تھے، بانو آپا توے پر روٹی ڈالنے والی تھیں۔ میرا نام سُنا، تو اُسی طرح، پیڑے کو روٹی کی شکل دیتے ہوئے، باہر کے دروازے پر آ گئیں۔

''بیٹا جی —— اندر آ جائیں —— خان صاحب، مصروف ہیں۔ مگر تمہارے لیے نہیں۔ میں روٹی پکا رہی ہوں۔ شاید تمہارے حصے کی بھی کوئی ہو، کھانا بھی کھا کر جانا—— ''

یہ عجیب گھرانا تھا، یوں کہ اب اشفاق صاحب کے بعد وہاں گفتگو کی حرارت، علم کی تمازت اور بے ساختہ شفقت بھی اُدھوری رہ گئی ہے۔ بانو آپا کی سفید اوڑھنی اور سفید سر، اب لوگوں کے دِلوں میں دکھوں کی سیاہی کو یا اکیلے ہی شانت کرتے رہیں گے۔

سالہا سال بیت گئے۔ اشفاق احمد ''داستان گو'' نکالتے تھے اور مال روڈ پر ایک ڈربے قسم کے دفتر میں صبح سے شام کرتے تھے، پھر جب ''لیل ونہار'' کے مدیر ہو گئے۔ اور سمن آباد میں رہنے لگے اور اب ''داستان سرائے'' میں قیام کے عرصے کو کم و بیش چار دہائیاں تو گزر گئی ہیں۔ کبھی اُن سے بہت ملاقاتیں رہیں، کبھی وقفہ بڑھ جاتا رہا۔ مگر ان سے جب بھی ملا، سامنے وہی کھلکھلاتا چہرہ —— کوئی محبت بھرا جملہ اور پھر آسانیاں تقسیم کرتے ہوئے جُدا ہو جانا ——

اُنہیں ''تخلیق'' سے بھی خاص تعلق تھا (بانو آپا کی طرح) کچھ برس پہلے جب اُنہوں نے کشمیر کے حریت پسندوں کے موضوع پر ایک کہانی لکھی اور اس میں بین السطور، کہانی کے کردار سے یہ سوال کروایا کہ پاکستانی ادیب اس موضوع پر کیوں نہیں لکھتے......؟ وہ کہانی اُنہوں نے خصوصیت سے ''تخلیق'' کو دی۔ پھر اُن کی وہ تجرباتی کہانیاں جنہیں اُنہوں نے اور مرحوم ستار طاہر نے سائنس فکشن کا نام دیا تھا، اُس سلسلے کی بھی پہلی کہانی ''تخلیق'' ہی میں چھپی...... صدیقہ بیگم سے اشفاق احمد اور بانو آپا کی دوہری رشتہ داری ہی نہیں، گہری دوستی بھی

ہے، مگر جب اشفاق صاحب کی کوئی نئی تخلیق یا بانو آپا کا کوئی افسانہ 'تخلیق' میں چھپتا، تو صدیقہ بڑے پیار اور تھوڑے حسد سے کہتی ——
''ٹھیک ہے بھئی، تو اُن کا زیادہ چھپتا ہے —— !

حیرت کی بات ہے پچھلے تین چار دنوں سے یونس جاوید مجھے بار بار کہہ رہے تھے کہ چلو یار، اشفاق احمد صاحب کو دیکھ آئیں۔ جب پچھلے برس وہ اس مرض الموت کے پہلے حملے کی زد میں آئے تھے، اور ہسپتال میں ایک بڑے آپریشن کے بعد وہ ڈاکٹروں کے بقول، نئی زندگی لے چکے تھے، تو میں، یونس جاوید کے ساتھ ہسپتال میں جانے والوں میں سے پہلے لوگوں میں تھا۔ ڈاکٹر اُن سے ملنے کی اجازت نہیں دیتے تھے، اور بانو آپا کمرے سے باہر نکل کر لوگوں کو بیماری کا احوال بتاتیں اور دُعاؤں کے لیے کہتیں —— میرے لیے ہسپتال کے کمرے کا دروازہ بھی بند نہیں ہُوا تھا، اور میں اور یونس جاوید دیر تک اُن کے ساتھ رہے۔

اب یونس جاوید عجیب بے تابی سے مجھے اُن کے پاس جانے کو کہہ رہا تھا۔ مجھے پتا چلا تھا کہ اشفاق صاحب کو کم لوگوں سے ملنے دیا جاتا ہے تا کہ وہ بے آرام نہ ہوں —— یونس جاوید کو پتا تھا، میرے لئے کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔ میں احتیاطاً بانو آپا کو فون کر لینا چاہتا تھا۔ ہفتے کی شام پانچ بجے سے لے کر سات بجے تک میں مسلسل فون کرتا رہا۔ اُن کا فون شاید خراب تھا یا ریسیور کریڈل سے ہٹا دیا گیا تھا۔ جب ثویلہ اور انیس اُسی گھر میں اوپر والی منزل میں رہتے تھے، تو میں ثویلہ کو فون کر کے پیغام پہنچا دیتا تھا۔ پرسوں میں سوچتا رہا، اب تو پیغام کا یہ سلسلہ بھی نہیں رہا۔ دوسرے دن اتوار تھا، سوموار کو یونس جاوید کا اضطراب ویسا ہی تھا۔ میں نے کہا، اچھا یار، کل کسی وقت ویسے ہی چلے جائیں گے۔ کچھ نہیں تو بانو آپا سے ملاقات تو ہو ہی جائے گی۔

کل آ گئی —— ہم گئے بھی —— مگر کس الم ناک انداز میں اور کس بے بسی کے ماحول میں! جنازے میں شریک ہوتے ہوئے تو یہی ہُوک اُٹھتی رہی کہ ہم ایسے کتنے ہی دھرتی کا بوجھ بنے پھرتے ہیں، اور وہ شخص، جو سراپا شفقت، جو برگد کی طرح چھاؤں دینے والا اور آسانیاں تقسیم کرنے والا تھا، جس کی اس بے مہر اور ریا کار زمانے میں ابھی اور بہت ضرورت تھی، آج اُس کا جنازہ اُٹھ رہا ہے۔ ہم مجبور لوگ تقدیر کے معاملات کو کب سمجھ سکتے ہیں، اور جو سمجھانے والے تھے، وہ بھی قضا ہم سے چھینے لیے جا رہی ہے۔ کیا یونس جاوید کو کوئی غیبی جذبہ اُکسا رہا تھا اور کیا اُن سے ملاقات اسی روز ہونی تھی۔ ملاقات نہیں، یونس جاوید نے کہا تھا، اشفاق صاحب کو دیکھ آئیں تو ہم دیکھنے ہی تو آئے تھے۔ دِل لاکھ حیلے بنائے، ذہن سو طرح کے جواب دے، مگر کہانی تو ختم ہوگئی۔ داستان گو، تو داستان کہتے کہتے سو گیا ہے۔

یہ دو چار برس کی بات ہے۔ دبئی میں جمیل الدین عالیؔ کو اے آر وائی ایوارڈ ملنا تھا۔ وہاں جو جشن کے انداز میں تقریب ہونا تھی اُس کے لیے مجھے کراچی سے محمود شام کا فون آیا کہ صدارت کے لئے اشفاق احمد صاحب کو لے جانا ہے —— اور میں نے یوں ہامی بھر لی، جیسے اشفاق صاحب کی تصویر لانی ہو یا کوئی دو سطری پیغام لکھوانا ہو۔ میں نے اشفاق احمد صاحب کو فون کیا، میری بات سُن کر کہا۔

''تو نے وعدہ کر لیا ہے—— ؟'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔'' کاکا، توں بڑا ڈاہڈا ایں۔ اچھا دَس کدوں جانا اے—— ؟''
محمود شام نے کہا تھا اگر بانو آپا بھی جانا چاہیں، تو اُن کو بھی ہمراہ لے لینا۔ مجھے پتا تھا اُن دنوں بانو آپا ذرا ماندی تھیں۔ میں خود ہی ہچکچا گیا، ورنہ مجھے یقین ہے وہ بھی انکار نہ کرتیں۔

اشفاق صاحب اور میں پہلے کراچی گئے۔ جمیل الدین عالی ہی کے مہمان بنے اور اگلے روز یہ قافلہ دبئی روانہ ہو گیا۔ اسی سفر کے دوران اور رات کراچی میں عالی جی کے گھر ٹھہرنے پر مجھے اندازہ ہوا کہ اشفاق صاحب اور عالی جی کا بہت، بہت پرانا تعلق ہے اور خاصی

بے تکلفی بھی ہے۔تقریب سے پہلے بھی اشفاق صاحب، عالی جی پر ہلکے پھلکے جملے اُچھالتے رہے، عالی جی کبھی کندھے سکوڑتے ، اپنی عادت کے مطابق ناک پر اُنگلی پھیرتے اور پھر کہتے"خان صاحب ذرا احتیاط کرنا، پرانی باتوں کو کریدنا نہیں......"

دبئی میں ہم دو راتیں اور دو دن اکٹھے رہے —— یوں لگتا تھا پورا دبئی بھی اشفاق صاحب کے سحر میں گرفتار ہے۔ہوٹل میں اگرچہ ہمارے کمرے الگ الگ تھے،مگر صبح ناشتے پر اگر مجھے ذرا دیر ہو جاتی تو ان کا فون آ جاتا۔

"آ جا، ناں......کیہ کرر ہیا ایں......"

میں بروٹ پرفیوم استعمال کرتا ہوں۔اُن کے کمرے میں گیا، تو اُنہوں نے فوراً کہا......"واہ واہ، یار جوانی میں مَیں بھی بروٹ استعمال کرتا تھا۔میں اپنے کمرے میں واپس گیا......شیشی پکڑی اور خان صاحب کے کپڑوں پر بھی "شاور" کر دیا۔قطر سے معیب الرحمٰن اُن کی کشش میں کھنچ کر دبئی آ گئے تھے۔معیب الرحمٰن مجھے اکثر بروٹ دیتے رہے ہیں،مگر ناک بھوں چڑھا کر۔وہ خود بھی قیمتی پرفیوم استعمال کرتے ہیں، اور مجھے بھی ویسی مہنگی خوشبو دینا چاہتے ہیں، میں اپنی روایت پر قائم رہتا ہوں۔معیب الرحمٰن آئے تو میں نے اُنہیں اشفاق صاحب کی پسندیدگی کا بتایا۔اُس نے اپنے لاہوری انداز میں مجھے ٹوکا۔

"چھڈ یاوی کرو،تُسی کیہ بروٹ بروٹ کردے رہندے او۔" اشفاق صاحب نے بات اُچک لی اور بڑی آہستگی سے کہا۔

"معیب صاحب، بروٹ دی خوشبو اِی وکھری تے نرالی اے۔" اور پھر جب معیب ہمیں باہر گھمانے کے لیے لے گئے تو اُنہوں نے خصوصیت سے اشفاق صاحب کے لیے بھی بروٹ خریدا۔

اشفاق صاحب بھرم رکھنا جانتے تھے۔چاہے اُنہیں اس خوشبو سے واقعی زیادہ وابستگی نہ ہو،مگر اُنہوں نے مجھے شرمندہ نہیں ہونے دیا۔جب کبھی اُن سے ملاقات کی بات ہوتی، تو وہ اس بات پر زور دیتے کہ میں نے اُدھر پبلک لائبریری میں آنا ہے،تمہارے پاس بھی آ جاؤں گا مگر تم دفتر میں بہت دیر سے آتے ہو......میں کچھ فخر سے اور کچھ ندامت میں کہتا"آپ بتا دیں، میں جلدی آ جاؤں گا"

"نہیں کا کا، میرا تے اینویں پروگرام بن جاندا اے۔توں کھیچل نہ کریں۔"

ایک روز گرمیوں میں دفتر میں آئے۔"تخلیق" کا یہ دفتر، ایک پرانی طرز کی عمارت میں ہے، جن کی چھتیں بہت اونچی ہوتی ہیں۔اشفاق صاحب آئے۔ایک دو باتوں کے بعد چھت کی طرف دیکھنے لگے۔دیکھتے رہے اور پھر مخاطب ہوئے۔

"بکی......اک ایخو جیہا گھر ایتھے،مینوں تے اپنی آپانوں نئیں لے دیندا۔کنھا ٹھنڈا تے من بھاونا اے۔" یہ اُن کا شیوہ تھا، مسلک تھا کہ وہ اپنے ملنے والوں کی اچھائیوں اور خوبیوں کو اور بڑھا چڑھا کر پیش کرتے تھے۔میں نے سالہا سال کی قربت میں اُن کی زبان سے کبھی کسی کے خلاف کوئی جملہ نہیں سنا تھا۔

وہ تقریبات میں مضمون بہت کم پڑھتے تھے۔اتنی دل نشیں اور دل پذیر گفتگو کرتے تھے، کہ اگر وہ سب بھی ریکارڈ ہو گئی ہوتی، تو ادب میں بیش بہا اضافہ ہوتا۔خلافِ معمول پچھلے سال (2003ء میں) جب میرا مجموعۂ کلام "غمِ عشق گر نہ ہوتا" چھپ کر آیا اور اُس کی دسمبر میں جو تقریب ہوئی اُس میں اشفاق صاحب نے مضمون پڑھا تھا اور شاید تقریباتی حوالے سے یہ ان کا آخری مضمون تھا۔مجھے اُردو سائنس بورڈ کے طارق جاوید نے بتایا کہ اسلم کولسری کہہ رہے تھے، اگلے دن اشفاق صاحب سے ملاقات ہوئی تو وہ اظہر جاوید کا یہ شعر سُنا کر اتنی بے ساختہ داد دے رہے اور کہہ رہے تھے یہ اس عہد کا عظیم اور ضرب المثل شعر ہے۔

جلا کے کشتیاں دریا کے ہم بھی پار گئے ہمارے ساتھ مگر یہ ہوا کہ ہار گئے

طارق جاوید نے زور دے کر بتایا کہ اسلم کولسری صاحب کہہ رہے تھے، یہ پیغام اظہر جاوید تک ضرور پہنچا دینا۔

اشفاق صاحب اپنے گھر میں مختلف قسم کی محفلیں سجاتے رہتے تھے۔ کبھی کوئی صوفی آ گیا، کوئی کہیں سے صاحبِ علم پاکستان میں آیا، کوئی اور محبِّ وطن مل گیا، تو وہ اکٹھ کر لیتے۔ جن دس بیس لوگوں کو بلاتے، اُن میں میرا نام بھی ضرور ہوتا۔ پہلے خود فون کرتے، پھر بانو آپا کی ڈیوٹی لگا دیتے اور بانو آپا مجھے پیار سے ڈانٹتیں۔ "تم دفتر میں جلدی آ جایا کرو نا۔ صبح سے خان صاحب بار بار فون کر رہے ہیں، اور اب میری ڈیوٹی لگا رکھی ہے۔ شام کو اتنے بجے آ جانا بیٹا جی......"

اس طویل علالت سے کچھ پہلے اُنہوں نے گھر میں ایک عجیب محفل کا اہتمام کیا۔ جامعہ نعیمیہ کے دو مولوی صاحبان تھے۔ ایک ذرا جوان، دوسرے تھوڑی پختہ عمر کے۔ مگر واقعتاً نرے مولوی نہیں تھے۔ پڑھے لکھے تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ متحمل اور بردبار تھے۔ اشفاق صاحب نے چند شاعروں، ادیبوں کو بھی بلایا تھا کہ یہ سوچیں اہلِ قلم اور دینی سکالرز کے درمیان فاصلہ کیوں ہے اور لوگ مولوی سے شکایت کیوں کرتے رہتے ہیں؟ محفل میں انیس ناگی جیسے 'تیر انداز' تھے اور صوفی تابش جیسے دھیمے مزاج والے بھی۔ خوب گرما گرم باتیں ہوئیں۔ اشفاق صاحب بات چیت میں قطعی حصہ نہیں لے رہے تھے۔ ایمپائر بھی نہیں تھے۔ بس مسکراتے رہے اور یوں لگتا دونوں دَفوں کو ہلاشیری دے رہے ہیں "شاباش......اچھا سلسلہ چل رہا ہے......" ظاہر ہے ایسے مباحث کا نتیجہ تو کچھ نکلتا نہیں، مگر اشفاق صاحب کا کہنا تھا، ایسی محفلیں سجتی رہیں گی اور یقیناً افہام و تفہیم ہوگی اور فاصلہ گھٹے گا۔"

دبئی سے واپس آ کر میں نے "تقاضے" میں لکھا تھا، کہ کس طرح اشفاق صاحب وہاں مداحوں میں گھرے رہے۔ صبح سے شام تک اور پھر گہری رات تک وہ "اپدیش" دیتے رہے، لیکن میں نے انہیں تھکتے اور اُکتاتے نہیں دیکھا تھا۔ اُن دنوں پاکستان کے سابق صدر رفیق تارڑ کے صاحبزادے وہاں عرب امارات میں پاکستانی سفارت خانے میں متعین تھے، وہ اور اشفاق صاحب کے ایک اور نیاز مند آ گئے، اور اُنہیں اپنے ہمراہ لے گئے۔ اشفاق صاحب نے مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا، مگر میں ٹال گیا کہ اُن کے پرستار میری وجہ سے بے تکلف نہیں ہو سکیں گے۔

جمیل الدین عالی کو ایوارڈ دینے والی کمیٹی میں محمود شام نے مجھے، پشاور سے تاج سعید (مرحوم) کو اور سندھ اور بلوچستان سے بھی ایک ایک اہلِ قلم کو شامل کیا تھا اور ہم سب وہاں موجود تھے۔ روایتی طور پر سندھی اور بلوچی دوست کھنچے کھنچے تھے۔ وہی پرانی شکایت کہ پنجاب نے ہمارا حق مار رکھا ہے اور اب پانی کا پورا حصہ بھی نہیں دے رہا۔ میں نے اشفاق صاحب کی جادوگری دیکھی، کہ ایک طویل مکالمے کے بعد وہ دونوں شاکی بھی، محبِّ وطن پاکستانی کی طرح سوچ رہے تھے۔

میں تو خیر، اُنہیں کہتا ہی مرشد تھا، اور ہمیشہ اُن کے گھٹنے کو چھو کر ملتا۔ وہ اُٹھاتے اور پھر گلے لگاتے اور دعائیں دیتے۔ بانو آپا سے یہی عمل کرنے لگتا تو وہ پیار سے ڈانٹتیں اور میرے بڑھے ہوئے ہاتھ کو روک کر مضبوطی سے تھام لیتیں۔ "بیٹا جی، ایسے نہ کیا کریں۔" میں کہتا "آپ میرے مرشد کی بیوی ہیں، آپ کا بھی اتنا ہی مرتبہ ہے۔" وہ دعائیں دیتیں۔ اپنے نرم ملائم ہاتھوں کی تمازت دیتیں اور سر پر سفید دوپٹے کو سنوارتی آگے چلی جاتیں۔

دبئی میں جب عالی جی کے ایوارڈ کی تقریب ہوئی، اور میں عالی جی کے بارے میں مضمون پڑھ کر سٹیج پر واپس آیا تو سب سے

زیادہ داد مجھے اشفاق صاحب نے دی۔

''شابا۔شابا'' ساتھ کندھے پر شفقت سے ہاتھ بھی رکھا۔

''توں تے اگے نالوں وی سوہنا لکھن لگ پیا ایں۔فقریاں دی بُنت کڈی سوہنی تے نویکلی سی۔''

سچ کہتا ہوں...... چونسٹھ برس کا ہو جانے پر بھی مجھے یوں لگا، جیسے کسی نے شعروادب کے فرش سے اُٹھا کر مجھے عرش تک پہنچا دیا ہو۔میں نے جسم میں کپکپی سی محسوس کی اور واقعی یوں لگا، میں بلندیوں کی طرف پرواز کر رہا ہوں۔

اشفاق صاحب صدارتی کلمات کہنے آئے تو یوں لگا، ہال میں موجود سینکڑوں آنکھیں اُن پر مرکوز ہیں اور سارے کے سارے کان گوش بر آواز ہیں۔نہایت گمبھیر اور حسین سناٹا تھا۔اُن کے لفظ خوشبو بکھیر رہے تھے۔روشنی کر رہے تھے اور خواتین وحضرات کے دلوں میں اُترتے جا رہے تھے۔بس کبھی کبھی، واہ واہ کی آواز آتی، ورنہ طویل وعریض ہال میں صرف اشفاق صاحب ہی موجود تھے۔وہ داستان گو جو ڈرامائی انداز میں لفظوں کے سنگھار کے ساتھ ساتھ آواز کے چڑھاؤ اور اُتار کا ملکہ بھی رکھتا تھا...... جسے ایک پل میں، سنجیدہ چہروں پر مسکراہٹ ہی نہیں قہقہے بھی نچھاور کرنا آتے تھے۔جب اُنہوں نے گفتگو کو موڑ دیتے ہوئے کہا۔

''عالی نے بڑے عشق کئے ہیں'' تو سٹیج پر بیٹھے ہوئے بے چین عالی جی اور بھی گڑبڑا گئے۔

''ارے ارے خان صاحب۔بس بس، اور نہیں کچھ۔'' ہال میں عالی جی کی بیگم صاحبہ بھی تھیں اور ان کے اپنے نیاز مند بھی۔اشفاق صاحب کی گفتگو کی روانی کے آگے بھلا کون بند باندھ سکا ہے۔اُنہوں نے کمالِ مہارت سے ان ''عشقوں'' کو شاعری، وطن کی محبت، انسانیت سے وابستگی کی طرف موڑ دیا اور پھر کہا ''میرے پاس دو پیالیاں اور ایک پرچ ہے'' اس جملے کے بعد اشفاق صاحب ٹھاٹھیں مارتے ہوئے کہیں اور نکل گئے۔پانی کا گھونٹ بھرا اور پھر وہی فقرہ...... ''میرے پاس دو پیالیاں اور ایک پرچ ہے۔'' یہ ایسا پکڑ اور جکڑ لینے والا جملہ تھا کہ حاضرین متوجہ ہوئے اور اشفاق صاحب دوسری طرف کو پلٹا کھا جاتے۔آدھ پون گھنٹے کی سحر انگیز گفتگو میں انہوں نے دو تین بار یہ جملہ دہرایا۔اور پھر اچانک تقریر ختم کر کے واپس آ گئے۔

پھر ایوارڈ کی رسم ہوئی۔کچھ اور ہُوا، مگر میں نے آرام سے اشفاق صاحب سے پوچھا۔وہ دو پیالیوں اور ایک پرچ والی کہانی کیا تھی۔اشفاق صاحب ہڑبڑا کر تقریباً اُچھل پڑے۔''اوئے، ایہہ کیہہ ہو گیا...... توں مینوں یاد تے کروا دینا سی۔''

میں نے کہا...... ''ہم سب اتنے مگن اور سحر زدہ تھے، کہ پتا ہی نہیں چلا کب آپ نے تقریر ختم کر دی۔''

''کاکا...... ہُن میں بڈھا ہو گیا واں...... گلاں بھلن لگا واں۔''

''نہیں نہیں۔اشفاق صاحب، آپ تو ماشا اللہ اب بھی جوانِ رعنا ہیں۔'' میں نے احترام رکھتے ہوئے بے تکلفی سے کہا۔ اشفاق صاحب صرف ہنس دیئے، لیکن مجھے لگا، اُنہیں بات مکمل نہ کر سکنے کا ملال سا ہے۔اور میں یہ راز اب تک نہ جان سکا کہ دو پیالیوں اور ایک پرچ والی کہانی کیا تھی؟ مرشد یہ بات کھولے بغیر دنیا سے چلے گئے۔افسوس اے وائے افسوس!

◆◆◆

(اظہر جاوید کے پرانے کاغذات سے بازیافت)

جو مہ جبین تھے، لیتے تھے عشق کی خیرات — کہ ایک شجرِ ثمرور تھا، اظہر جاوید (انورسدید)

یادیں

عاشقی صبر طلب

(2001ء-2013ء)

......3......

ڈاکٹر رشید امجد

قائم نقوی کے بیٹے محمود نے جو پاکستان ٹیلی وژن کے شعبۂ نیوز میں ہیں، بتایا کہ سنٹرل ایشیائی ریاستوں میں پاکستانیوں کے بارے میں نفرت پیدا ہو رہی ہے۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے "پاکستان سے تبلیغی جماعتیں وہاں جا کر مذہب کی ایسی تاویلیں پیش کرتی ہیں جو ان کے معاشرے سے لگا نہیں کھاتیں۔ وہ لوگ ابھی تک خود کو روسی سمجھتے ہیں اور ماسکو تک سفر میں کوئی دقت نہیں۔" بتانے لگے "ہم جس جہاز میں گئے اس میں ہماری ٹیم کے چند اراکین کے سوا سارے تبلیغی جماعت کے لوگ تھے۔ نہ ان کے حلیے ماڈرن نہ گفتگو و اطوار۔" میں نے پوچھا "یہ لوگ چلے کیسے جاتے ہیں؟" بولے "پاکستان ان کی جنت ہے۔ دنیا بھر کے ایسے لوگ یہاں جمع ہیں۔ ان کے اپنے ملکوں میں انہیں اس طرح کی تبلیغ کی اجازت نہیں۔ یوں کہہ لیں، ان ممالک نے اپنے اس طرح کے سارے لوگ پاکستان بھجوا دیئے ہیں اور یہ سارا کام پاکستان کے کھاتے میں پڑ گیا ہے۔ سنٹرل ایشیائی ریاستوں کی صورتحال یہ ہے کہ اگر آپ رات گئے اکیلے گھوم رہے ہیں اور انہیں معلوم ہو جائے کہ پاکستانی ہیں تو مار پیٹ کرتے ہیں۔"

دہشت گردوں، مذہبی جنونیوں اور تبلیغی جماعتوں نے دنیا بھر میں پاکستان کا امیج خراب کر دیا ہے۔ اس کا نقصان ہمیں تو ہوا سو ہوا، اسلام کے بارے میں بھی غلط تصوّرات عام ہو گئے ہیں، حالاں کہ اسلام پہلا مذہب ہے جس نے Humanism کی بات کی۔ آج جس احترام انسانیت کا پرچار دنیا بھر میں ہو رہا ہے، اس کی بنیاد رسول اکرمؐ نے رکھی ہے۔ مشہور واقعہ ہے کہ مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ حضور اکرمؐ اپنے ایک صحابی کے ساتھ تیز تیز قدموں سے مسجد کی طرف جا رہے تھے کہ اچانک رفتار سست کر لی۔ صحابی نے پوچھا "رسول اللہؐ! کیا بات ہے، آپ نے رفتار سست کر لی ہے۔" فرمایا "آگے ایک بزرگ جا رہے ہیں، مجھے اچھا نہیں لگتا کہ ان سے آگے نکلوں۔" صحابی نے کہا، "حضورؐ! یہ تو یہودی ہے۔" آپؐ کو غصہ آ گیا، فرمایا، "بزرگی مسلمان یا یہودی نہیں ہوتی۔" اسی طرح ایک غزوہ میں کچھ بچے بھی مارے گئے، آپؐ نے بار بار اظہارِ افسوس کیا۔ ایک صحابی نے کہا، "حضورؐ! یہ تو مشرکوں کے بچے تھے۔" آپؐ نے فرمایا، "بچے اللہ کی صفت پر ہوتے ہیں اور معصوم ہیں۔" لیکن یہ کیا بدنصیبی ہے کہ اسلام کا نام لینے والے کلاشنکوف اور بم اٹھائے اپنی طرز کا اسلام پھیلانے چلے ہیں۔ بچوں کی ایسی برین واشنگ کرتے ہیں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ نہ صرف خود بلکہ اپنے والدین کے لئے بھی جنت کما رہے ہیں۔

سرسید کالج کے دنوں کی بات ہے کہ کالج کے کچھ ساتھیوں نے ٹیوشن سنٹر کھول رکھا تھا۔ایک دن ہمارے ایک ساتھی کہنے لگے، ''اردو کے بھی کچھ طالب علم آئے ہیں، اگر شام کو آپ ایک گھنٹہ دے سکیں تو کچھ رقم مل جائے گی۔'' یوں تو زندگی بھر میرے حالات بہت اچھے نہیں رہے لیکن ان دنوں بچوں کی تعلیم، خصوصاً بیٹی سعدیہ کے ہوسٹل اور فیس کے اخراجات کی وجہ سے پریشانی کچھ زیادہ ہی تھی۔ میں نے زندگی بھر ٹیوشن نہیں پڑھائی لیکن جب میں نے رخسانہ سے بات کی تو وہ کہنے لگی ''ساری زندگی اصولوں کی سیڑھی پر نہ چڑھے رہیں۔ آٹھ دس ہزار مل گئے تو سعدیہ کو کچھ زیادہ بھجوا دیا کریں گے۔'' سعدیہ میری کمزوری ہے چنانچہ میں نے ہامی بھر لی۔ میری ایک کلاس پانچ بجے اور دوسری ساڑھے چھ بجے ہوتی تھی۔ درمیاں میں آدھ گھنٹہ مغرب کی نماز کے لئے وقف تھا۔ ہمارے ساتھی اور سارے طلبہ باجماعت نماز پڑھتے تھے۔ میں اگرچہ باقاعدہ نمازی نہیں لیکن اس خیال سے کہ طلبہ غلط تاثر لیں گے، جماعت میں شامل ہوتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک طالب علم علیحدہ کھڑا رہتا ہے اور جب ہم نماز پڑھ چکتے ہیں تو نماز پڑھتا ہے۔ میں نے ایک دن اس سے پوچھا ''بیٹا تم باقاعدہ نمازی بھی ہو، جماعت کے ساتھ شامل کیوں نہیں ہوتے؟'' کہنے لگے ''سر میرے امام کہتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ میں ''دوَالین'' پڑھنا چاہیے، لیکن یہاں جو طالب علم جماعت کرتا ہے ''ووالضالین'' پڑھتا ہے، اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہیں۔'' میں نے کہا ''بیٹا! یہ بتاؤ جب امام قرأت کر رہا ہوتا ہے تو تم بھی تو اپنے طور پر قرأت کر رہے ہوتے ہونا۔'' بولا ''جی بالکل''۔ میں نے کہا ''تو تم ''دوَالین'' پڑھ لیا کرو''۔ چپ ہو گیا۔ اگلے دن کہنے لگا۔ ''میں نے امام صاحب سے بات کی تھی، وہ نہیں مانے'' کہنے لگے کان میں تو 'ض' کی آواز آتی ہے نا۔'' انہی دنوں کی بات ہے ہمارے پرنسپل امین بھٹی ایک دن کہنے لگے ''یار! میں تو بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔'' میں نے پوچھا ''سر! کیا ہوا؟'' بولے ''یار! میں نے تو یونہی کہہ دیا تھا کہ جن حضرات کا پہلا پیریڈ ہوتا ہے وہ لیکچر شروع کرنے سے پہلے مختصر سی تلاوت کر لیا کریں، برکت پیدا ہو جاتی ہے، لیکن اب ہو یہ رہا ہے کہ پہلا سارا پیریڈ تلاوت اور پھر اس کی تفسیر میں گزر جاتا ہے۔ یہ میتھ، فزکس اور کیمسٹری کے پیریڈ ہیں۔ اب کچھ کہتا ہوں تو کفر کا فتویٰ لگ جائے گا۔''

ایسی صورتِ حال کی وجہ جہاں ہمارا تعلیمی نظام ہے وہاں ایک بڑی وجہ ایسے اساتذہ ہیں جو اپنے مضمون کے بارے میں ایک لفظ نہیں جانتے اور سارا وقت مجتہدانہ قسم کی مذہبی بحثوں میں گزار دیتے ہیں۔ ایسے اساتذہ کی بڑی تعداد مذہبی جماعتوں سے تعلق رکھتی ہے۔ ان کی تنظیمیں ایسی مضبوط ہیں کہ کوئی شخص ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

اس فضا کو پیدا کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ پاکستانی حکمرانوں کا ہے جن کی اکثریت خود مذہبی تھی۔ پہلی غلطی تو اس دن ہوئی جب قرارداد مقاصد کو آئین کا حصہ بنایا گیا۔ کہتے ہیں اس پر ایک مذہبی جماعت کے سربراہ نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا کہ ہمارا مقصد پورا ہو گیا، اب ہمیں کچھ اور کرنے کی ضرورت نہیں۔ پاکستانی حکمرانوں میں پہلا دور تو بیوروکریسی اور ان سیاستدانوں کے اشتراک کا ہے۔ اس کے بعد ایوب کا دور شروع ہوا۔ ایوب روشن خیال شخص تھے۔ انہوں نے پاکستان کے نام کے ساتھ اسلامی جمہوریہ حذف کرا دیا تھا۔ لیکن پھر مذہبی جماعتوں کی مخالفت کی وجہ سے چپ ہو گئے۔ ان کے دور میں جماعت اسلامی پر پابندی لگا دی گئی تھی اور مولانا مودودی کو سزائے موت دی گئی تھی لیکن کورٹ نے انہیں بری کر دیا۔ بھٹو سوشلزم کی باتیں کرتے تھے لیکن اس کے ساتھ اسلامی کا لفظ لگا دیا تھا۔ بھٹو اپنے جاگیردارانہ پس منظر کی وجہ سے انتہائی مذہبی تھے۔ انہی کے زمانے میں پہلی بار وزارت مذہبی امور قائم کی گئی۔ قادیانیوں کو کافر قرار دیا گیا۔ اسلامی کانفرنس کی بنیاد رکھی گئی۔ افغانستان میں روسی غلبہ کی مخالفت کی گئی۔ مجھے کسی نے بتایا ہے کہ بھٹو جب طالب علم تھے تو انہوں نے اسلامی بلاک

کے تصور پر ایک مضمون لکھا تھا۔ انہی کے دور میں مزاروں پر سرکاری طور پر چادریں چڑھانے کا رواج ہوا۔ طالبان کی بنیاد بھی انہی کے دور میں ہوئی۔ حامد میر نے اپنے ایک کالم میں لکھا ہے کہ انہوں نے یاسر عرفات کا ایک انٹرویو لیا تھا۔ یہ ضیاء کا دور تھا۔ یاسر عرفات نے بعض باتیں آف دی ریکارڈ کی تھیں، اور کہا تھا کہ ان کے مرنے کے بعد انہیں شائع کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے ایک بات یہ تھی کہ حامد میر کے اس سوال پر کہ آپ پہلے پاکستان کے بڑے حامی تھے، اب اتنے مخالف کیوں ہو گئے ہیں؟ یاسر عرفات نے کہا تھا کہ بھٹو کے زمانے میں ایک معاہدہ ہوا تھا کہ فلسطینی کچھ پاکستانی مدرسوں کے طلبہ اور افغانیوں کو گوریلا ٹریننگ دیں گے جو افغانستان میں چھیڑ چھاڑ شروع کریں گے تاکہ ایک طرف روسی غلبہ ختم ہو اور دوسرے افغان حکومت کو مجبور کیا جائے کہ وہ ڈیورنڈ لائن کو مستقل سرحد تسلیم کر لے۔ ضیاء نے آتے ہی اس پر پابندی لگا دی اور دوسری وجہ یہ ہے کہ بھٹو کو رہا کرنے کی اپیل مسترد کر دی۔ یہ بات اب سامنے آ گئی ہے کہ سردار داؤد ڈیورنڈ لائن کو مستقل سرحد تسلیم کرنے پر رضامند ہو گئے تھے اور اس سلسلے میں اسلام آباد میں تقریب کی تیاریاں بھی شروع ہو چکی تھیں کہ ضیاء نے حکومت کا تختہ الٹ دیا اور یوں یہ سارا عمل رائیگاں ہو گیا۔

ضیاء الحق تو تھا ہی نام نہاد مذہبی۔ نام نہاد اس لئے کہ اس نے مذہب کو اپنے مذموم ارادوں کے لئے استعمال کیا۔ آج پاکستان جن مصیبتوں سے گزر رہا ہے اس کا بیج ضیاء ہی کے زمانے میں بویا گیا۔ اب یہ فصل تیار ہو چکی ہے۔ بھٹو نے اپنے آخری دنوں میں شراب پر پابندی لگائی۔ جمعہ کی چھٹی کا اعلان کیا۔ اس پر کسی نے گرہ لگائی تھی کہ شرابیوں کی بد دعاء نے بھٹو کو برباد کر دیا۔

بے نظیر بھی باپ کی طرح مذہبی رجحانات رکھنے والی خاتون تھی۔ انہوں نے طالبان کی باقاعدہ بنیاد رکھی۔ ان کے ایک وزیر نصیر اللہ بابر خود کو طالبان کا باپ کہا کرتے تھے۔ بینظیر نے بھی ایسے مذہبی رویوں کی کبھی کھل کر اور کبھی در پردہ حمایت کی جن کا مقصد پاکستان میں مذہبی سیاست کو فروغ دینا تھا۔ نواز شریف نے بھی مذہبی گھرانے میں آنکھ کھولی اور اسامہ بن لادن کی حمایت کی۔ بلکہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسامہ نے اپنے پیسے کے زور سے نواز شریف کو جتوایا۔

ایجنسیوں نے بھی مذہبی جماعتوں کو سہارا دیا بلکہ وہ قائم ہی اس کی مدد سے ہوئی ہیں۔ اور اب پاکستانی سیاست و جمہوریت کو جب کبھی غیر متوازن کرنا ہوتا ہے ایجنسیاں مذہبی جماعتوں کو ہی استعمال کرتی ہے۔ ضیاء کے زمانے میں اس طرح کے متشدد مذہبی رویے رکھنے والے متعدد لوگ ان ایجنسیوں میں شامل ہو چکے ہیں۔ یہ دراصل حکومت کے اندر ایک اور حکومت ہے جو فوج کے کنٹرول سے بھی باہر ہے۔ میں نے کبھی کسی جرنیل کی بطور حکمران حمایت نہیں کی، بلکہ بساط بھر ہمیشہ مارشل لاء کے خلاف لکھا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ جنرل پرویز مشرف ایک روشن خیال شخص تھے۔ وہ پہلے آدمی ہیں جنہوں نے نظامِ تعلیم میں بنیادی تبدیلیاں لانے کی کوشش کی۔ ان کے سیاسی اور حکومتی نظریات سے قطع نظر وہ چاہتے تھے کہ پاکستان میں روشن خیالی کو فروغ ملے۔ انہوں نے اپنی پہلی تقریر میں کہا تھا کہ مصطفیٰ کمال ان کے آئیڈیل ہیں، لیکن اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے وہ بھی مذہبی اتحاد ایم ایم اے کے زیر اثر آ گئے۔

پاکستان کا ہر حکمران امریکن گھوڑے پر سوار ہو کر آتا ہے لیکن کچھ عرصے کے بعد جب اس کے دل میں وطن پرستی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور امریکی ڈکٹیشن لینے سے انکار کر دیتا ہے تو امریکی اسے ذلیل کر کے نکال باہر کرتے ہیں، زیادہ ضد کرے تو بھٹو اور ضیاء کی طرح مروا بھی دیتے ہیں۔ اکثر پاکستانیوں کا خیال ہے کہ دہشت گردی کے ذمہ دار عرب ممالک، امریکہ، بھارت، روس اور اسرائیل ہیں۔ بعض لوگ

ایران کا نام بھی لیتے ہیں کہ یہ ممالک دہشت گردوں کو روپیہ فراہم کرتے ہیں۔

پاکستان میں دہشت گردی کی ذمہ داری کئی اداروں اور جماعتوں پر عائد ہوتی ہے۔ مذہبی جماعتوں نے کبھی اس کی کھل کر مخالفت نہیں کی بلکہ اسے امریکی ڈرون حملوں کا ردعمل کہہ کر در پردہ ان دھماکوں اور ٹارگٹ کلنگ کی حمایت کی۔ یہ ٹارگٹ کلنگ کئی سطحوں اور وجہوں سے ہورہی ہے۔نمل کے زمانے میں ایک دن شہاب صفدر میرے پاس آئے۔ یہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی۔ان کی شاعری نظر سے گزرتی رہتی تھی۔ کہنے لگے،''مجھے یہاں ملازمت دلا دیں۔'' میں نے کہا''میرا خیال ہے آپ تو کسی کالج میں ہیں''۔ کہنے لگے،''میں ڈیرہ اسماعیل خان کے گورنمنٹ کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر ہوں''۔

میں نے پوچھا''یہاں تو دس بارہ ہزار ملتے ہیں، آپ کالج چھوڑ کر یہاں کیوں آنا چاہتے ہیں''۔

بولے''میں اہلِ تشیع سے ہوں۔ ڈیرہ میں اہلِ تشیع کو چن چن کر مارا جارہا ہے۔ میرے خاندان کے کئی لوگ مارے گئے ہیں۔ میں بھاگ کر یہاں آیا ہوں۔ مجھے کہیں ملازمت دلا دیں''۔

میں نے کہا'بھائی! میری اتنی بساط نہیں، ایک طریقہ بتا سکتا ہوں۔ اپنے علاقے کے کسی ایم این اے کو پکڑیں اور ڈیپوٹیشن پر یہاں کسی کالج میں آجائیں، کئی لوگ اس طرح آچکے ہیں''۔

چند دنوں بعد معلوم ہوا کہ وہ ایچ نائن کالج میں آچکے ہیں۔ سال بھر بعد ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا''اب ڈیرے کا کیا حال ہے؟''

کہنے لگے''ایک واقعہ سناتا ہوں۔ میرے چچازاد بھائی کا نام بھی ٹارگٹ لسٹ میں آ گیا۔ وہ بے چارہ چھپتا پھر رہا تھا کہ کسی دوست نے مشورہ دیا کہ یہاں کے رکن صوبائی اسمبلی اس کے والد کے دوست تھے، ان سے جا کر ملو۔ وہ رکن اسمبلی کے گھر پہنچا اور اپنا تعارف کروایا۔ اس نے کہا، یار! تمہارے والد تو میرے کلاس فیلو تھے، بتاؤ کیا کام ہے؟

اس نے ساری صورتِ حال بتائی۔ رکن صاحب نے میز کی دراز سے رجسٹر نکالا اور کھولکر اسے دیکھنے لگے۔ پھر بولے، واقعی تمہارا نام تو اس ماہ کی لسٹ میں ہے لیکن فوری طور پر کچھ نہیں ہوسکتا کیونکہ مجھے علم نہیں کہ تمہارا نام کس کے پاس ہے۔ مہینہ ختم ہونے میں دس بارہ دن رہ گئے ہیں، یہ ڈیرے سے باہر گزار آؤ اور پھر میرے پاس آجاؤ، تمہارا نام لسٹ سے نکال دیا جائے گا۔''

میں نے صفدر شباب سے پوچھا، پولیس اور ایجنسیوں کو اس کا پتہ نہیں؟

بولے''سب کو علم ہے۔ دہشت گرد واردات کر کے ان کے گھر پناہ لیتے ہیں، لیکن کوئی ایسی نادیدہ قوت ہے جو پولیس کو کوئی ایکشن نہیں لینے دیتی۔''

(جاری ہے)

◆◆◆

اس کی تصویر دیکھ کر اظہؔر آرزو اب بھی ڈگمگاتی ہے (اظہر جاوید)

آپ بیتی

بھارت سے پاکستان تک

......4......

علی سفیان آفاقی

یہ مہم ختم کرنے کے بعد بھی ہم چند روز بھوپال میں رہے۔ محل کے در و دیوار اونچے اونچے دالان، بارہ دریاں، شہ نشین، پائیں باغ یہ سب ہمارے تھے۔ یہاں رہنے والے بھی ہمارے اپنے تھے۔ درحقیقت ہماری ددھیال بھوپال ہی تھی۔ اپنے ہم عمر کزن اور دوستوں کے ساتھ بھوپال کی خوب سیر کی۔ معلوم نہ تھا کہ اس کے بعد ہم پھر کبھی بھوپال کو نہ دیکھ سکیں گے۔

بھوپال کچھ عرصے بعد ہندوستان میں ضم کرلیا گیا۔ نہ نوابی رہی نہ وہ ماحول۔ پاکستان آنے کے بعد مسلمانوں کے حوالے سے ہندوستان کے احوال سن سن کر ہم کبھی ہندوستان نہیں گئے۔ ہماری بہن چند بار پاکستان آئی تھیں۔ ان کا تقاضا تھا کہ ساری دنیا میں گھومتے پھرتے ہو، کیا چند قدم کے فاصلے پر دِلّی نہیں آسکتے؟ ہم انہیں کیا بتاتے کہ یہ چند قدم کا فاصلہ نہ تھا ایک لامتناہی، لامحدود فاصلہ تھا۔ ''ہنوز دلی دوراست'' انیسہ آپا کا چند سال قبل انتقال ہوگیا۔ ہم بہت روئے مگر ہندوستان پھر بھی نہ گئے۔ اب وہاں کیا رکھا تھا۔ زمین آسمان، در و دیوار پہلے ہی پرائے اور اجنبی ہو چکے تھے۔ ایک خون کا رشتہ تھا وہ بھی ٹوٹ گیا۔ ہمارے دوست احباب ہندوستان جاتے رہتے تھے اور ہر بار دل دکھانے والی تبدیلیوں کے بارے میں بتاتے تھے۔ فلمی صنعت سے وابستہ ہوئے تو کئی بار ممبئی جانے کے مواقع اور دعوت نامے ملے مگر ہم نہ گئے۔ سنتے رہے کہ ہندوستان کے شہروں نے بہت ترقی کی ہے۔ تو پھر کیا ہوا۔ امریکہ نے اس سے زیادہ ترقی کی ہے مگر نہ امریکہ ہمارا ہے نہ ہندوستان۔ ہمارا تو صرف ایک ہی ملک اور وطن ہے۔ ایک بار امریکہ اور کینیڈا میں دو سال کے قریب رہے۔ ریستوران خریدا، گھر خرید لیا، کار خرید لی (سب نقد) جب ہمارے دوست یہ سمجھ رہے تھے کہ اب ہم کبھی واپس نہ جائیں گے ہم نے اچانک واپسی کا ارادہ کیا اور دو ماہ بعد سب کچھ ٹھکانے لگا کر پاکستان آگئے اور اس فیصلے پر کبھی نہیں پچھتائے۔ وہاں سب کچھ حاصل تھا مگر پاکستان اور پاکستانیوں کی یادیں ساری ساری رات جگاتی تھیں۔ اس ماحول میں دم گھٹتا تھا۔ ایک اجنبی بلکہ بن بلائے مہمان کی حیثیت سے رہتے تھے (یہ سنہ 81/80ء کا تذکرہ ہے جب امریکہ واقعی ایک غیر متعصب اور کشادہ دل ملک تھا)۔

پرمٹ لے کر خوشی خوشی دلّی آئے تو انیسہ آپا گلے لگا کر بہت روئیں ہم بھی روئے۔ ادھر پاکستان یہ خبر پہنچی تو خالہ اماں نے فرمائش کی کہ ان کا پیک کیا ہوا سامان بھی ساتھ لائیں۔ ذرا سوچئے جہاں ہم اکیلے کو پاکستان آنے کیلئے پرمٹ کے حصول میں خاک چھاننی پڑی تھی وہاں سے دو تین ٹرک کا سامان کیسے اور کون لے جانے دے گا؟ جواد بھائی نے تو کہہ دیا کہ یہ ناممکن ہے، جب حالات بہتر ہوئے تھوڑا تھوڑا کر کے بھیج دیا جائے گا۔ مگر ہم نے ایک دلچسپ ناول پڑھا تھا (بعد میں اس کی فلم بھی ہالی وڈ میں بنائی گئی تھی) جس کا عنوان تھا

''نیور ٹیک نو فار این آنسر''، مطلب یہ کوشش کئے جاؤ ہمت نہ ہارو ہم خود بھی اسی اصول کے قائل تھے اور تمام عمر رہے۔

ہم نے کہا ''جواد بھائی کوشش تو کرنی چاہیے یہ بتائے کہ اسکا پرمٹ کہاں سے ملے گا؟''

معلوم ہوا کہ نئی دہلی میں مرکزی سیکرٹریٹ سے کامرس منسٹری یہ اجازت نامہ دے سکتی ہے۔گرمی کا مہینہ تھا مگر ہم سوٹ پہن کر ٹائی لگا کر اور سر پر ہیٹ پہن کر سیکرٹریٹ پہنچ گئے۔ یہ عمارت انگریزوں نے بنائی تھی اور انتہائی پرشکوہ اور شاندار عمارت ہے۔انڈیا کو تو قیام پاکستان کے بعد سب کچھ انگریزوں کا بنا بنایا مل گیا۔عمارتیں، شہر، فیکٹریاں، ریلوے، روپیہ پیسہ اور ایک مکمل چلتا ہوا نظام۔ پاکستان کو یہ سب کچھ نئے سرے سے بنانا پڑا۔ ہندوستان کے سیکرٹریٹ کا رعب اور شان ہی نرالی ہے۔عمارت میں قدم رکھا تو بہت مرعوب ہوئے۔ فرق صرف یہ تھا کہ گوروں کی بجائے اب کالے افسر تھے۔ برآمدے میں ایک چپڑاسی سے پوچھا کہ کامرس منسٹری کس طرف ہے۔اس نے ایک ہیر پھیر والا راستہ بتا دیا۔اس روز ہمیں پتہ چلا کہ یہ عمارت کتنی وسیع وعریض ہے۔ چلتے چلتے تھک گئے۔ بالآخر کامرس منسٹری کا سیکشن نظر آ گیا۔سامنے ہی سپرنٹنڈنٹ کے نام کی تختی لگی ہوئی دیکھی تو اندر چلے گئے۔سپرنٹنڈنٹ صاحب کا پوچھتے ہوئے آخر کار ان تک پہنچ گئے۔

ایک بڑی سی میز پر جو صاحب تشریف فرما تھے وہ خاصے ''صاحب'' نظر آ رہے تھے۔ بڑی بڑی مونچھیں، کرخت رعونت آمیز چہرہ، فائل دیکھنے میں مصروف تھے۔ہم پاس جا کر کھڑے ہو گئے، کچھ دیر بعد انہوں نے نظر اٹھا کر دیکھا۔رعب سے پوچھا ''یس؟''

ہم نے کہا ''ایک پرمٹ کے سلسلے میں آئے ہیں''۔

بولے ''آپ کو اندر آنے کس نے دیا'' پھر انہوں نے گھنٹی بجانے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

ہم نے کہا ''اب تو آ ہی گئے ہیں مہربانی سے کچھ وقت مرحمت کر دیجئے''۔ وہ کچھ سوچ کر رک گئے۔ پھر تیوری پر بل ڈال کر پوچھا ''کہئے؟ کیا پرابلم ہے؟''

یہ تمام گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی؟

ہم نے کہا اجازت ہو کہ کرسی پر بیٹھ جائیں؟

''بیٹھئے اور جو کچھ کہنا ہے جلدی کہئے۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ہم نے کہا دراصل ہم پاکستان جا رہے ہیں ہمارے والدین وہیں پر ہیں۔کچھ گھریلو سامان لے جانے کا اجازت نامہ چاہتے ہیں''۔

انہیں کوئی بات بھی پسند نہ آئی۔ پھر بھی پوچھا ''کیا سامان ہے؟''

ہم نے جیب سے تین ٹائپ شدہ صفحات کی فہرست نکال کر سامنے رکھ دی۔انہوں نے ایک نظر فہرست پر ڈالی پھر غصے سے زیادہ حیرت سے پوچھا کیا آپ اتنا بہت سا سامان اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں؟

ہم نے کہا یہ استعمال شدہ گھریلو سامان ہے۔

انہوں نے بات کاٹ دی۔''نو سوری یہ ممکن نہیں ہے۔''

یہ کہہ کر فہرست ہماری طرف پھینک دی۔''اب آپ جا سکتے ہیں''۔

ہم کمرے سے نکل کر برآمدے میں پہنچ گئے۔ جواد بھائی کے الفاظ کان میں گونج رہے تھے۔''یار دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا۔اتنا سارا سامان لے جانے کی کون اجازت دے گا تمہیں''۔

پھر ناول یاد آ گئی۔

Never Lake no for an answer

کچھ دیر کھڑے سوچتے رہے پھر خیال آیا کہ کیوں نہ کامرس سیکرٹری سے مل کر کوشش کر دیکھیں۔ قریب سے گزرتے ہوئے چپڑاسی سے پوچھا'' کامرس سیکرٹری صاحب کس طرف بیٹھتے ہیں؟''

اس نے ایک اور برآمدے کی طرف اشارہ کر دیا۔

برآمدہ طے کیا تو سامنے کامرس سیکرٹری کا نام اور عہدہ تختی پر لکھا نظر آیا۔ نام پر ہم نے توجہ نہیں دی۔ شیکسپیئر بھی یہی کہتا ہے کہ نام میں کیا رکھا ہے۔ دروازے پر کوئی چپڑاسی نہ تھا۔ کچھ دیر انتظار کیا تو جواہر کٹ ٹوپی پہنے وہ نمودار ہوا۔

ہم نے کہا'' ہمیں سیکرٹری صاحب سے ملنا ہے؟''

''وقت لیا ہے آپ نے؟''

''نہیں''

''تو پھر مشکل ہے، اس نے ٹوپی اتار کر گنجا سر (اپنا) کھجانا شروع کر دیا۔ ہم نے کہا'' بھائی! آپ چٹ تو لے جائیں۔ وہ انکار کریں گے تو چلے جائیں گے اور وقت لے کر آئیں گے''۔

ہماری شخصیت (سوٹ بوٹ اور ہیٹ) کا اثر تھا یا اس کے دل میں نیکی آ گئی۔ اس نے دروازے کے ساتھ لٹکی ہوئی سادہ چٹ کھینچ کر نکالی اور ہمیں دے دی۔ ہم نے چٹ پر اپنا نام لکھ دیا۔ وہ چٹ لے کر چلا گیا۔ ہم سوچتے رہ گئے کہ نہ جان نہ پہچان، ایک مسلمان کے نام سے سیکرٹری صاحب پر بھلا کیا اثر ہو گا۔ چند لمحے بعد چپڑاسی واپس آیا'' آیئے بلا رہے ہیں!''

ہم خوشی خوشی اندر چلے گئے۔ بسم اللہ تو اچھی ہوئی تھی آگے اللہ مالک ہے۔ ایک بہت بڑے سجے ہوئے کمرے کے عین وسط میں ایک بہت بڑی میز تھی جس پر دبلے پتلے سے گہرے گندمی رنگ کے کلین شیو صاحب بیٹھے تھے۔ اندر گئے تو دیکھا کہ ان کی نظریں دروازے کی طرف لگی تھیں۔ اچھا خاصا سفر طے کرنے کے بعد ان کی میز تک پہنچے تو ان کی تیز نظریں عینک کے پیچھے سے ہمارا جائزہ لے چکی تھیں۔ انہوں نے خود ہی کہا'' بیٹھ جائیں''۔ ہم ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ وہ سوالیہ نظروں سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ ہیٹ ہم نے اتار کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ کرسی پر بیٹھے تو اپنے گھٹنوں پر رکھ لیا۔

ہم نے مختصر اور مطلب کی بات کرتے ہوئے کہا'' ہمارے والدین پاکستان چلے گئے ہیں۔ ان کا کچھ گھریلو استعمال شدہ سامان لے جانے کی اجازت درکار ہے''۔

''آپ لے کر جائیں گے؟''

''جی ہاں''

''کیا سامان ہے؟''

ہم نے تین صفحات کی فہرست ان کے سامنے بڑے ادب سے رکھ دی۔ انہوں نے صفحات الٹے اور ہر صفحے پر ایک نظر ڈالی۔ پھر ہم سے مخاطب ہوئے۔'' یہ اتنا سارا سامان......''

ہم نے کہا''یہ استعمال شدہ پرانا سامان ہے''

وہ مسکرائے اور عینک اتار کر میز پر رکھ دی۔

''آپ کے والدین کب سے پاکستان میں ہیں؟''

''تقریباً دو سال سے''

شاید انہیں کچھ دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔

''آپ بھی پاکستان میں رہیں گے؟''

''جی نہیں، یہاں دلی میں ہماری حقیقی بہن ہیں۔ ہم ان کے پاس رہیں گے''۔

''سارے خاندان کو چھوڑ کر؟''

''دلی اور لاہور میں فاصلہ ہی کتنا ہے۔ آتے جاتے رہیں گے''

سیکرٹری صاحب ایک دبلے پتلے دراز قد اور مہربان شخصیت نظر آ رہے تھے۔ چند لمحے ہمیں دیکھتے رہے۔ پھر مسکرائے، قلم اٹھایا اور بولے''میں جانتا ہوں آپ واپس نہیں آئیں گے''۔ یہ کہا اور ہر صفحے پر دستخط کر دیئے۔

ہم خوشی اور بے یقینی سے انہیں دیکھتے رہے۔ پھر بہت بہت شکریہ ادا کر کے کاغذ سمیٹے۔ انہوں نے کہا''سپرنٹنڈنٹ سے مہریں لگوا لیجئے''۔

یعنی ہماری ہر مشکل آسان کر دی، ہم نے ایک بار پھر شکریہ ادا کر دیا۔ واپس آنے لگے تو انہوں نے کہا''ینگ مین۔ کیپ اپ دس سپرٹ'' مطلب یہ کہ اس جذبے کو قائم رکھنا۔ کمرے سے باہر آ کر ہم نے ان کے نام کی تختی پڑھی۔ وہ مدارسی تھے۔ جو عموماً غیر متعصب اور کشادہ دل ہوتے ہیں۔

دوبارہ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے پاس گئے۔ فہرست اور کاغذات ہمارے ہاتھ میں تھے۔ ہمیں دیکھ کر ان کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نمودار ہوئے گئے۔ بولے''پھر آ گئے۔ میں نے کہا تھا کہ یہ ناممکن ہے؟''

ہم نے فہرست ان کے سامنے رکھ دی۔''سیکرٹری صاحب نے کہا ہے اس پر آپ سے مہریں لگوا لیں''۔

انہوں نے حیرت اور بے یقینی سے فہرست کو اور پھر ہم کو دیکھا۔ غور سے سیکرٹری صاحب کے دستخطوں کو دیکھا، پھر مہر اٹھا کر ان پر ٹھپہ لگا دیا۔

ہمارا ناممکن مشن ممکن اور مکمل ہو چکا تھا۔ خوشی خوشی گھر پہنچے۔ جواد بھائی تو مہر لگی ہوئی فہرست دیکھ کر حیران رہ گئے تھے مگر انیسہ آپا ہمیں پھر گلے لگا کر رونے لگیں۔

یہ داستان تفصیل سے بیان کرنے کا بھی ایک مقصد ہے جو بہت جلد آپ کو معلوم ہو جائے گا۔

(جاری ہے)

◆◆◆

تمھیں یاد ہو......

...... 4 ......

عزیز میرٹھی

ہمیشہ صاف ستھرے رہنے والے بڑے سنجیدہ اور بردبار قسم کے آدمی تھے۔ چہرے مہرے سے افسرانہ وقار تمکنت برستی۔ اثنا عشری فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ مگران کے دوستوں اور ملنے جلنے والوں میں اکثر بہت سنی عقیدے کے لوگوں کی تھی۔ محرم کے دنوں میں نذر نیاز اور دودھ شربت کی سبیل کا اہتمام کرتے مگر میں نے انہیں ماتم کرتے کبھی نہیں دیکھا۔ ابا جان کے ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے ریلوے ہیڈ کوارٹر آفس میں ڈرافسمین تھے۔ انگریزی زبان پر عبور حاصل تھا۔ اردو فارسی کی کلاسیکی ادبیات نظم ونثر پر حاوی تھے۔ عربی زبان اور ادب سے بھی شغف رکھتے تھے۔ ڈرافٹسمین ہونے کی وجہ سے انہیں لکیریں کھینچنے پر چاہے وہ لکیریں مستقیم ہوں۔ اٹھتی ہوں، یا گول دائرے کی صورت، اپنی مہارت تامہ حاصل تھی۔ چار شادیاں انہوں نے کس خوشی میں کی تھیں یہ معلوم نہ ہوسکا۔ ممکن ہے اس کی وجہ اولاد کی آرزو ہو۔ لیکن چار شادیاں رچانے کے باوجود بھی اولاد کو ترستے ہی رہے۔ میں نے ابا جان سے انہیں بڑی حسرت سے یہ کہتے سنا۔

''ماسٹر! لوگ بیٹے کی دعا مانگتے ہیں، مولا کریم، آل رسول کے صدقے مجھے ایک بیٹی ہی دے دیتا تو اس کے خزانے میں کیا کمی آ جاتی، مگر اب تو آس ٹوٹ چکی، کسی سے دعا کے لئے بھی کیا کہوں؟'' ابا انہیں تسلی دیتے۔

''میر صاحب! خدا پر بھروسہ رکھیے، مایوسی گناہ ہے۔ اس کے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں ہے۔ صبر کیجئے، صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے''۔

لیکن وہ سچ کہتے تھے۔ جب جوانی میں ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی تو اب تو وہ ویسے بھی عمر کے اس حصے میں قدم رکھ چکے تھے جہاں درخت بھی پھل پھول دینے سے معذور ٹنڈ منڈ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ بلکہ آخری عمر میں ایک بے حد حسین و جمال اور نوجوان عورت سے شادی کرنا، ان کی سب سے بڑی حماقت اور تلخ ترین تجربہ تھا۔ مگر اس تجربے کا کیا فائدہ۔

ایک رات جب شہر خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا، ہر طرف گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا، اچانک دلدوز چیخوں سے حویلی گونج اٹھی۔ میری آنکھ کھل گئی، میر صاحب ابا کو پکار رہے تھے۔

''ماسٹر صاحب! ماسٹر صاحب! جلدی آیئے، خدارا! مجھے اس قطامہ سے بچایئے''۔

مجھے ہمیشہ سے ان دیکھی چیزوں کی کھوج اور ان دیکھے مقامات اور ان مسخ واقعات کی جستجو رہتی تھی۔ رضائی سے نکل کر ابا کے پیچھے بھاگا اور ایک کی جگہ دو دو سیڑھیاں پھلانگتا، طویل صحن سے گزر کر میر صاحب کے کمرے میں پہنچا تو میں نے دیکھا میر صاحب مسہری پر اوندھے منہ پڑے چیخ رہے ہیں اور ان کی بیوی حسینہ نے کسی ڈریکولا کی طرح ان کی گوری چٹی پیٹھ پر اپنے دانت گاڑے ہوئے ہیں۔ اور

میر صاحب قربانی کے بکرے کی طرح چلا رہے ہیں۔

''ماسٹر صاحب! بچائیے، خدا کے لیے اس حرافہ سے میری جان چھڑائیے''۔

بظاہر یہ ایک غیر اخلاقی حرکت تھی۔ ابا جان کو ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ کسی غیر پردہ دار خاتون پر ہاتھ اٹھائیں، لیکن میر صاحب کی مسلسل چیخ و پکار اور دل دوز فریاد پر ابا نے اس خونخوار حسینہ کے گیسوئے خمدار کی مٹھی بھری اور ایک جھٹکے سے میر صاحب کی پیٹھ سے الگ کیا۔ جہاں لہو کے قطرے ابھر آئے تھے۔ ابا جان نحیف و نزار آدمی تھے اس قتالہ نے ان کا ہاتھ جھٹک اپنے بال چھڑا لیے اور حقے کی نے نکال کر میر صاحب پر بل پڑی اور روئی کی طرح دھنک ڈالا۔

''موئے ہیجڑے، اپنا بس نہیں چلتا تو اب غیروں سے مجھے بے آبرو کرائے گا''۔

ابا نے بڑی مشکل سے حقے کی نے اس کے ہاتھ سے چھینی اور وہ بڑبڑ کرتی، دوسرے کمرے میں اپنی سوکن کے پاس چلی گئی۔

''بڑے افسوس کی بات ہے میر صاحب! یہ تماشہ تو اب روز کا معمول بن گیا۔ ذرا سوچیئے محلے والے کیا کہیں گے۔'' ابا نے پاجامہ پہنا کر اس کا ازار بند باندھتے ہوئے کہا۔ میر صاحب انتہائی نڈھال اور بدحواس ہو رہے تھے۔

''اسے میری شامت اعمال کہیے ماسٹر صاحب اور کیا کہا جا سکتا ہے؟''

میر صاحب کی چاروں بیویوں سے ان کی قدر شناسی اور خدمت و تابعداری صرف پہلی بیوی نے کی، جو اگرچہ سن رسیدہ ہو چکی تھی مگر اب بھی ان کا احترام اور حق زوجیت ادا کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتی تھی، کھانا پکانا، برتن بھانڈے اور صفائی ستھرائی غرضیکہ ساری گھریلو ذمہ داری اس کے نحیف کاندھوں پر تھی۔ باقی تینوں تو دن چڑھے تک سوتی رہتیں۔ بناؤ سنگھار میں لگی رہتیں یا ریڈیو سنتی رہتیں۔ ستم ظریفی یہ کہ ضعیف، میر صاحب اپنی تینوں نوجوان بیویوں کے جور و ستم کا غصہ غریب کنیز فاطمہ پر اتارتے۔ مگر وہ بے چاری اف تک نہ کرتی۔ جہاں دوسری بیویوں کو رومانی اور جاسوسی ناول پڑھنے اور کیرم کھیلنے سے ایک پل فرصت نہ ملتی وہاں کنیز فاطمہ روز و شب صوم و صلوٰۃ اور یاد الٰہی میں مصروف رہتی۔

میر صاحب بڑے خوش نویس تھے، وہ پارسل پر انگریزی میں کسی کا نام اور پتہ لکھتے، تو مجھے ان کا خط انگریزی اخبار میں چھپی ہوئی تحریر کی طرح لگتا۔ اسی طرح اردو میں بھی ان کی اس خوبی میں میرے لئے بڑی کشش تھی۔ میں انہیں لکھتے ہوئے بڑی توجہ سے دیکھا کرتا اور خود بھی خوش خط لکھنے کی کوشش کرتا۔ اور میر صاحب کو دکھاتا تو وہ میری تعریف کرتے۔ میں تعریف کا بھوکا تھا۔ وہ قلم لے کر اپنے ہاتھ سے چند فقرے میری کاپی پر لکھ دیتے۔ کبھی ایڈورڈ ہفتم کی تصویر بنا دیتے۔ یہ تصویر مجھے تمام سکوں اور نوٹوں پر بھی نظر آتی تھی۔ میں بڑی دلچسپی اور حیرت سے پنسل کو کاغذ پر تصویر کشی کرتے دیکھتا اور میر صاحب کے قلم پر رشک آتا۔ یہ کیسا کمال تھا، وہ کبھی آنکھ، کبھی ناک، کبھی کان اور کبھی ہونٹ بنا دیتے۔ کبھی پورا انسانی چہرہ۔ کسی عورت کا، کسی مرد کا، کسی بچے، جوان اور بوڑھے آدمی کا کبھی چوپائے کتا بکری گائے اونٹ ہاتھی، کبھی چڑیا مرغی اور کبھی باز، غرض دیکھتے ہی دیکھتے چند لائنوں سے یہ شبیہیں کاغذ پر مرتسم ہو جاتیں اور کسی اصل کے مطابق ذرہ برابر فرق نہیں۔ مسلسل مشق سے میں نے بھی چند روز میں، لکیروں کو حسب منشا کھینچنے کی استعداد حاصل کر لی۔ میری تصویر ہو بہو اصل کے مطابق تو نہ ہوتی، تاہم اس کے قریب ضرور پہنچ جاتا۔ کبھی میر صاحب، کسی پرانے شاعر کا شعر میری کاپی پر لکھ دیتے۔ غالبؔ، میر تقی میرؔ اور مومنؔ کے کئی اشعار میری کاپی پر لکھ کر مجھے ان کے معنی سمجھاتے، جو میری سمجھ میں کم ہی آتے، میر انیس کے کئی بند انہوں نے، میری کاپیوں پر لکھے، ایک بار

انہوں نے جلی قلم سے نہایت خوش خط الفاظ میں تحریر فرمایا۔

تھا چرخ اخضری پہ وہ رنگ آفتاب تھا کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

شعر لکھ کرا سے کئی بار اور کئی انداز میں پڑھا اور بولے۔

''عزیز بیٹا! شعر کہنا ایک روپ ہے۔ اور اس کی ادائیگی کے روپ ہیں'' میں سمجھتا ہوں بہت بعد میں، جب میں نے فلمی دنیا میں قدم رکھا اور کہانی سنانے پر مجھے جو قدرت حاصل ہوئی، وہ اسی ابتدائی تربیت اور میر صاحب کے فیضان صحبت کا نتیجہ تھی۔ شروع میں جب مجھے تصویر کشی کا چسکا پڑا۔ تو میں اپنا جیب خرچ تک کلر بکس، برش، پنسل اور ڈرائنگ پیپر پر خرچ کر ڈالتا تھا۔ سکول سے آتے ہی جب دوسرے بھائی اور محلے کے لڑکے، اخروٹ، پل گولی، گلی ڈنڈا اور کبڈی وغیرہ کھیلنے میں مگن رہتے۔ میں اکیلا کمرے میں بیٹھا رات گئے تک تصویریں بنانے میں لگا رہتا۔ اس وقت مجھے کھانے پینے کا خیال بھی نہ آتا۔

ویسے بھی مجھے کھیل کود کا زیادہ شوق نہ تھا۔ قصے کہانیاں اور اخبار رسالے پڑھنے سے زیادہ دلچسپی تھی۔ اخبار زمیندار، احسان اور انقلاب روزانہ اور رسالے نیرنگ خیال، عالمگیر، مخزن اور شاہکار ہر مہینے پڑھنے کو ملا کرتے تھے۔ بعد میں حضرت خواجہ حسن نظامی کے اخبار درویش اور منادی بھی باقاعدگی سے آنے لگے۔ ایک رسالہ ریاست بھی آیا کرتا تھا۔ جس کے ایڈیٹر غالباً ایک سردار جی دیوان سنگھ مفتون تھے۔، بڑے بڑھوں کی باتیں سننے اور کتابیں پڑھنے کا اتنا شوق تھا کہ الف لیلیٰ، فسانہ عجائب، باغ و بہار، طلسم ہوشربا، داستان امیر حمزہ اور مولانا عبدالحلیم شرر کے سارے ناول چاٹ گیا۔

(جناب عزیز میرٹھی اپنی کہانی سناتے سناتے اس دنیا سے اُٹھ گئے۔ اب یہ کہانی ادھوری رہے گی۔) (ختم شد)

◆◆◆

تخلیق مندرجہ ذیل مقامات پر دستیاب ہے

کراچی	دانش کدہ (پروپرائیٹر : شوکت علی) زہرا سکوئر، بلاک نمبر 6، گلشن اقبال (0300-2387965)
لاہور	ایسٹ بک ڈپو (پروپرائیٹر : محمد علیم) 6-B، مال روڈ، لاہور (0320-4343588)
گوادر	قندیل نیوز ایجنسی (پروپرائیٹر: شبیر شاکر) پیشکان ضلع گودار، بلوچستان (0322-3761579)

سفر نامہ

سورج کے رُخ پر

......4......

ڈاکٹر ابدال بیلا

فرانکفرٹ

فرانکفرٹ ایئرپورٹ پہ پی آئی اے کے جہاز سے اُتر کے ہمارے پاکستانی مسافر جرمنی کے اس پیلے رنگ کے شوخ چمکتے ایئرپورٹ پہ یوں چہار اطراف دیدے پھاڑے ہونق بنے سہمے تکنے لگے جیسے ان کے چہروں پہ بڑی عید سے ایک رات پہلے کسی ویران سی اُداس بستی کی اس بھیڑ کی آنکھیں آ لگی ہوں جو اچانک کسی ٹرک سے اتاری جانے کے بعد لاہور کے جگ مگ کرتے ڈیفنس کی بکرا منڈی میں اتار دی گئی ہو۔ اکا دُکا گورے جو نجانے کیسی مجبوری یا کس غلطی سے اس جہاز پہ چڑھ کے چڑ مڑ ہونے آئے تھے، وہ ایک دم سے جیسے استری ہو گئے۔ ان کے جسموں پہ کلف پھر سے لگ گیا۔ سفر کی تکان اور بغیر الکوحل کے لی ہوئی جمائیوں کے انتقام میں وہ لمبے لمبے ڈگ بھر کے لپک کے یورپین کونٹر پہ جا کھڑے ہوئے۔ پاکستانیوں کے لیے علیحدہ کونٹر تو ان دنوں نہ بنا تھا مگر ایشیا والوں کے کونٹر پہ کھڑے ہونا، یورپ میں ایسے ہی ہے جیسے اسلام آباد کے بلیو ایریا میں کوئی سرِ عام کندھ کوٹ کا ڈومی سائیل کھول کے دکھانے لگے۔ پاکستانی مسافر منہ کھول کھول کے جمائیاں لیتے، گردن، بغلیں اور سرعام اپنی پتلوں یا شلوار کے آسن کھجاتے بے ڈھبے ہولے ہولے سرکتے کونٹر پہ بنی قطار میں آ آ کر کھڑے ہونے لگے۔ اسی قطار کے آس پاس ہمارے پینتیس کرنل اور دو جرنل ابھی تک قطار میں کھڑے یا نہ کھڑے ہونے کے تذبذب میں تھے۔ آخر جرنل احسان نے مجھے آنکھ کے اشارے سے آگے جا کر کونٹر پہ بات کرنے کو کہا۔ میں سمجھ گیا۔ ہزاروں سال کی غلامی کے بعد ہمیں اپنی بھیڑوں کو ہانکنے والے بھیڑیوں کی کھال ملی تھی۔ ہم کیا پھر بھیڑوں میں کھڑے ہو کے اپنی کھال کھنچوائیں۔ ناممکن! قطار ہمارے لیے نہیں ہو سکتی۔ میں قطار کو توڑتا دندناتا کونٹر پہ آ گیا۔ کونٹر پہ کھڑے آفیسر سے بات کی۔ ہاتھ میں پکڑا سرکاری نیلا پاسپورٹ اسے دکھایا۔ اس میں چپکی اپنی یونیفارم والی تصویر اس کے سامنے لہرائی۔ اسے بتایا کہ ہم کتنے ہیں۔ وہ جرمن آفیسر بھی ہماری پوری تاریخ اور حال سے واقف لگتا تھا۔ شاید اپنے ملک کی تاریخ سے بھی وہ بے علم نہ ہو، جانتا ہو کہ دوسری جنگ عظیم سے پہلے، جنگ کا طبل بجانے سے قبل اگر اس نے ہمیں اپنی غلامی میں لے لیا ہوتا تو ہم اس کی طرف سے ایسا لڑتے کہ آج دنیا کا نقشہ اور ہوتا۔ وہ اب شاید مزید کوئی غلطی کرنا نہ چاہتا تھا۔ اس نے کمالِ شفقت سے میرے سارے ساتھیوں کو کونٹر کے ایک طرف اکٹھا ہونے کا اشارہ کیا۔ میرے ساتھیوں کو جمگھٹا بنانے میں عزتِ نفس کی بحالی نظر آئی۔ عزتِ نفس تو قطار میں کھڑا ہونے سے ہم مجروح ہوئی سمجھتے تھے۔ بکریوں کی طرح ایک دوسرے میں سینگ پھنسا کے کھڑے ہونے سے ہمارے چہروں پہ پھر بشاشت آ گئی۔ کونٹر پہ کھڑا جرمن گورا ٹک ٹک میرے ساتھیوں کے نیلے پاسپورٹس پہ

مہریں لگانے لگا۔ مہر لگاتے ہوئے وہ ہر ایک سے مصافحہ کرتا اور مسکرا کے ''ویل کم'' کہتا۔ سب کونٹر سے اندر آ گئے۔ اچانک میں نے غور کیا، میرے پاسپورٹ پہ تو مہر لگی ہی نہیں۔ میں بھاگا اندر سے پھر باہر کی طرف کونٹر پہ آیا اور کہا، ایک مہر اِدھر بھی۔ وہ ہنسا اور ٹھپ سے میرے پاسپورٹ پہ ٹھپا لگا دیا۔ میں اب قانون کے مطابق جرمنی میں تھا اور مجھ پہ جرمنی کا قانون واجب تھا۔ اتنے میں جرمنی میں ہمارے ڈیفنس اتاشی کرنل صاحب بھی پہنچ گئے۔ دونوں جرنیلوں کو اس نے زوردار سلوٹ مارے، ہم سب سے تپاک سے ملے۔ فرانکفرٹ سے آگے بون کے لیے فلائٹ کی بریفنگ دی۔ پتہ چلا کہ فرانکفرٹ سے بون کی فلائٹ ساڑھے چار گھنٹوں بعد کی ہے، جس میں ایک ساتھ اتنی سیٹیں اکٹھی ملی تھیں۔ مگر میرا مسئلہ اور تھا۔ مجھے فرانکفرٹ سے بون جہاز سے نہیں ٹرین سے جانا تھا۔ مجھ سے زیادہ میری فکر میرے جرنیل کو تھی۔ وہ ڈیفنس اٹیچی سے بولے فوراً کرنل بیلا کو ٹرین پہ بٹھا کے آؤ اور بون ریلوے اسٹیشن پہ انہیں کوئی لینے گاڑی بھی پہنچے۔ بات اصل میں یہ تھی میرے اس ٹرین سفر میں میرے ساتھ جرنیل صاحب کی بیگم صاحبہ نے بھی جانا تھا۔ ہماری کلاس فیلو جو ایک دوسرے جرنیل کی بیوی تھی انہوں نے بھی ٹرین سے ہی جانے کا سوچا تھا۔ ٹرین پہ ہمارا چوتھا ساتھی ہماری کلاس کا واحد سویلین ڈاکٹر رشید تھا۔ ہم چاروں اپنا اپنا سامان ٹرالیوں پہ لادے، ساتھیوں کو ہاتھ ہلا کے ٹرین کے لیے نکلے۔ ایئرپورٹ تو پورا شہر تھا۔ چم چم کرتے فرش، لش لش سجے سٹال، دنیا کی ہر ایئرلائن کا ادھر کاؤنٹر، کھلکھلاتے راستے، مسکراتی راہداریاں، اوپر نیچے سرکتی برقی سیڑھیاں، اِدھر سے اُدھر آتے جاتے لوگوں کا ہجوم۔ پتہ چلا ہر دس سیکنڈ بعد وہاں کوئی جہاز اترتا ہے یا ادھر سے اُڑتا ہے۔ بے آواز گھومتے پہیوں والی ٹرالیاں، عجیب ریشمی وقار سے فرش پہ پڑتے لوگوں کے چلتے قدم اور سریلی آواز میں جرمن اور انگریزی میں ہر فلائٹ کی اناؤنسمنٹ جو نہ کانوں میں چبھتی نہ ذہن پہ بوجھل ہوتی اور جو کہا گیا ہوتا اس کی سمجھ بھی پوری آتی۔

ایئرپورٹ سے باہر نکلنے کی راہ کے آگے کھڑی مرسڈیز کاروں کی قطار مجھے نظر آ رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ ڈیفنس اٹیچی نجانے کس مرسڈیز میں بٹھا کے ہمیں ریلوے اسٹیشن لے جائے گا۔ مگر اس نے باہر جانے کا راستہ چھوڑ کے ہمیں نیچے اُترتی برقی سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ہم نے اپنے اٹیچی کیس ٹرالی سے اتار کے اترتی سیڑھیوں پہ کھڑے ہو گئے۔ سیڑھیاں ملائمت سے نیچے اترنے لگیں۔ جیسے کوئی کسی کے دل میں اترتا ہے۔ چند لمحوں بعد پھر وہی منظر تھا۔ وہی راستے وہی راہداریاں اور چہار اطراف اُجلے پیلے پن میں شوخ مہکتے سٹال اور ایئرلائنز کے کاؤنٹر اور باہر جاتے راستے کے آگے پارکنگ میں کھڑی کاریں اور بسیں۔ یا اللہ، یہ فرش کے نیچے فرش کیسے نکل آیا۔ شاید وہ یہیں کسی بس میں بٹھا کے ریلوے اسٹیشن لے جائے گا، میں سوچ رہا تھا۔ وہ پھر باہر کی طرف نکلتا راستہ چھوڑ کے ہمیں نیچے اترتی آہنی سیڑھیوں کی طرف لے آیا۔ ہم چاروں نے ہونقوں کی طرح ایک دوسرے کا منہ دیکھا اور پھر اپنے اپنے اٹیچی کیس اپنے جوتوں پہ رکھ کے ایلی ویٹرز کی کنی پکڑ کے کھڑے ہو گئے۔ سیڑھیاں ہمیں لیے لیے دھیرے دھیرے اترتی گئیں۔ ہم گردنیں گھما کے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ نیچے پھر وہی دمکتے در و دیوار، چمکتا فرش اور باہر نکلتے راستے میں ریل کی پٹڑی بچھی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی شیشے کی دیواروں کے اندر جگ مگ کرتا ہوا ریلوے اسٹیشن اور ریلوے اسٹیشن پہ ایک اجلی ملائم ٹرین بھی کھڑی تھی۔ میرا تو دماغ ماؤف ہو گیا۔ یہ کیا دیکھ رہا ہوں۔ یہاں فرانکفرٹ میں زمین کی کتنی منزلیں ہیں؟ آخر پوچھ ہی لیا۔ ڈیفنس اتاشی بولا، یہ انٹرسٹی ٹرینوں والا اسٹیشن ہے۔ یہیں سے ہماری گاڑی بون جائے گی۔ شہر کے اندر گھومنے پھرنے والی ٹرین کا اسٹیشن ایک منزل اور نیچے ہے۔ وہ ریلوے اسٹیشن دکھا کے چلا گیا۔ میں دونوں خواتین اور ڈاکٹر رشید کو لے کر ٹکٹ کاؤنٹر کی طرف گیا۔ ان تینوں نے مجھے اپنے اپنے پاسپورٹ پکڑا دیے اور خود کاؤنٹر کے سامنے لگی کرسیوں پر بیٹھ

گئے۔ ان سب کے چہرے بلینک تھے۔ صرف یہ لکھا پڑھا جا رہا تھا کہ ہمیں کچھ نہیں پتہ، کیا کرنا ہے، کدھر جانا ہے، کیسے جانا ہے۔ وہ سب میری طرف ایسی نگہ سے دیکھ رہے تھے جیسے ہر عید پہ عید کی نماز پڑھنے سے پہلے امام کو دیکھتے ہیں کہ کب اور کتنی تکبیریں یہ پڑھے گا، میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ ساتھ دو جرنیلوں کی بیگمات تھی جو مجھ پہ اعتبار کیے بیٹھی تھیں جیسے پچھلے جنم میں مَیں ہٹلر کا اے ڈی سی رہا تھا۔ چوتھا ساتھی، سادہ لوح ڈاکٹر رشید تھا جس کی ساری عمر لاہور میں مصری شاہ سے تانگے پہ بیٹھ کے دہلی گیٹ آتے جاتے یا سکوٹر سے بانساں والے بازار میں ون وے کی خلاف ورزی میں میو ہسپتال پہنچنے میں گزری تھی۔ وہ تو فرانکفرٹ اترنے سے پہلے اپنی انارکلی کو ہی دنیا کا آٹھواں عجوبہ سمجھ کے چین سے رہتا آیا تھا۔ اس کی ہوائیاں اُڑی ہوئی تھیں۔ فرانکفرٹ ایئرپورٹ کی تین منزلیں اُتر کے اس ریلوے اسٹیشن کے ٹکٹ کاؤنٹر تک آتے آتے جیسے اس پہ زندگی کی اگلی تین صدیاں گزر گئی تھیں، وہ ایک دم سے بوڑھا نظر آنے لگا تھا۔ میں نے باہر سے اپنے چہرے پہ تریڑ نہ آنے دی تھی مگر اندر سے میں بھی کرچی کرچی ہوا ہوا تھا۔ اکیلا ہوتا تو کوئی بات نہ تھی۔ ایک جرنیل کی بیگم بھی کورٹ مارشل کرانے کے لیے کافی تھی، وہاں تو دو تھیں۔ میری ٹانگیں کیوں نہ کپکپاتیں۔ ایک پردیس، دوسرا ہر سائن بورڈ صرف جرمن زبان میں لکھا ہوا۔ ایک سطر بھی انگریزی کی کہیں نہیں تھی۔ سمجھ نہ آئے، کدھر ہوں، کدھر جانا ہے، کس طرف کو جانے والی ٹرین پہ چڑھوں گا، اُتروں گا کہاں۔ پوچھوں کس سے؟ انگریزی لوگ ادھر جانتے نہیں، جو جانتے بھی ہیں وہ زہر پچکاری نظر سے دیکھ کے سر اِدھر اُدھر ہلا کے گزر جاتے ہیں۔ لوگ بھی بہت تھوڑے تھے اِدھر۔ ٹکٹ کاؤنٹر خالی تھا۔ قریب گیا تو شیشے کی کھڑکی کے پیچھے مجھے مرینڈا بیٹھی نظر آئی۔ اسے دیکھتے ہی مجھے کھٹی میٹھی اورنجی مرینڈا کا خیال آیا۔ قریب جا کے اس کے پہنے کوٹ کے سینے پہ اٹھے دائیں اُبھار پہ لگی نیم پلیٹ کو ہجے کرتے کرتے پڑھنے لگا تو مرینڈا ہی پڑھا گیا۔

ہیلو!

ویل کم!

وہ صاف ستھری انگریزی بول رہی تھی۔ میری جان میں جان آئی۔ ٹکٹوں کے لیے چاروں پاسپورٹ اسے تھمائے اور بون کا نام لیا۔ وہ کمپیوٹر پہ ہمارے نام لکھتے ہوئے بولی۔

''سموکر یا نان سموکر؟''

''سموکر''

''اوکے۔'' اس نے ٹک ٹک کمپیوٹر پہ اُنگلیاں ماریں اور اگلے لمحے پرنٹر سے چاروں ٹکٹ شرشر کر کے پرنٹ ہونے لگے۔ جو ٹکٹ پرنٹ ہو جاتا وہ اُچھل کے سر اٹھاتا، وہ لپک کے اسے پکڑ کے شرر رکر کے کاٹ کے لفافے میں ڈالنے لگتی۔ اس نے مجھ سے لیے ڈش مارک گنے اور چاروں لفافے مجھے تھما کے زیرِ لبی بولی، ''ہیو اے گڈ جرنی۔'' میں نے مسکرا کے شکریہ ادا کرنے کو سر ہلا دیا مگر خود نہ ہلا۔ ویسے بھی میرے پیچھے کوئی نہ تھا۔ میں اکیلا ٹکٹ خریدنے والا مسافر تھا۔ وہ سمجھ گئی، مجھے کچھ پوچھنا ہے۔

بولی، ''یو وانٹ ٹو نو سم تھنگ؟'' (کچھ پوچھنا ہے)

میں نے ٹکٹ کے لفافے سے اپنا ٹکٹ نکالا اور بولا، ''سم تھنگ نہیں مینی تھنگز'' (کچھ نہیں، بہت کچھ پوچھنا ہے)

بولی، ''پوچھو!''

میں نے کہا،" مجھے لگتا ہے، تمھارا نام مرینڈا ہے۔"

اس نے حیرانی سے پوری آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا اور پھر اپنی نگہ گھما کے اپنے سینے کے دائیں ابھار پہ لگی نیم پلیٹ کی طرف کی اور بولی" ہاں، مرینڈا ہی ہے" مگر اس کا چہرہ کہہ رہا تھا کہ یہ کیا سوال ہوا۔ میں نے اس کا اچنبھا بھی پڑھ لیا اور وضاحت کرنے کے انداز میں بولا، مرینڈا میں نے اس لیے پڑھ لیا کہ میرا پسندیدہ مشروب ہے۔ مگر پڑھ کے پوچھنے کی وجہ یہ تھی کہ اطمینان کر سکوں کہ میں جرمن زبان میں لکھا کوئی نام پڑھ سکتا ہوں۔ مجھے جرمن زبان نہیں آتی۔ میں بہت فکرمند ہوں۔ مرینڈا مسکرائی، جیسے اسے میرے مرینڈا کے گھونٹ بھرتے ہوئے کسی ان دیکھے لمحے کا خیال آ گیا۔ بولی، بتاؤ کیا پریشانی ہے؟ مرینڈا، پہلی پریشانی یہ ہے کہ میں کسی غلط ٹرین پہ نہ چڑھ جاؤں۔ مجھے تو یہ بھی نہیں پتہ کہ بون اس ریلوے لائن کے دائیں طرف ہے یا بائیں طرف۔

بولی، دوسری پریشانی؟

پلیٹ فارم کون سا ہوگا؟ یہاں تو بہت سے پلیٹ فارم ہیں۔ وہ کھلکھلا کے مسکرانے لگی۔ بولی، بولتے جاؤ۔

میں نے سوچا کہ مرینڈا کا ڈھکن کھل گیا ہے۔ شوں شوں کر کے اپنے میٹھے سیال بلبلے اُچھال رہی ہے۔ پتہ نہیں میری احمقانہ باتوں کا مزہ لے رہی ہے یا کوئی حل بھی بتائے گی، اپنی تیسری فکر بھی بتا دی۔ بولا فرض کرو، میں صحیح ٹرین پہ چڑھ بھی گیا تو کیسے پتہ چلے گا کہ بون آ گیا۔ کہیں آگے پیچھے اُتر گیا تو، مجھے اپنے ساتھ، دور بیٹھی دونوں جرنیلوں کی بیگمات سے وابستہ تمام تر ممکن ہائے وحشت انگیزیوں کا علم تھا۔ جس جس بات سے ذہن میں کھلبلی مچی تھی، مرینڈا کو بتا دی۔ مرینڈا کوئی ستائیں اٹھائیس سال کی ہنس مکھ بھرے بھرے جسم والی گوری تھی۔ میری سنی باتوں کے علاوہ بھی نجانے کیا اندیشے اس نے میری بدن بولی سے پڑھ لیے۔ بولی اور بھی کوئی فکر ہے؟ وہ مسکرائے جا رہی تھی۔ ہاں ہے، گاڑی کے جس ڈبے میں چڑھنا ہے وہ پلیٹ فارم میں ہوگا کدھر؟ میرا دماغ تو ماؤف ہو گیا ہے، میں نے دائیں ہاتھ میں چاروں ٹکٹ لہرائے اور بائیں ہاتھ سے اپنے سر کے بالوں میں کھجلی کی۔ پھر بوکھلا کے بولا، میری ٹرین کے آنے میں پینتیس منٹ رہ گئے ہیں۔

بولی پینتیس نہیں پونے پندرہ منٹ رہ گئے ہیں۔ اوہ، میرے ہاتھ پیر پھول گئے۔ تو، اب بتاؤ میری پریشانیوں کا حل۔

مرینڈا بولی، پہلی بات یہ کہ تم شانت ہو جاؤ، ریلیکس۔

مگر کیسے مرینڈا۔

بولی، تمھارے پاس گھڑی ہے؟

ہے، میں نے کلائی اس کے آگے کر دی۔ اس نے اُچٹتی نگاہ ڈالی اور بولی یہ وقت کس ملک کا ہے تمھاری گھڑی پہ؟

میرے ملک پاکستان کا۔

اس نے پھر میری گھڑی کو اشارے سے قریب کرنے کا کہا۔

غور سے وقت دیکھا، کچھ سوچا، پھر بولی یہ تو تمھارے ملک پاکستان کا وقت نہیں ہے۔

ہاں، میں اپنی گھڑی پہ وقت بیس منٹ آگے رکھتا ہوں۔ بولی کیوں، میں نے کہا، وہاں ضرورت ہے۔ تم نہیں سمجھو گی ساری باتیں۔ مجھے میرے خدشوں کا حل بتاؤ۔ بولی، آپ فوراً ریسٹ واچ پہ جرمنی کا وقت کریں، وہ دیکھیں سامنے کے کلاک پہ۔ سیکنڈ کی سوئیوں تک، ایگزیکٹ جرمن ٹائم۔ میں نے سر کھول کے ساتھ بندھی بھینس کی طرح اِدھر اُدھر ہلایا او بولا، مرینڈا، میں اپنی گھڑی پہ اپنے ملک کا

وقت نہ رکھوں تو مجھے پتہ نہیں چلتا کب رات ہوئی، کب دن نکلا۔صبح ہے یا شام ہے۔آنکھیں جو مرضی دیکھیں، دماغ اس گھڑی کی سوئیوں سے بندھا ہے، برس ہابرس سے۔ مجھے ڈر ہے اگر کبھی میں نے اپنی گھڑی کا وقت بدلا تو میں اپنے ملک کے وقت سے باہر گر پڑوں گا۔تم میری گھڑی کی سوئیاں نہ ہلاؤ، مجھے میرے مسئلوں کا حل بتاؤ۔ بولی، پھر ایک کام کرو، وہ سامنے سووینئر شاپ سے ایک سادہ ڈیجیٹل رسٹ واچ خرید لو۔ میں پریشان ہو گیا۔ وقت اتنا کم رہ گیا، پریشانیاں اتنی حل کسی کا بھی نہیں اور یہ مجھے شاپنگ کا کہہ رہی ہے۔ میرے ماتھے پہ پسینہ آ گیا۔ پریشانی میں کوٹ کی فرنٹ جیب میں سجا ہوا رومال کھینچ کے ماتھے پہ ملنے لگا۔ رومال سے سر اور ماتھا رگڑا تو مجھے اپنے کوٹ کے اندر کی جیب میں تین چار رنگوں کے قلم ٹنگے نظر آئے۔ ایسے ہی وہم ہوا یہ گر جائیں گے۔ ٹانگوں میں دبائے ہینڈ بیگ کو نیچے سے اٹھا کے بدحواسی میں کاؤنٹر کی سل پر رکھ کے کھولا تو اس کے اندر ڈھونسی کتابوں میں سے ایک کتاب نکل کے کاؤنٹر پر مونڈھی گری۔ کتاب کا بیک ٹائٹل اوپر آ گیا۔ مرینڈا کی نظر اس پہ پڑی تو وہ چونکی، یہ تصویر کس کی ہے کتاب کے بیک ٹائٹل پہ؟ میں کوٹ کی جیب سے تین چار قلم نکال کے بیگ میں ٹھونستے ہوئے بولا، میری ہے۔

آر یو آتھر آف دس بک؟

ایک لمحے کے کوئی پچاسویں حصے میں میرے چہرے پہ مسکراہٹ آئی اور میں نے آہستگی سے کہا۔ میں درجنوں کتابوں کا مصنف ہوں۔ میں نے تین چار قلم بیگ میں ٹھونس دیے۔ ایک قلم ہاتھ میں لے کر دوبارہ کوٹ کی جیب میں لگانے لگا تو مجھے محسوس ہوا وہ بڑی محویت سے مجھے دیکھ رہی ہے۔ میں کوٹ کی جیب میں قلم رکھتے رکھتے رُک گیا۔ ایک نظر مرینڈا کی طرف دیکھا، مجھے لگا وہ سنبھل کے اپنی نشست پہ کچھ اٹھ کے بیٹھی ہے۔ بولی، یو آر اے رائٹر، فکشن رائٹر، اوتھر؟

جی! اوہو، مجھے خیال آیا، مارا گیا۔ پہلے ہی پریشانی ہے۔ اب یہ خفت الگ۔ جیسے ہمارے ملک میں ادیبوں، شاعروں کا مذاق اُڑتا ہے۔ یہ بھی پھبتی اُڑائے گی، میں چور نظر سے اسے تکنے لگا۔ وہ عجیب سی عقیدت کے رنگ میں رنگی مجھے دیکھ رہی تھی۔ مرینڈا کے اندر کے سارے میٹھے شوں شوں کرتے بلبلے برف کی ڈلیوں سے نکل کے جیسے شہد رس میں رِستے رسیلے ہوتے جا رہے تھے۔ بولی ایک فیور کرو گے۔ میں تمھارے سارے مسئلے حل کر دوں گی۔

بولو، مرینڈا۔ مجھے پسینہ آیا ہوا تھا۔ میں تمہیں جرمنی کے عین صحیح وقت پہ لگی لگائی گھڑی دیتی ہوں، یہ لو، اس نے دراز کھول کے ایک بچوں والی ڈیجیٹل رسٹ واچ نکال کے مجھے پکڑا دی، بولی یہ میں نے اپنے بھتیجے کو گفٹ دینے کے لیے لے رکھی تھی۔ پہن کے دیکھو، تمھارے بندھی جاتی ہے؟ میں نے کلائی پہ لپیٹ کے دیکھا، اور بولا ہاں، آ رہی ہے پوری، مگر، میں پھر اسے کھولنے لگا۔ یہ مہربانی کیوں؟ مہربانی میں نہیں، تم کرو گے۔

کیا؟ میں بدحواس مسافر کیا مہربانی کر سکتا ہوں، میں سوچنے لگا۔ مرینڈا بولی، تم اپنا ایک قلم مجھے دے دو۔ یہ قلم، بہت سستا سا ہے، لے لو، بے کار، کیا کرو گی؟ بولی، تو، تم نہیں جانتے، میں جانتی ہوں۔ ایک قلم کار کے قلم کی برکت۔ میں اب کسی کو بتا سکتی ہوں کہ ایک مصنف کا قلم، ناول رائٹر کا قلم میرے پاس ہے۔ ایک دم سے میری اُلجھی ہوئی سوچوں کو ایک عجیب احساس تفاخر ملا اور میں نے گردن موڑ کے دور بیٹھی ہوئیں بے چین اور خشمگیں نظروں سے مجھے گھورتی ہوئی دونوں بیگمات کو دیکھا۔ ان کے چہروں پہ لکھا تھا کہ یہ ٹکٹ خرید رہا ہے یا کاؤنٹر پہ بیٹھی حسینہ کا رشتہ مانگنے بیٹھ گیا ہے۔ ان کی نگاہوں کی حدت مجھے کہہ رہی تھی کہ اگر ہماری ٹرین مس ہوئی تو سمجھ لینا تمھارا کورٹ

مارشل ہوگا۔ ماتھے پہ سرسراتے پسینے کی بوندیں بڑھ گئیں۔ ایک لمحہ پہلے کا ملا قلم کار کا تمغہ گر گیا اور میں نے اپنا قلم بے بسی سے مرینڈا کو تھماتے ہوئے لاچارگی سے کہا۔ میرا تو کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا۔ وہ قلم ہاتھ میں پکڑتے ہوئے، ایک لمحے کے کسی حصے میں ادب سے اپنی نشست سے تھوڑا اُوپر اٹھی۔ میرے ہاتھ سے قلم لے کر اسے ہولے سے اپنے رنگے لبوں سے بوسہ دیا اور پھر اپنی نیم پلیٹ والے کوٹ کالر کے پاس اُٹھی تنی ہوئی جیب میں وہ قلم ٹھونس کے بولی، تھینک یو سر یو آر ویل کم، مگر...... مرینڈا۔

بولی، اپنا کوئی ٹکٹ نکالیے۔

بدحواسی میں مَیں نے چاروں ٹکٹ سامنے کر دیے۔

بولی، آپ اس میں لکھے یہ پلیٹ فارم نمبر پڑھ سکتے ہیں؟

جی، انگریزی ڈیجٹس ہیں۔

اوکے، اب شہروں کے نام؟

وہ بھی پڑھ سکتا ہوں۔

یہ لکھا ہے فرانکفرٹ...... یہ آگے بون، ہے نا؟

ہوں، اب ہر اسٹیشن کے آگے جو وقت لکھا ہے، وہ دیکھا؟

دیکھ لیا۔

اب وہ گھڑی آگے کرو، جو میں نے دی ہے۔

یہ، میں نے اپنی کلائی کاؤنٹر پہ رکھ دی۔

بولی، یہ ڈیجیٹل واچ ہے۔ اس کا ایک ایک سیکنڈ اہم ہے۔ تم وہ حماقت نہ کرنا بیس منٹ وقت آگے کرنے والی۔

وہ تو بچنے کے لیے کرتا ہوں۔

یہاں ایک منٹ بھی وقت آگے پیچھے کرو گے تو مارے جاؤ گے، رہ جاؤ گے۔

کہیں نہ پہنچ پاؤ گے۔

کیا مطلب، مجھے سمجھ نہ آئی۔

بولی، تم اطمینان سے اپنے ٹکٹ پہ لکھے پلیٹ فارم پہ درج وقت سے ایک آدھ منٹ پہلے پہنچ جاؤ۔ دیوار اور فرش کے نشانات کو دیکھنا۔ ٹرین میں جو تمھارے ڈبے کا نمبر ہے اس کے نشان پہ پلیٹ فارم پہ کھڑے ہو جانا۔ تمھارے پلیٹ فارم پہ عین تمھارے ٹکٹ میں درج وقت پہ ایک ٹرین کہیں سے آ جائے گی، وہ تمھاری ہوگی۔ اس کا تمھارے سامنے والا دروازہ خود بخود سے کھلے گا۔ وہ تمھارا کمپارٹمنٹ ہوگا۔ چڑھ جانا، اندر سیٹوں پہ نمبر لکھے ہوں گے۔ دیکھ کے بیٹھ جانا۔ ٹکٹ میں درج جس اسٹیشن پہ تمھیں اُترنا ہے، اس اسٹیشن کے سامنے لکھے وقت سے آدھا منٹ پہلے اپنا بیگ لے کر دروازے کے قریب ہو جانا۔ عین تمھارے ٹکٹ پہ لکھے وقت پہ وہ گاڑی کسی نہ کسی اسٹیشن پہ رُکے گی۔ وہ تمھاری منزل ہوگی۔ وہ اسٹیشن ہوگا جہاں تم نے اترنا ہے۔"

◆◆◆

(جاری ہے)

طنز و مزاح

دیکھتے ہیں ہم کہ غالبؔ کون ہے؟

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی

بعض لوگ اتنے عظیم ہوتے ہیں کہ ان کے سخت سے سخت مخالف اور دشمن بھی انہیں عظیم کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جیسے ہمارے ایک ماموں تھے... پورا نام ان کا عظیم الدین تھا۔ ایک چچا بھی عظیم تھے اور ان کا پورا نام نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ بیگ خاں غالبؔ تھا۔ اللہ بخشے بڑی تہ دار شخصیت کے مالک تھے، بالکل پیاز کی طرح۔ مرتے مر گئے لیکن کسی کو اس بات کی ہوا نہیں لگنے دی کہ موصوف کیا تھے۔ آپ کہیں گے شاعر تھے تو ہم اس کی تردید میں خود ان کے متعدد بیانات پیش کر سکتے ہیں۔ مثلاً ایک مقام پر فرماتے ہیں ع ''کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے۔'' ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے ع ''ہمارے شعر ہیں صرف دل لگی کے اسدؔ۔'' اور ایک مقام پر ان کے یہ فیصلہ کن الفاظ ملتے ہیں ع ''شاعری سے نہیں مجھے سروکار۔'' تو حضرتِ غالبؔ آخر کیا تھے؟ ان کی زندگی میں بھی یہ سوال اٹھا تھا جس کا اظہار انہوں نے یوں کیا ع ''پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے؟'' لیکن سیدھا سادہ جواب دینے کے بجائے موصوف محض یہ کہہ کر کنی کاٹ گئے ع ''کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟'' ایک بار انہوں نے اپنی پراسرار شخصیت کے بارے میں خود کہا۔

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالبؔ آخر تو کیا ہے اے ''نہیں ہے؟''

چچا غالبؔ دنیا سے چلے گئے اور محققین کی روزی حلال کرنے کی غرض سے یہ سوال تشنۂ جواب ہی چھوڑ گئے کہ وہ کیا تھے؟ ہم تو کسی بھی درجے میں محقق نہیں لیکن صحافی اور صحافت کے استاد ہونے کے ناتے، مزاج کچھ کھوجی سا پایا ہے۔ ایک دن جب اخبارات کی چھٹی کی وجہ سے طبیعت ذرا ہشاش بشاش تھی تو خیال آیا کہ کیوں نہ مرزا کے دیوان ہی سے اس سوال کا جواب تلاش کیا جائے۔ بس جناب، جوں جوں ہم اس میں غوطے لگاتے گئے یہ بات آئینے کی طرح واضح ہوتی گئی کہ غالبؔ بنیادی طور پر نہ شاعر تھے نہ فلسفی، نہ بیوروکریٹ تھے نہ محض شہ کے مصاحب۔ دراصل وہ ایک صحافی تھے اور اشعار میں اخبار نویسی کرتے تھے۔ ثبوت کے طور پر ان کی وہ مشہور زمانہ غزل ملاحظہ فرمائیں ع ''بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے۔'' اسی غزل میں آگے چل کر کہتے ہیں ع ''ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے۔'' اب آپ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتایئے، صحافی یہی کام تو کرتا ہے نا؟ صحافی کا واسطہ دن رات جن چیزوں سے رہتا ہے ان میں کاغذ، تصویر، تحریر، فریاد یعنی مانگیں وغیرہ شامل ہیں۔ آپ دیوانِ غالبؔ کھولیے، پہلے ہی شعر میں آپ کو یہ تمام لوازمات مل جائیں گے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

مرزا کی پوری زندگی ایک صحافی کی زندگی کا مکمل نقشہ پیش کرتی ہے۔ مثلاً گھر کو لیجیے۔ بالکل صحافیوں جیسا تھا۔ فرماتے ہیں۔

بے درودیوار سا اک گھر بنایا چاہیے کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

مالی حالات ایسے ہی تھے جیسے عموماً صحافیوں کے ہوتے ہیں۔ بلاتکلّف کہتے ہیں۔

کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال　　　کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار

آج کے صحافی کی طرح اُن کے اوقاتِ کار بھی معیّن نہ تھے۔ دن رات شدید موسم میں کام کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ پریشان ہوکر احتجاج کرتے ہیں۔

رات کو آگ اور دن کو دھوپ　　　بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار

غالباً کسی "سی" کیٹیگری کے اخبار میں ملازم تھے جہاں وقت پر تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ اس کی شکایت یوں کرتے ہیں۔

میری تنخواہ جو مقرر ہے　　　اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار

اور نتیجتاً صورتِ حال یہ تھی کہ۔

میری تنخواہ میں تہائی کا　　　ہوگیا ہے شریک ساہوکار

یہ ساہوکار اس دور کی "ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن" (پاکستان) تھی۔ آج بھی صحافی کالونی کے مکینوں کی تنخواہوں میں ایک تہائی شریک یہی ساہوکار ہے۔ جب صحافیوں کے معاشی حالات اس حد تک دگرگوں ہوگئے کہ بقول غالبؔ ع "ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں، کھاویں گے کیا؟" تو حکومت وقت کو کچھ ہوش آیا اور اس نے "ویج بورڈ" کا اعلان کیا۔ غالبؔ نے اس تاخیری اقدام کا تمسخر یوں اڑایا۔

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ　　　ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

اور یہ کہ۔

ترے وعدے پہ جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا　　　کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

مرزا نے سو فیصد صحافیانہ طبیعت پائی تھی۔ مثلاً صحافیوں کی خودداری اور نازک مزاجی مشہور ہے۔ مرزا صاحب بھی ایسے ہی تھے۔ دعویٰ ملاحظہ ہو۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم　　　الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

اِس دور کے صحافی کی طرح غالبؔ بھی اپنے آپ کو خدائی فوجدار سمجھتے تھے۔ معاشرے کو برائیوں سے پاک کرنے اور نیکیوں کی تبلیغ کرنے کی فکر انہیں بھی لاحق تھی۔ ارشاد ہوتا ہے۔

روک لو گر غلط چلے کوئی　　　بخش دو، گر خطا کرے کوئی

....

جو مدّعی بنے اس کے نہ مدّعی بنیے　　　جو نا سزا کہے، اس کو نہ ناسزا کہیے

اور جس طرح آج کا صحافی معاشرے کی اصلاح کی کوششوں میں قطعاً ناکام رہا ہے، غالبؔ بھی اسی صورت حال سے دوچار ہوئے جس کا ماتم یوں کرتے ہیں۔

کچھ اور ہی عالم نظر آتا ہے جہاں کا　　　کچھ اور ہی نقشہ ہے دل و چشم و زباں کا

آیئے اب ذرا صحافی کی حیثیت سے مرزا صاحب کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں پر نظر ڈالتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا کلام شعری

رپورٹنگ کی بہترین مثالیں پیش کرتا ہے۔جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا،ملکی حالات اس وقت بھی ایسے ہی تھے جیسے آج ہیں۔شہر میں ڈاکے وغیرہ بھی دن دہاڑے اسی طرح پڑتے تھے۔اس کی رپورٹ دیوانِ غالبؔ میں یوں ملتی ہے۔

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا   رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

لاقانونیت کا یہ عالم تھا کہ۔

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے   زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا

باہمی جھگڑے فساد کی صورت حال بھی آج جیسی تھی۔

شہر دہلی کا ذرہ ذرۂ خاک   تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا

جیسی غم ناک عیدیں ماضی قریب میں ہم نے منائی ہیں اُس دور میں بھی ایسی ہی ایک عید منائی گئی تھی۔غالبؔ کہتے ہیں۔

ہوئی یہ کثرت غم سے تلف کیفیتِ شادی   کہ صبح عید مجھ کو بد تراز چاکِ گریباں ہے

کرفیو اُس دور میں بھی لگتا تھا اور اس کا ذکر مرزا کے کلام میں اس طرح ملتا ہے۔

کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک   آدمی واں نہ جا سکے یاں کا

ایک بار غالبؔ کو کسی سیاست داں کا انٹرویو لینے کے لیے بھیجا گیا۔یہ ان کا پہلا سیاسی اسائنمنٹ تھا۔ان بے چاروں کا کیا معلوم تھا کہ دنیا میں جھوٹ تین قسم کے ہوتے ہیں یعنی بڑا جھوٹ، چھوٹا جھوٹ اور سیاست۔ان کا ہم عصر سیاست داں بھی بڑا چالاک اور زیرک انسان تھا۔یہ اُسے گھیر گھار کر کوئی واضح بات کہلوانا چاہتے تھے تا کہ ان کے اخبار کی اچھی سی لیڈ بن جائے لیکن وہ بقول شخصے پٹھے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتا تھا۔اس پر جھنجھلا کر کہتے ہیں۔

بلائے جاں ہے غالبؔ اس کی ہر بات   عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

عام سیاست داں کی ظاہری اور باطنی زندگی کے تضاد کو ان الفاظ میں اجاگر کرتے ہیں۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ   دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

دیوانِ غالبؔ میں موسم کی رپورٹ اس شاعرانہ انداز میں ملتی ہے۔

پھر اس انداز سے بہار آئی   کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر   بادہ نوشی ہے باد پیمائی

ان الفاظ سے بھی صحافت کی بُو آتی ہے۔

ایک سچے اور کھرے صحافی کی طرح غالبؔ آزادیءاظہار کے قائل تھے۔کہتے ہیں۔

رونے سے اے ندیم ملامت نہ کر مجھے   آخر کبھی تو عقدہء دل وا کرے کوئی

اور عقدۂ دل وا کرتے کرتے مرزا صاحب بے باک ہوتے گئے اور ایسی باتیں لکھنے لگے جو پریس کے ضابطہ اخلاق کے خلاف ہیں مثلاً ترغیب جرم کا یہ انداز دیکھیے۔

ہم سے کھل جاؤ بہ وقتِ مے پرستی ایک دن   ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

گویا فریق ثانی کو بلیک میل کر کے کسی قابل تعزیر حرکت پر اکسایا جا رہا ہے۔اس ''جرأت صحافیانہ'' کا نوٹس تو لیا گیا لیکن مغلیہ عہد کے آخری دنوں کے اخلاقی ماحول کا لحاظ رکھتے ہوئے حکومت نے فراخ دلی کا ثبوت دیا اور خاموش رہی۔اس پر مرزا صاحب کے حوصلے اور بلند ہوئے اور وہ مذہب کو آڑے ہاتھوں لینے لگے۔

کعبے میں جا بجائیں گے ناقوس　　اب تو باندھا ہے دَیر میں احرام

یہاں تک کہہ اٹھے۔

اطاعت میں تا رہے نہ مے وانگبیں کی لاگ　　دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

اس پر اسلام پسندوں کی بھنویں سکڑیں لیکن حکومت نے مذہب کو شہریوں کا ذاتی مسئلہ قرار دیتے ہوئے ایک صحافی کو چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا اور ڈھیل دیتی گئی۔اُدھر مرزا صاحب کھلتے چلے گئے اور حکومت بھی ان کے قلم کی زد میں آنے لگی۔مثلاً۔

ہو رہا ہے جہان میں اندھیر　　زلف کی پھر سرشتہ داری ہے

پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب　　اشک باری کا حکم جاری ہے

سماجی برائیوں کی نشاندہی کے بعد حکومت پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

خود ہے تدارک اس کا گورنمنٹ کو ضرور　　بے وجہ کیوں ذلیل ہو غالبؔ ہے جس کا نام

یعنی بُھس میں چنگی ڈال جمالو دُور کھڑی۔برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔آخر سرکاری مشینری حرکت میں آگئی۔پہلے پریس ایڈوائس جاری ہونے لگی۔پھر چھوٹی موٹی تادیبی کارروائی ہوئی۔لیکن مرزا صاحب نے ان اقدامات کو یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا کہ۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں　　ہر چند اِس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

یہ شعر آج بھی ہماری صحافی برادری کا پسندیدہ شعر ہے۔صحافی صبح اسی کا ورد کرتے ہوئے گھر سے نکلتے ہیں۔ان میں سے اکثر حق گوئی کی پاداش میں تکلیف اٹھاتے ہیں لیکن بعض ایسے بھی ہیں جو پلاٹ،ایوارڈ وغیرہ پر قناعت کر لیتے ہیں۔مرزا صاحب ایک مرحلے پر اتنے شیر ہو گئے کہ کہہ اٹھے ع ''کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے۔'' پھر اپنی اس دیدہ دلیری اور تلخ کلامی پر نادم ہونے کے بجائے دھڑلے سے کہتے ہیں۔

کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ　　یک قلم خارجِ آدابِ وقار و تمکیں

آخر حکومت کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا اور نتیجے میں پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈیننس (پی پی او) نافذ کیا گیا۔چنانچہ مرزا صاحب یہ کہنے پر مجبور ہو گئے۔

بات پر واں زبان کٹتی ہے　　وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

کب وہ سنتا ہے کہانی میری　　اور پھر وہ بھی زبانی میری

پابندیِ اظہار اور احتیاط کلام کے باعث ان کا دم گھٹنے لگا۔کہتے ہیں۔

پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم　　برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے

اب حکومت پر ہر طرف سے دباؤ ڈالا جانے لگا کہ زباں بندی کے اس کالے قانون کو منسوخ کیا جائے۔غالبؔ نے بھی ان

مطالبات میں اپنی آواز شامل کی اور کہا کہ حکومت اگر چاہے تو بیک جنبش قلم صحافیوں کی عزت بحال کر سکتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

ہے بندہ کو اعادۂ عزت کی آرزو　　　چاہیں اگر حضور تو مشکل نہیں یہ کام

لہٰذا پریس اور رائے عامہ کے دباؤ سے مغلوب ہو کر اُس دور کی حکومت نے بھی اس دور کی حکومتوں کی طرح پی پی او کو منسوخ کرنے ہی میں عافیت جانی۔ اس پر خوش ہو کر مرزا حکام کو دعا دیتے ہیں اور اداریہ کے انداز میں کہتے ہیں۔

تم سلامت رہو ہزار برس　　　ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

اب یہ بات طے ہے کہ مرزا غالبؔ ایک صحافی کی زندگی جیے اور صحافی کی موت مرے۔ اپنی موت کی منظر کشی بھی زندگی ہی میں کر دی تھی۔

یہ لاشِ بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے　　　حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ہم تو کہتے ہیں کہ غالبؔ کے اس مشہور و معروف شعر میں کتابت کی کوئی غلطی سرزد ہو گئی تھی ورنہ اصل شعر یوں تھا۔

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا ''اڈیٹری''　　　کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

(یہ مضمون ''گورنر سندھ ایوارڈ'' حاصل کرنے والے صحافیوں کے اعزاز میں منعقدہ تقریب میں پڑھا گیا۔)

◆◆◆

تین گذارشات

1- تمام تخلیق کاروں سے گذارش کی جاتی ہے کہ وہ ادارہ ''تخلیق'' کو بھجوانے والی تحریر کسی اور پرچے کو روانہ نہ کریں۔ پرچہ کی ضخامت کو مدنظر رکھتے ہوئے اکثر رہ جانے والی تحریروں کو کمپوز کروا کے اگلے پرچوں کے لئے محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ درخواست یہ بھی ہے کہ مختصر تحریر ارسال کریں تاکہ زیادہ لوگوں کو نمائندگی کا حق مل سکے۔

2- ادارہ ''تخلیق'' اعزازی طور پر کام کرنے والوں کی ایک مشاورتی ٹیم بنانا چاہتا ہے جو اپنی تمام ذاتی خواہشات کو پسِ پردہ رکھ کر ماہنامہ ''تخلیق'' کے پھیلاؤ اور بہتری کے لئے کام کر سکیں۔ ان تمام قارئین سے گزارش ہے کہ وہ اپنی اعزازی خدمات دینے کے لئے ذاتی خط لکھ کر اس نیک کام کی رضامندی سے مطلع فرمائیں۔

3- ادارہ ''تخلیق'' تمام خریداروں اور اعزازی کاپی حاصل کرنے والوں سے گزارش کرتا ہے کہ وہ پرچہ ڈاک سے وصول ہونے کی اطلاع فوری طور پر ادارہ ''تخلیق'' کو دیں۔ تخلیق ہر دو ماہ کے بعد تیسرا ماہ شروع ہوتے ہی پہلی تاریخوں میں 5 سے

نہیں ہوگا۔

ادب کے اخلاقی تقاضوں کو پورا کرنا ہم سب کا نصب العین ہونا چاہیے۔ آمین!

ادارہ ''تخلیق''

''شہرنورد'' کے رومان

...... 2 ......

اعتبار ساجد

تیسرا رومان

اپنے دوسرے رومان میں بھی ناکامی سے دوچار ہوکر شہرنورد کا دل دنیا سے اچاٹ ہوگیا۔اس نے اللہ سے لولگانے کی ٹھان لی اور باقاعدگی سے محلے کی مسجد میں نمازیں پڑھنے لگا۔اس حیرت انگیز انقلاب کو دیکھ کر اہل خانہ کے ساتھ اہل محلّہ بھی دنگ رہ گئے۔کچھ دن تو شہرنورد بڑے ہی خشوع وخضوع سے اللہ کے دربار میں حاضری دیتا رہا اور میلاد شریف میں سر پر رومال باندھ کر دردناک نعتیں پڑھتا رہا لیکن جب رمضان میں تراویح لمبی ہونے لگی تو وہ اس میدان سے بھاگ گیا اور حادثاتی طور پر ایک ایسی مہ لقا کے عشق میں فوری طور پر مبتلا ہوا جو نوکرانی کے روپ میں اس کے گھر میں تازہ تازہ وارد ہوئی تھی۔اگرچہ گھر میں اس کا رینک نوکرانی کا تھا مگر وہ اپنے آپ کو مہارانی ثابت کررہی تھی اور محلے بھر کے جوان مردوں سے قیامت خیز شباب پر داد تحسین حاصل کررہی تھی۔آئے دن شہرنورد کے ابا کو کوئی محلے دار آکر بتاتا تھا کہ آج آپ کی ملازمہ گلی یا بازار کے فلاں مقام پر داد حسن وصول کرتی پائی گئی ہے۔شہرنورد کا باپ میکیاوالی کی کتاب ''حکومت'' اور ابن خلدوں کے مقدمہ ''تاریخ'' کی منزل سے گزرا ہوا تھا۔لہٰذا کمال حکمت عملی سے اس نے فوری طور پر اس آفت کی پرکالہ پر دفعہ ایک سو چوالیس اور نظر بندی کا قانون لاگو کردیا۔ان احکامات کے نفاذ کے بعد ملازمہ نے جب دیکھا کہ اس کا آؤٹ ڈور کیریئر مارا جارہا ہے تو اس قتالہ عالم نے ان ڈور گیمز کا اجراء کیا اور نظر انتخاب شہرنورد پر ڈالی۔

شہرنورد اگرچہ آشفتہ اور دل گیر تھا۔پے در پے محبت میں دو شدید صدمے اٹھا چکا تھا لیکن گھر آئی ہوئی مایا کو ٹھکرانا بھی کفران نعمت سمجھتا تھا لہٰذا دائیں بائیں دیکھ کر اس نے اپنی آپشن فوری طور پر دے دی۔اس حور بے قصور نے آغاز داستان کے طور پر پہلے تو نظروں کے سگنل دیئے پھر ڈائیلاگ ڈیلیوری کے مراحل پیدا کئے۔ازاں بعد راز و نیاز اور مذاکرات کا ماحول پیدا کردیا۔شہرنورد نے خراج محبت کے طور پر اس انارکلی کو اپنا جیب خرچ دینا شروع کیا مگر جلد ہی یہ قصہ جلال الدین اکبر کے نوٹس میں آگیا۔

اس روز انارکلی نے اپنے عاشق کو بے سروپا اور لایعنی باتوں سے اُکتا کر جب جمائیاں لیتے ہوئے پوچھا کہ تم صرف باتیں ہی کرتے ہو یا کچھ اور بھی کرتے ہو تو وہ مجبور محبت حیران ہوکر بولا۔''اور سے تمہاری کیا مراد ہے جان عالم! میں تمہارے پاس بیٹھ کر اسکول میں گزری ہوئی ایک ایک بات سناتا ہوں کیا یہ کافی نہیں ہے؟

وہ آشنائے رموز محبت ہنس کر بولی۔ ''دن کو ملنا ٹھیک نہیں اب ہم رات کو ملا کریں گے۔ پھر تم میری کوٹھڑی میں آ کر سکول کے کارنامے سنایا کرنا۔''

جس روز آشفتہ دل شہرنورد مژدۂ وصل کو باہمی مذاکرات سمجھ کر رات کے اندھیرے میں انارکلی کے پاس پہنچا تو اس وقت اس عشوہ طراز نے سرمہ لگا رکھا تھا اور ایک مقبول فلمی دھن گنگنا رہی تھی۔ ادھر شہزادہ سلیم نے دربار پر حاضر ہو کر کہا۔ ''لو میں آ گیا۔'' ادھر سے ایک بھاری ہاتھ غریب کی گدی پر پڑا۔ جلال الدین اکبر المعروف بہ والد گرامی شہرنورد نے گرج کر کہا۔ ''کیوں بے یہاں کیا کر رہا اس وقت؟''

فوری طور پر سچویشن بدلنے کا شہرنورد کو گمان بھی نہ تھا۔ پہلے تو دم بخود رہ گیا۔ پھر ذرا سا سٹپٹایا' بعد ازاں گھگھیانے لگا۔ اسے گھگیاتا دیکھ کر شفقت پدری جوش میں آئی۔ جاں بخشی کے بعد نرم لہجے میں پوچھا ''جانِ پدر! اس وقت کدھر۔''

گھگیاتے ہوئے شہرنورد نے اپنی بندھی ہوئی گھگی کھولتے ہوئے کہا۔

''یہ کمبخت ہر روز میری اردو کی کتاب اٹھا لاتی ہے وہی لینے آیا ہوں۔ امتحان سر پر کھڑے ہیں۔''

مگر جب باپ کے استفسار اور تلاش کے بعد بھی کوٹھڑی سے اردو کی کتاب برآمد نہ ہوئی تو تعلیم و تربیت کے ڈنڈے کے زور سے خیالِ علم رکھتے ہوئے باپ نے اپنی پاپوش مبارک سے شہرنورد کی کھوپڑی کے اندر پلتے ہوئے عشقیہ جرثوموں کو دنادن زدوکوب کیا اور اگلے دن ملازمہ کو نکال باہر کیا۔ وہ عیار دوشیزہ جب سامان سمیٹ کر نکلنے لگی تو سب کی آنکھ بچا کر اس نے شہرنورد کو انگوٹھا دکھایا اور آہستہ سے بولی۔

''اوئے باگڑ بلے' دیکھ لیا جوان لڑکیوں کو رات کے وقت اسکول کی باتیں سنانے کا انجام' آئندہ خیال رکھنا۔''

چوتھا رومان

ظالم سماج یعنی سخت گیر باپ کے ہاتھوں اپنے تیسرے رومان کی تباہی پر شہرنورد کا دل پاش پاش ہو گیا تو اس نے شاعری شروع کر دی۔ پہلی نظم نہایت رقت آمیز انداز میں گائے پر لکھی لیکن جلد ہی احساس ہو گیا کہ عشق میں گائے کا کوئی واسطہ نہیں۔ چنانچہ ہجر و فراق کے مضمون باندھنے شروع کئے اور ہر شعر میں سابقہ محبوباؤں کو نام بنام یاد کرنا شروع کر دیا لیکن اس میں افشائے راز کا خطرہ تھا اور شہرنورد محبت کے معاملے میں کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔ اکثر اس کی آنکھیں آنسوؤں اور دل دکھ سے بھرا رہتا۔ والدین سمجھتے کہ سکول سے پڑھ کر آ رہا ہے اور سکول والے یہ سمجھتے کے والدین کا دست شفقت پھروا کر آ رہا ہے۔ اس عمومی غلط فہمی نے فراق زدہ شہرنورد کے مسلسل آزردہ خاطر رہنے کا جواز فراہم کر دیا تو اسے اطمینان ہوا کہ چلو' دنیا کی تفتیش سے جان چھوٹی۔

اسی خیال میں تھا کہ ناگاہ ایک دن اپنے گنجان آباد محلے میں داخل ہوتے ہی اس کے سر پر ایک پتھر آ پڑا۔ بھنا کر گالیاں بکنے کے ارادے سے مخاطب کو تلاش کرنا چاہا تو ایک رنگین سایہ سامنے والی کھڑکی میں غائب ہوتا نظر آیا۔ غور سے دیکھا تو سر پر پڑنے والا پتھر اکیلا نہیں آیا تھا۔ اس پر ایک کاغذ بھی لپٹا ہوا تھا۔ ادھر ادھر دیکھ کر شہرنورد نے کمال صفائی سے پتھر اٹھا لیا۔ شکن در شکن کاغذ

پر پنسل سے لکھا ہوا تھا۔

''آپ کی شکل ہی ایسی ہے کہ آپ نے خود بنا رکھی ہے؟ براہ مہربانی اسی ترکیب سے جواب کھڑکی کے راستے روانہ کردیں۔''

(جواب کی منتظر......ع۔غ۔ف)

یہ رقعہ پڑھ کر شہر نورد کا خون کھول اٹھا۔ اتنی کوفت پتھر کی چوٹ نے نہیں پہنچائی تھی جتنی رقعے کے چند الفاظ نے پہنچائی تھی۔ پہلے تو اس کا جی چاہا کہ کھڑکی کی طرف منہ کر کے اسکول میں سیکھی ہوئی ساری گالیوں کا ذخیرہ اگل دے اور پھر اگر ع غ ف تر کی بہ تر کی جواب دینے کھڑکی میں آئے تو پتھر کھینچ کر عین اس کی دائیں آنکھ پر مارے تاکہ انتقام کے شعلے سرد ہوں۔ بڑی مشکلوں سے وہ خود پر قابو پا کر گھر پہنچا اور جوابی انتقامی کاروائی پر غور کرنے لگا۔ سب سے پہلے تو اس نے سوچا کہ ماچس کی جلتی ہوئی تیلی پھینک کر کھڑکی کو آگ لگا دے تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری لیکن اس میں قباحت یہ تھی کہ کھڑکی بہت اونچی تھی اور کوئی ضروری نہیں تھا کہ اپنے آپ کو نذرِ آتش کروانے کے لئے ع۔غ۔ف کھڑکی میں آئے۔ پھر اس نے سوچا کہ اپنے مکان کی چھت پر کھڑے ہو کر کھڑکی پر خشت باری کرے۔ کوئی نہ کوئی اینٹ تو اس حرافہ کو جا کر لگے گی لیکن اس میں عام بلوے فساد کے امکانات تھے۔ تنگ آ کر اس نے سوچنا ہی چھوڑ دیا اور غصے سے جلا بھنا ادھر ادھر پھرتا رہا۔ اگلے دن ایک عدد پتھر پھر اس کے سر پر نازل ہوا۔ یہ ذرا بڑا تھا اور اس کے جس مقام پر گرا تھا وہاں فی الفور اس نے ایک عدد گھومڑ بنا دیا تھا۔ ع۔غ۔ف نے لکھا تھا۔

''معاف کرنا! اس سے چھوٹا اور کوئی پتھر نہیں تھا۔ آئندہ خیال رکھوں گی۔ آپ نے اب تک میرا سوال کا جواب نہیں دیا۔ فوراً جواب ارسال کریں۔'' فوری جواب کی منتظر......ع۔غ۔ف

شہر نورد اس چوٹ سے بے حال ہو کر سر سہلاتا دانت پیستا اور مٹھیاں بھینچتا ہوا خاصی دیر تک پتھر ہاتھ میں لئے کھڑکی کی طرف دیکھتا رہا لیکن خیریت گزری کہ کوئی چہرہ نمودار نہیں ہوا۔ آخر جھنجھلا کر اس کی آنکھیں کوئی ہتھیار تلاش کرنے لگیں۔ نہ ملا تو ہاتھ میں پکڑا ہوا پتھر اس نے کچکچا کر کھڑکی کی طرف پھینکا اور منہ پر ہاتھ پھیر کر بولا ''خیر کوئی بات نہیں بچو! نمٹ لوں گا۔ کسی دن باہر نظر تو آؤ!''

تیسرے دن کھڑکی کے قریب پہنچتے ہی غیر شعوری طور پر اس نے اپنے سر پر ہاتھ رکھ لیا لیکن خاص فائدہ نہ ہوا۔ ایک پتھر جو پچھلے پتھروں سے وزن اور جسامت میں بڑا تھا۔ سنسناتا ہوا آیا اور کھٹ سے اس کی دائیں کنپٹی پر پڑا۔ وار ایسا کارگر ثابت ہوا کہ شہر نورد دھڑام سے چکرا کر گرا۔ پھر جلدی سے ادھر ادھر دیکھ کر اٹھ بیٹھا اور آنکھیں جھپکنے لگا۔ دماغ بُری طرح چکرا رہا تھا اور کنپٹی پر ایسی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں گویا کسی نے پستول کی نال رکھ کر ابھی ابھی گھوڑا دبایا ہے۔ چند لمحے تک کھڑکی کی طرف گھورتا رہا۔ پھر پتھر پر سے کاغذ کھول کر پڑھا' تھا۔

''مجھے بہت افسوس ہے۔ گھر میں اس سے چھوٹا کوئی پتھر دستیاب نہیں' ہاں اس سے بڑے ضرور ہیں جن کی باری آئندہ آئے گی۔ تکلیف دہی کی معذرت کے ساتھ گزارش ہے کہ پتھروں کی معمولی سی چوٹ میری خاطر برداشت کر لیا کریں کیونکہ خط بھیجنے کا اس کی علاوہ کوئی اور طریقہ مجھے نہیں آتا۔'' آپ کے جواب کی منتظر......ع۔غ۔ف

کچھ دیر تک تو شہر نورد اپنی کنپٹی کو سہلاتا رہا اور سی سی کرتا رہا۔ کچھ ڈگمگاتا ہوا گھر پہنچا اور اگلے دن سے اس راستے سے گزرنا ہی چھوڑ دیا۔ البتہ اون کی ایک موٹی سی ٹوپی ضرور خرید لی اور گرمیوں میں بھی اسے اپنے سر سے جدا نہ کرتا۔ کوئی وجہ تسمیہ دریافت کرتا تو انتہائی

عاجزی سے کہتا۔

''ڈاکٹر صاحب کی تاکید ہے کہ سر کو گرم و سرد ہوا سے بچانے کے لئے ٹوپی پہنے رکھو۔''

پانچواں رومان

شہر نورد اپنی بلوغت کے اٹھارہویں سال میں تھا کہ اس پر عشق نو کا شدید حملہ ہوا۔ حملہ ہوتے ہی اس نے ایک مشہور شعر میں تھوڑی سی ترمیم کر کے اسے اپنا سنہری اصول بنا لیا۔ شعر یہ تھا۔

محبت کے لئے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں   یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا

شہر نورد نے اپنے حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسے کچھ یوں بنا لیا تھا۔

محبت کے لئے کچھ خاص گھر مخصوص ہوتے ہیں   یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا

مگر اس کے سارے اصول دھرے رہ گئے۔ جب اس کی آہو چشم پڑوس نے لجاجت سے کہا۔

''بھیا عبدالشکور! ذرا دہی تو لا دو۔''

شہر نورد کو اعتراض دہی لانے پر نہیں ''بھیا'' پر تھا مگر اس اعتراض کو خون کے گھونٹ کی طرح پی کر مجبوراً اسے دہی لا کر دینا پڑی پھر تو گویا سلسلہ چل نکلا یہ ''لا دو وہ لا دو۔'' یہ مہر التفات دو عدد شیر خوار بچوں کی ماں تھی اور شوہر اس کا باکسنگ کا چمپئن رہ چکا تھا۔ لہٰذا شہر نورد نے رنگ کے اندر داخل ہونے کی دانستہ جرات نہ کی اور ناک آؤٹ ہونے والے باکسر کی طرح دروازے کے باہر ہی باہر سے سودا سلف پہنچاتا رہا۔ ایک روز اسی آہو چشم دوشیزہ نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔ ''تم مجھے بہت پیارے لگتے ہو۔'' شہر نورد کے من آنگن میں فوری طور پر امید کا ایک غنچہ چٹکا مگر دو بچوں اور باکسنگ کے چمپئن کا خیال آتے ہی مرجھا گیا۔ نہایت مردہ دلی سے بولا۔ ''سچ؟'' وہ نہایت والہانہ انداز میں بولی۔ ''ایمان سے۔'' شہر نورد نے غنچہ امید کی طرف دیکھتے ہوئے عالم خیال میں کہا۔ ''مگر آپ نے مجھے کبھی گھر بلایا ہی نہیں۔''

''تو اب آ جاؤ۔'' وہ ایک دم شہر نورد کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئی اور ڈرائنگ روم میں بیٹھا کر بولی۔

''تم بیٹھو میں ابھی آتی ہوں۔'' شہر نورد کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ ہو نہ ہو یہ سنگدل اپنے شوہر کو لینے گئی ہے۔ ابھی چند لمحے بعد وہ نمودار ہو گا اور پھر مکے مار مار کر اس کی پسلیاں سینڈوچز میں تبدیل کر دے گا۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے تمام رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ خود بھی اٹھ کھڑا ہوا مگر ایک تصویر پر نظر پڑتے ہی رک گیا۔ تصویر میں بالکل اس کے خدوخال تھے۔ بس عمر ذرا بڑی تھی۔

اتنے میں وہ حشر بداماں لوٹ آئی مگر اکیلی نہیں لوٹی۔ اس کے ہمراہ ایک ٹرے تھی۔ جو بسکٹوں اور پھلوں اور چائے کے دیگر لوازمات سے لدی ہوئی تھی۔ ٹرے کو میز پر رکھ کر اس نے اپنی شیریں آواز میں کہا۔ ''بیٹھو تم کھڑے کیوں ہو گئے ہو۔'' شہر نورد بوکھلا کر بیٹھ گیا اور تصویر کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگا۔ ''یہ کس کی تصویر ہے۔''

اس آہو چشم نے آہستہ سے کہا۔ ''میرے چھوٹے بھائی کی۔'' شہر نورد نے سلسلہ کلام کو طول دینے کی نیت سے کہا۔ ''یہ کرتے کیا ہیں؟''

اس غیرت ناہید نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ ''پچھلے سال ایک حادثے میں فوت ہو گئے۔''

یہ کہہ کراس گلبدن اوررشک چمن نے آنچل سے آنسو پونچھے اور کہنے لگی۔''اسی لئے تو میں کہہ رہی تھی کہ تم مجھے پیارے لگتے ہو۔ تمہیں دیکھتی ہوں تو مجھے اپنا چھوٹا بھائی یاد آجاتا ہے۔''

شہرنورد نے سرد آہ بھر کر کیلے کی طرف ہاتھ بڑھایا اوراسے چھیلتے ہوئے بولا۔''اس دنیا میں میری کوئی بہن نہیں ہے اور میں مدتوں سے اس کے لئے ترس رہا تھا۔شکر ہے آپ کی صورت میں ایک باجی مل گئی۔''

باجی نہال ہوکر بولی۔''بھیا!روز آیا کرو۔''

''ضرور آؤں گا باجی!''شہرنورد نے بڑے پرجوش انداز میں کہا۔پھر دل میں کہنے لگا۔''اب کیا لینے آؤں گیا یہاں......کدو؟''

اگلے دن سے شہرنورد نے اپنا روٹ تبدیل کردیا اور صاف الفاظ میں ماں سے کہا کہ وہ تمام پڑوسیوں کو سمجھادے کہ آئندہ اس سے سوداسلف نہ منگوایا کریں کیونکہ وہ دسویں جماعت میں پہنچ چکا ہے اوراس طرح اپنا وقت ضائع نہیں کرسکتا کیونکہ اسے علم حاصل کرنے کے لئے چین بھی جانا اور میٹرک میں کامیابی بھی حاصل کرنی ہے۔

شہرنورد کی اماں جان کی رگوں میں غالباً ہلاکوں خان کا خون تھا۔وہ ایسا موقع ہاتھ سے گنوانا کفر سمجھتی تھی کہ جب پڑوسیوں سے جھگڑنا ہو۔چنانچہ وہ فوراً برقعہ سر پر رکھ کر چیختی چنگھاڑتی اوراڑوس پڑوس کو صلواتیں سناتی ہوئی گلی کے ہر دروازے پر دعوت مبازرت دینے جا پہنچی اور ایک ساتھ کئی محاذ کھول دیئے۔اس معرکہ حق و باطل کے دوران شہرنورد اطمینان سے کوکا پنڈت کی گراں نما کتاب نکال کر پڑھتا رہا۔جو اس کے والد بزرگوار مطالعے کے بعد اپنے تکئے کے نیچے چھوڑ گئے تھے۔

(ختم شد)

◆◆◆

رگِ ساز......بے نشاں......دہلیز پر پھول......کھلا دروازہ......اور......پشتارہ

کے بعد

ولی عالم شاہین

کا ایک اور دلآویز مجموعہ جو عنقریب منظرِ عام پر آنے والا ہے

زرِ کاغ

باغباں باغ اِجارے ہی اگر دینا تھا   تھے زرِ داغ سے ہم بھی تو خریدارِ چمن (میر)

جائزے

جنگل والا صاحب

بانو قدسیہ

کہتے ہیں کہ شکر خورے کو شکر مل ہی جاتی ہے۔

مجھے یہ اعزاز حاصل رہا ہے کہ میں بپسی سدھوا کی مستقل قاری رہی ہوں۔ اس کا ہر نیا ناول کسی نہ کسی وسیلے سے مجھ تک پہنچ ہی جاتا ہے۔

گزشتہ برس جب میرا بڑا بیٹا انیق احمد خان امریکہ سے آیا تو وہ بپسی کا ناول (The Crow Eaters) اپنے ساتھ لایا تھا۔ اور اب ڈاکٹر انوار ناصر کے توسط سے اس ناول کا ترجمہ مجھ تک پہنچا ہے جسے محمد عمر میمن نے اردو روپ دیا ہے۔ میں ڈاکٹر صاحب کی بے حد ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے میری پسندیدہ رائیٹر کا ناول پڑھنے کو فراہم کیا۔

ہمارے ہاں ترجمہ نگاری کا کام بہت محدود رہا ہے۔ یوں تو اشفاق صاحب نے بھی ہیمنگوے کے ناول A FAREWELL TO ARMS کا ترجمہ ''وداع جنگ'' کے نام سے کیا تھا، لیکن وہ اپنی دیگر مصروفیات کی وجہ سے ترجمہ نگاری کو وقت نہیں دے سکے تھے، جیسے کہ حسن عسکری، ستار طاہر، سید قاسم محمود نے بھی ترجمہ نگاری کی ہے لیکن ہمارے ہاں یہ فن چند ناموں تک ہی محدود رہا ہے اس سلسلے میں محمد سلیم الرحمٰن اور شاہد حمید بھی بہت معتبر نام ہیں۔

بپسی سدھوا کا اندازِ نگارش ہمیشہ سے مجھے ایک خاص تحیر میں مبتلا کر دیتا ہے۔ کیونکہ اس کی کرافٹ کمال درجے کو پہنچی ہوئی ہے۔ یہ اس لیے نہیں کہ وہ انگلش میں لکھتی ہے۔ کیونکہ سب انگریزی لکھنے والوں کو ایک ہی معیار پر رکھ کر تو نہیں پرکھا جا سکتا۔

بپسی اپنی تحریر میں جزیات نگاری سے جو جادو جگاتی ہے وہ ہر پڑھنے والے کے سر چڑھ کر بولنے لگتا ہے۔ پڑھنے والے یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اتنی دلنشین منظر نگاری کو اس سے پہلے وہ خود کیوں نہیں دیکھ سکے۔ اس طرح جب ہم خود کو بپسی کی بیان کردہ جادوگری کا حصہ سمجھنے لگتے ہیں تب ہم دل کی گہرائیوں سے اس کے شکر گزار ہوتے ہیں اور ہمارا اندر باہر احساسِ ممنونیت سے بھر جاتا ہے۔ مثلاً اس نے ساس کے کردار کو جس طرح سے پیش کیا ہے اور انگریزوں سے تعلق داری کو جس انداز سے بیان کیا ہے یہ سب اسی کا خاصہ ہے۔

اس ناول میں ہمیں پارسی لوگوں کے بارے میں معلومات بھی بہم پہنچائی گئیں ہیں، یہاں پارسی لوگوں کی تعریفوں کے پل نہیں باندھے گئے بلکہ ان کی کمزوریوں اور خامیوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے اور ان پر کڑی تنقید کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ جیسے کہ خود احتسابی میں کیا جاتا ہے۔ ہر بڑے رائیٹر کا اور بپسی کا بھی یہ ایک خصوصی امتیاز ہے کہ اس کی تحریر میں خود احتسابی کا رنگ بہت نمایاں ہے اگر آپ اپنے اردگرد موجود کاروباری لوگوں کا مشاہدہ کریں گے تو آپ کو ان میں فریڈی کی خامیوں کی جھلک ضرور نظر آئے گی۔ مثلاً فریڈی، انشورنس کی رقم

کے حصول کے لیے جس طرح کی منصوبہ بندی کرتا ہے اور انگریزوں سے تعلقات بنانے کے لیے جو طریقے اپناتا ہے۔ ہمارے گرد و پیش میں یہ سب کچھ آج بھی ویسے ہی موجود ہے۔ جب ایک بچہ، پارسیوں کے سامنے ناچ ناچ کر یہ گانے لگتا ہے کہ ''پارسی، پارسی کاگرا کھاؤ! پارسی، پارسی، کاگرا کھاؤ!'' پارسیوں کا جتھا مشفقانہ تحمل سے مسکرا دیا۔ اس ٹپے میں پارسیوں کی اس بدنام صلاحیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ بلا سانس لیے پھیپھڑوں کی بھرپور قوت سے گھنٹوں، کوؤں کے ایک پورے جھنڈ کی طرح کائیں کائیں کرنے پر قادر ہوتے ہیں۔

فریڈی (جنگل والا صاحب) کا سب سے بڑا بیٹا جو اس کے سارے بچوں میں اس کے بہت قریب ہوتا ہے، ایک برہمن، گوپال کرشن کی پیش گوئی کے مطابق جلد ہی مر جاتا ہے۔ اس، برہمن، گوپال کرشن کا ذکر شاید میں نے کہیں اور کسی تحریر میں بھی پڑھا تھا لیکن اب یادداشت کا عالم یہ ہے کہ باوجود کوشش کے کچھ یاد نہیں آ رہا کہ کہاں پڑھا تھا۔

فریڈی کا دوسرا لڑکا جس کا نام یزدی ہے اپنی ایک کلاس فیلو لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے، فریڈی اس لڑکی کو طوائف ثابت کرتا ہے تو یزدی اپنے گھر سے بلکہ دنیاداری سے ہی لاتعلق ہو جاتا ہے۔ جب کسی عاشق کا قلب اس قدر لطیف ہو جائے کہ وہ اپنے کپڑے اُتار کر دوسروں میں تقسیم کر دے اور خود نیم برہنہ حالت میں گھر واپس آنے لگے تو یہ بات یقینی ہے کہ ہم لوگ اسے نارمل نہیں سمجھ سکتے۔

یزدی والے قصے کو پڑھ کے تو ہمیں بابوں کی بات یاد آتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تصوّف، دین پر چلنے کا وہ راستہ ہے جو آپ اپنی مرضی سے منتخب کرتے ہیں۔ یہ وہ تعلیم ہے جو یونیورسٹی اور کالجوں میں نہیں پڑھائی جاتی بلکہ یہ بابوں کی درس گاہوں میں ہی ملتی ہے۔

اب آپ لوگ یہ ضرور سوچیں گے کہ بانو آپا جی نے تو کمال ہی کر دیا، یعنی ایک پارسی کے ناول سے بھی تصوف کو برآمد کر لیا۔ تو آپ سے گزارش ہے کہ اگر آپ تھوڑا سا غور فرمانے کی زحمت گوارا کریں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ تصوف والے لوگ دنیا میں موجود تقریباً ہر مذہب میں پائے جاتے ہیں۔

فریڈی کا صرف ایک ہی لڑکا، بہرام، جو کاروبار میں اس کا جانشین بنتا ہے اور بڑی کامیابی سے ترقی کی منازل طے کرتا چلا جاتا ہے۔ بہرام کی بیوی اس کی بڑی اطاعت گزار ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ تانیا میں کسی رومانٹک کی روح حلول کر گئی تھی۔ اور رومانٹک لوگ اچھے شہید ثابت ہوتے ہیں۔

ناول کا نمایاں حصہ فریڈی کی شاندار خطابت پر مشتمل ہے۔ خطابت دو طرح کی ہوتی ہے، ایک وہ جسے سنتے ہوئے آپ اونگھنے لگتے ہیں اور دوسری وہ جس میں سننے والوں کو پلک جھپکنے کی مہلت بھی نہیں ملتی۔ مجھے اُمید ہے کہ جب آپ اس ناول کو پڑھنا شروع کریں گے تو آپ کے لیے اس تحریر کی کسی ایک سطر سے بھی صرفِ نظر کرنا آسان نہیں ہو گا۔ ایک معیاری تخلیق کا یہی نمایاں وصف ہوتا ہے کہ وہ پڑھنے والوں کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔

میں کیونکہ ترجمے کے فن سے بالکل نا آشنا ہوں اس لیے میں یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ عمر میمن صاحب نے اس ناول کا ترجمہ کرنے کا حق ادا کر دیا ہے لیکن بہر حال اتنی تعریف کا عمر میمن کو حق دار سمجھتی ہوں کہ انھوں نے انگریزی ادب کے بہت سے شہ پاروں سے اردو ادب کا دامن بھرنے میں اپنا ایک کلیدی کردار ضرور ادا کیا ہے۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

◆◆◆

''فرنٹ سیٹ'' کا سیّاح

پروفیسر جمیل آذر

''جب میں نے اپنے آپ سے ہونے والا مکالمہ لکھنے کی کوشش کی تو مجھ پر بامعنی ہونے کے مزید معنی کھلے۔ یہ راستہ کھلتے ہی مجھے ایک بہت کچھ جاننے، سوچنے اور کہنے والی شخصیت ملی، جو ہمہ وقت یہ چاہتی تھی کہ اُسے جانا جائے، اُس کے ''جاننے'' کو مانا جائے، اُس کے سوچنے کے انداز میں سوچا جائے اور اُس کے کہے پر کچھ کہا نہ جائے......فقط اُسے سنا جائے!''

درج بالا اقتباس منور عثمانی کے انشایئے ''ایک جاگتی کہانی'' سے لیا گیا ہے جو اُن کے انشائیوں کی پہلی کتاب ''فرنٹ سیٹ'' میں شامل ہے۔ یہ اقتباس انشائیہ نگاری کے خدوخال کا ایک نہایت بلیغ نمونہ ہے۔ انشائیہ نگار کبھی خود کلامی کرتا ہے، کبھی اپنے موضوع یا خیال سے مکالمہ کرتا ہے اور کبھی اپنے قاری یا سامع سے گفتگو کرتا ہے۔ اِس خود کلامی، مکالمے اور گفتگو میں اُس کا اسلوبِ فکر و بیاں غیر رسمی، بے تکلف، بے ساختہ (Spontaneous) سادہ اور سلیس ہوتا ہے۔ فکر وخیال کے ریشمیں تانے بانے سے اِنشایئے کی بنت (Fabrication) ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ ادبی تخلیق سے ہم اُس وقت تک حظ نہیں اُٹھا سکتے جب تک ہم اُسے ذہنی طور پر پڑھنے کے لیے تیار نہ ہوں۔ ہر انشائیہ نگار کی تخلیق اُس کی اپنی شخصیت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اُس کا مطالعہ جتنا وسیع اور گہرا ہوگا، اُتنا ہی اُس کے انشایئے میں گہرائی اور وسعت کی کرنیں نمودار ہوں گی۔ میں نے منور عثمانی کے تمام انشایئے جو اس مجموعے میں شامل ہیں، نہایت اطمینان اور دلچسپی کے ساتھ پڑھے اور اُن سے پورا لطف اندوز ہوا۔ بلا شبہ وہ نہایت کامیاب انشائیہ نگار ہے۔

انشائیہ نگار پر خیالات کا القا ہوتا ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر جانسن نے اس صنفِ ادب کو خیالات کی آوارہ خرامی یعنی Loose sally of mind کہا ہے۔ انشائیہ ہمیں فکری انبساط اور جمالیاتی لطافت سے ہم کنار کرتا ہے۔ انشائیہ نگار زندگی سے بھرپور پیار کرتا ہے اور اُس کی سرگرمیوں میں دلچسپی سے حصہ لیتا ہے۔ وہ رنگ، نسل، زبان اور قومیت سے ماوراء عظمتِ انسان کا علمبردار ہے۔ اُس کے ہاں اِنسان سے آفاقی محبت کا تصور بدرجہ اتم ملتا ہے۔ انشائیہ نگار اپنی تخلیقی قوت سے اِنسان کے شعور کو بیدار کرکے، اُسے ایک مدار سے دُوسرے مدار میں لے جاتا ہے۔ اِس اہم نکتے کو ڈاکٹر وزیر آغا اس طرح پیش کرتے ہیں:

''انشائیہ اُس صنفِ نثر کا نام ہے جس میں انشائیہ نگار اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اشیا یا مظاہر کے مخفی مفاہیم کو کچھ اس طور گرفت میں لیتا ہے کہ انسانی شعور اپنے مدار سے ایک قدم باہر آکر نئے مدار کو وجود میں لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔''

انشائیہ نگار اپنے تجربات، اپنے احساسات اور رجحانِ فکر کو اپنی تخلیق میں آزادانہ طور پر عیاں کرتا ہے۔ اسی لیے انشایئے میں اُس کی ذات اور شخصیت کا بھرپور انعکاس ہوتا ہے۔ فرانسیسی قول ہے کہ Art is life seen through a temperament یعنی فن

ہی زندگی ہے جو مصنف کی ذات کے حوالے سے دیکھی جاتی ہے۔اس قول کا اطلاق انشائیہ نگار پر مکمل طور پر ہوتا ہے۔انشائیہ نگار اپنا ذہن، اپنا جذبہ اور اپنا مشاہدہ فنی مہارت کے ساتھ صفحہ قرطاس پر منعکس کرتا ہے، اور اپنے مخصوص عارفانہ رویے سے زندگی کے مخفی معانی کو موثر انداز میں پیش کرتا ہے۔انشائیے کی اس پراسرار خصوصیت کے پیشِ نظر اس صنفِ ادب کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے:

''زندگی کے متنوع پہلوؤں کو فکری تجسس اور وجد، کے ساتھ گرفت میں لا کر لطیف اور خوشگوار انداز میں پیش کرنے کا نام انشائیہ ہے۔'' انشائیہ نگار کا یہی وہ رویہ ہے جو اُسے دیگر تخلیق کاروں سے الگ کر دیتا ہے۔

منور عثمانی نے انشائیے کے تمام مقتضیات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے نہایت فکر انگیز اور دلچسپ انشائیے سپردِ قلم کیے اور اُنھیں ''فرنٹ سیٹ'' میں یکجا کر دیا۔میں نے اُس کے تمام اِنشائیوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور فکری انبساط حاصل کیا۔اُس کے ہاں ارادہ، سفر اور منظر کو بہت اہمیت حاصل ہے۔اِرادہ، تخلیقی قوتوں کا مظہر ہے، سفر تخلیقیت کی علامت ہے، اور مناظر لطف و کرم، محبت اور حسن کے چہرے آشکارا کرتے ہیں جو پھلتے، بڑھتے اور شرفِ قبولیت حاصل کرتے ہیں۔یہ وہ مناظر ہیں جو مصنف کے اِنشائیوں کو سندِ قبولیت و افتخار بخشتے ہیں۔وہ جب کسی بس، ویگن یا گاڑی میں سفر کرتا ہے تو فرنٹ سیٹ پر بیٹھنے کو ترجیح دیتا ہے کیونکہ اُس کے نزدیک یہی جگہ ''بہتر، برتر اور موزوں'' ہوتی ہے۔آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہوئے مسافر کے سامنے ایک چھوٹی سی پلیٹ پر لکھا ہوتا ہے کہ ''فرنٹ سیٹ پر سونا منع ہے''۔بحیثیتِ تخلیق کار، انشائیہ نگار اس کے خطرناک نتائج کے برعکس، یہ فکری نتیجہ نکالتا ہے:

''فرنٹ سیٹ پر سو جانا ایک مادی نقصان کا سبب بنے یا نہ بنے، ایک جمالیاتی زیاں کا باعث ضرور بنتا ہے کہ اس پر اونگھنے والا اُس مشاہدۂ جمال سے محروم ہو جاتا ہے جو اُس کا حق بھی ہے اور فرض بھی۔اِس معصوم مطالبے اور محبت بھری تنبیہ کا مقصدِ خاص غافل انسان کو کائنات کے بیکراں حسن کی جانب متوجہ کرتا ہے......''

اپنے انشائیے ''قائل کرنا'' میں وہ قائل کرنے، قائل ہونے، مباحثے میں پڑنے، دلائل دینے اور سننے کے برعکس مذاکرے کو پسند کرتا ہے۔قائل کرنے یا ہونے کے حوالے سے وہ بڑے لطیف نکات ہمارے سامنے لاتا ہے اور ہمیں فکری انبساط عطا کرتا ہے۔مذاکرے اور مذاکرات کے باریک فرق کو بھی وہ بڑی فنی ہنروری کے ساتھ سامنے لاتا ہے: ''ریڈیو کے حق میں آخری آواز'' اس مجموعے کا خوبصورت انشائیہ ہے۔عجیب بات ہے، اسی موضوع پر آج سے غالباً تیس (30) سال پہلے میرا انشائیہ ''عظیم نشرگاہ'' کے عنوان سے ''اوراق'' میں شائع ہوا تھا۔موضوع ایک ہے لیکن ہم دونوں کے نہ صرف اسالیبِ فکر و بیاں مختلف ہیں بلکہ ہماری اپروچ بھی بہت مختلف ہے۔مجھے منور عثمانی کا یہ انشائیہ پڑھ کر مسرت بھی ہوئی اور حیرت بھی کہ انشائیہ نگار، روزمرہ کی زندگی میں کتنی شمولیت، وابستگی اور دلچسپی لیتا ہے۔انشائیہ نگار ریڈیو کو ٹیلی وژن، کتاب اور ٹیپ ریکارڈر پر ترجیح دینے کی قدرت رکھتا ہے۔اس انشائیے کے یہ انشائی جملے نہایت دلچسپ ہیں:

''ریڈیو نے ہمیں ایک حلقہ عطا کیا تھا اور ایک دوسرے کو دیکھتے رہنے کی توفیق عنایت فرمائی تھی۔ٹیلی وژن کی نظارت نے حلقے کا سارا حسن غارت کیا اور ہمیں ایک دوسرے کو تکتے چلے جانے کی عشرت سے بھی محروم کر دیا''۔

''ریڈیو، خلوت کا بھی ساتھی ہے اور جلوت کا بھی۔رفاقت کا یہ انداز، آپ کو کسی اور شے میں نظر آیا ہو تو بتایئے!''

''ریڈیو کسی بھی معقول یا نامعقول مہمان کو بلائے ناگہانی نہیں سمجھتا۔ اس سلسلے میں کتاب کی نسبت ریڈیو کا رویہ زیادہ مثبت، صحت منداور بامروت ہے۔''

ان تخلیقی جملوں سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ انشائیہ نگار کی ذات کا خوبصورت انکشاف اُس کی تخلیقی تحریر میں کس قدر واضح ہے!

''پیدل چلنا'' اس مجموعے کا نہایت دلکش اور خیال انگیز انشائیہ ہے۔ یہ انشائیہ مجھے ذاتی طور پر بے حد پسند آیا کیونکہ بڑھاپے کی زد پر آنے سے پہلے میں صبح سویرے فرائض روحانی سے فارغ ہو کر، چار پانچ میل ضرور پیدل چلتا تھا اور اس عمر میں بھی پیدل چلنے کو باعثِ مسرت سمجھتا ہوں کہ یہ ایک بڑی نعمت ہے۔ قاری اُس انشائیے کو پڑھ کر، بے اختیار یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا ۔۔۔ میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

یہ انشائیہ، تخلیقی جملوں سے مملو ہے۔ درج ذیل جملوں پر غور کیجئے......آپ یقیناً میرے ہم خیال ہو جائیں گے:

''اگر آپ روایتی سائنس دان یا روایتی سیاست دان بننا چاہتے ہیں تو بے شک پیدل مت چلیئے لیکن تخلیقی فن کار بننا چاہتے ہیں تو صرف پیدل چلیئے، خواہ کوئی اور کام نہ کیجئے!''

''پیدل چلنے والے کی صحت اور سیرت قابل اعتبار ہوتی ہے، قابل رشک ہو یا نہ ہو!''

''سواری کا دور، انسانی تمدن کا عبوری دور ہے۔ انتہائی اور حتمی دور وہی ہو گا جب انسان چلنے کے عمل کو اپنائے گا۔ اس انشائیے کے سارے جملے تخلیقی حسن سے مستنیر ہیں۔

انشائیہ ''طنز'' میں مصنف نے طنز کے انشائی حسن کو آشکار کیا ہے اور اس کے مختلف پرتوں کو بے نقاب کیا ہے۔ بلاشبہ یہ انشائیہ بھی دلچسپ اور خیال انگیز ہے:

''مجلسی طور سے طنز ایک تبصرہ ہے لیکن برسبیل تذکرہ تخلیقی اعتبار سے طنز داخلی صنفِ ادب ہے، خارج سے صرف ایک آدھ ردِ عمل حاصل کرتی ہے اور اپنے زرخیز بطون کی جانب لوٹ جاتی ہے۔''

''طنز، بین الاقوامی مزاج کی حامل ہے، گو اپنا مواد مقامیت سے کشید کرتی ہے، تاہم اسلوب اور اپیل آفاقی رکھتی ہے۔''

''ممتحن کی ڈائری'' میں انشائیہ نگار کی ذات، شخصیت اور رجحان طبع کا خوبصورت اظہار ہوا ہے۔ اس فن پارے میں ایک نیا ذائقہ اور نیا رنگ نظر آتا ہے۔ یہاں مصنف، عنوان کے فریم ورک سے نکل کر اپنے رہوارِ فکر کو آوارہ خرامی کراتا ہے اور خوبصورت انشائی (تخلیقی) جملوں سے ہماری کشتِ فکر کو زرخیز کرتا ہے۔

یہ مضمون لکھتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ منور عثمانی کے انشائیوں پر تنقید ممکن نہیں۔ ہم ان سے مادی اور روحانی سطح پر لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ میں آپ کو بھی ''فرنٹ سیٹ'' کے انشائیوں کے مطالعے کی دعوت دیتا ہوں۔

◆◆◆

ہم تو ''لوڈ شیڈنگ'' میں مبتلا ہیں مدّت سے ۔۔۔ چاند کے نگر سے تم چاندنی ہی لے آؤ (اظہر جاوید)

بسمل صابری اور سخن کی جادوگر

بشریٰ رحمٰن

بسمل صابری صاحبہ ایک خوش انداز اور خوش گلو شاعرہ ہیں۔ وہ جب بسم اللہ کا پیرہن اوڑھے صبر کے جھولے میں ہمک رہی تھیں تو انہیں شاعری ودیعت ہوگئی تھی۔ وہ دھیرج سے سہج سہج اس ڈگر پر پاؤں جماتی آ رہی تھیں کہ ان کی زندگی میں چونکا دینے والا وہ لمحہ آیا؟ جو ہر غیر معمولی شخص کی زندگی میں آتا ہے۔1960ء میں لاہور میں منعقد ہونے والے ایک انعامی مشاعرے کی صورت میں وہ لمحہ نازل ہوا۔اور بسمل صابری کو بسمل صابری بنا کے ان کی پوری زندگی پر محیط ہوگیا۔ پھر ان کا راہوار خیال کہیں نہ رُکا۔خوبصورت اشعار تخلیق کرنے والی یہ شاعرہ جذبوں اور جرائتوں کی شدتوں کے ساتھ بگٹٹ دوڑی......گل رنگ وادیوں میں، درد کے جگنوؤں کی تلاش میں...... عشق کی منقش تتلیوں کی کھوج میں...... برستی بارشوں کے رم جھم کرتے موتیوں میں بھیگتی......گنگناتی......لودیتی پاروں کے پیچھے پیچھے......

کیا کوئی شخص ایک روز یونہی دن چڑھے شاعر بن جاتا ہے......

نہیں......شاعری کرنے کے لئے دل کو اندوہ کی جھیل بنانا پڑتا ہے۔کرب کی لہروں پر کنول کا ایک پھول اگانا پڑتا ہے......اس کنول کو محبت کہتے ہیں۔محبت کا کنول درد و اندوہ کی جھیل پہ کھلتا ہے۔ ہرا رہتا ہے۔محبت کے پاؤں میں سدا ہجر کی پائیل رہتی ہے......جس کے اندر سے سوز و گداز بھرے زمزمے نکلتے رہتے ہیں! جو دلوں کے تار ہلاتے رہتے ہیں۔محبت کی کوئی ایک شکل نہیں ہے۔ ہزار روپ ہیں اس کے،غم جاناں سے غم زمانہ تک......اس سے نبرد آزما ہوئے بغیر پتہ ہی نہیں چلتا کہ دنیا کا چلن کس قدر انسانیت کش ہے۔روپ کی بستی میں سروپ کتنے ہیں۔رشتہ و پابندیاں کس کس موڑ پر آزاد بن جاتی ہیں۔

یہ کیا ہوا کہ اتنی مسافت کے باوجود — اب دوستوں کے لب پہ بھی حرفِ دعا نہیں!

....

دنیا تیرے فراق کی تصویر ہو گئی — اب تو تیرا خیال بھی اپنا لگے مجھے!

بسمل صابری صاحبہ کی شاعری ہمہ گیر ہے۔

مگر مجھے اس میں جو بات اچھی لگتی ہے۔وہ یہ کہ ہر معاملے کے ساتھ معاملہ دل چلتا رہتا ہے جو ذوقِ زندگی اور شوق بندگی کا مظہر ہے۔علامہ اقبال نے بھی کہا تھا ع ''عشق نہ ہو تو شرع و دیں تبکدۂ تصورات''

عشق مجاز سے عشق حقیقی تک......کسک ہی کسک ہے۔تڑپ ہی تڑپ ہے۔ایک والہانہ خود سپردگی ہے۔ایک عارفانہ پیاس ہے۔جسے بجھانے کی نہیں بڑھائے رکھنے کی تمنا رہتی ہے۔کہ یہی پیاس شاعری کے نخل کو اشکوں سے سیراب کرتی ہے۔

لفظوں کی ردا اوڑھ کے نکلی تھی سفر پر ۔۔۔ ہے اس میں میرے رب کی رضا یاد رہے گی

یہ رب کی رضا انہوں نے زندگی کے اصول ترتیب دیتے وقت سامنے رکھی۔ زندگی کہتی ہے...... بن مول میں کوئی شے نہیں دیتی۔ مجھے گزارو۔ مجھے بسر کرو۔ مجھے سَر کرو۔ چاہے شاہ نشیں ہو یا گدڑی نشیں، خرقہ پوش ہو یا خلعت پوش......زندگی خراج سے پہلے انسان کو تھکاتی ہے۔ بھگاتی ہے۔ آزماتی ہے۔ راہوں میں کانٹے بچھاتی ہے......تب پھول چننے کی ادا بخش دیتی ہے۔ بسمل صابری ان تمام مرحلوں سے گزر کے زندگی کے میزان پر پوری اتریں تو وہ باتیں کہنے کے قابل ہوگئیں جو ہر دل کی آواز بن گئیں۔

شب فراق سے رشتہ ہے پاسداری کا ۔۔۔ مثالِ موج نفس تار تار پھرتے ہیں

....

میں نے تو اک چراغ ہواؤں میں رکھ دیا ۔۔۔ جلتا رہا کہ بجھتا رہا یاد کچھ نہیں!

....

راہنمائی جب سے تیری ملتفت نظروں نے کی ۔۔۔ میری ہستی اس جہاں میں معتبر ہونے لگی

....

پائی ہے کب کسی نے یہاں منزلِ مراد ۔۔۔ میری کہانی مفت میں بدنام ہو گئی

عام طور پر لوگوں نے محاورہ بنا رکھا ہے کہ اہل قلم قسم کے لوگ با عمل نہیں ہوتے۔ مگر بسمل صابری صاحبہ اپنی ذاتی اور نجی زندگی ایک مجاہدانہ بت وتاب سے گزاری ہے۔ بلکہ کسب معاش کے مراحل ملی فرائض کے جذبے کے ساتھ طے کئے ہیں۔ چار خوبصورت بیٹوں کی احسن طریقے سے پرورش کی ہے۔ اور انہیں عملی دنیا کے کامیاب انسان بنایا ہے۔ رشتوں ناطوں کو خوب نبھایا ہے۔

اور سب سے بڑی بات یہ کہ نسوانی وقار اور پندار کی چادر کا پلو سر سے سرکنے نہیں دیا۔ وہ ایک با کردار، با حیا اور با عمل شاعرہ ہیں۔

ایسی خواتین جو اپنی زندگی فن کی ترویج میں ایک مشن کی طرح گزارتی ہیں۔ اور اپنے فرائض منصبی بھی پوری طرح ادا کرتی ہیں۔ وہ ایک رول ماڈل کی طرح ہوتی ہیں۔

ایسی عورتیں گو چھوٹے شہروں میں پیدا ہوتی ہیں۔ مگر بڑے شہروں میں ان کے نام کی شامیں منائی اور سجائی جاتی ہیں۔ بسمل صابری صاحبہ! نے بھی سستی پی آر اور عامیانہ ہتھکنڈوں سے ماورٰی ہو کر جہد مسلسل کی ڈگر پر اپنے فن کا سفر طے کیا ہے۔ تبھی شہرت ان کے دروازے تک خود چل کر آئی ہے۔ محترمہ بسمل صابری صاحبہ! ہم عورتوں کے لئے باعثِ فخر ہیں اور آنے والی نسلوں کے لئے قابلِ تقلید بھی! میری دُعا ہے کہ باری تعالٰی ان کے جذبِ دروں اور سوزِ گلو کو فکر و آگہی کی دنیا میں ہمیشہ سر سبز اور چمکتا و دمکتا رکھے۔ آمین! ان کے فن کے آنگن میں یادوں کی برسات ہوتی رہے اور وہ کہتی رہیں ؎

بسملؔ بھگو گئیں تجھے یادوں کی بارشیں ۔۔۔ بھولی ہوئی تھی جس کو وہ یاد آ گیا مجھے!

◆◆◆

سیّد ریاض زیدی کا شعری اُسلوب

حسن عسکری کاظمی

عہدِ موجود میں غزل کے مضامین کی وسعت پذیری اور روایت سے آگے قدم بڑھانے کا رجحان دیکھ کر غزل کی مقبولیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے لیکن یہ طرزِ احساس بھی اہمیت رکھتا ہے کہ اپنے گردوپیش میں ہونے والی غیر محسوس تبدیلی کا ادراک صرف ان شاعروں کا مقدر ٹھہرا ہے جو وسیع المطالعہ اور ہمہ جہت اظہار پر قدرت رکھتے ہیں، مختلف اصنافِ سخن برتنے اور ان میں غزل جیسی مقبول صنفِ سخن کے حوالے سے یہ کہنا کہ ''مجھے غزل سے طبعاً پیار ہے، میں جنم جنم سے اس کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہوں'' ایک ایسے شاعر کا بیان ہے جو قارئین میں نعت نگاری کے اعتبار سے متعارف ہے، ہماری مراد سید ریاض حسین زیدی جیسے کہنہ مشق سخن ور سے ہے، ان کے تین مجموعہ ہائے نعت ''ریاض مدحت''، ''جمالِ سید لولاک'' اور ''ذکر شہ والا'' کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہے اور تینوں مجموعے ایوارڈ یافتہ بھی ہیں لیکن وہ بحیثیت غزل گو بھی اپنا منفرد اسلوب رکھتے ہیں۔ غزل کی نشریت میں کسے کلام ہے لیکن عہد موجود کی غزل میں کسک کی بجائے چونکانے اور نت نئی علامتوں کا ہنر آزمانے کی شعوری کوشش کارفرما ہے، دوسرے غزل میں رسیلا پن کم ہوا جاتا ہے اس کی بجائے تفکر اور تدبر جسے فلسفہ بھی کہا جاسکتا ہے غزل میں راہ پا رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ اب تغزل میں معنوی وسعت پیدا ہو چکی ہے، تغزل سے مراد وہ لذت آزار ہے جو تلخ و شیریں ذائقوں میں تبدیل ہو کر شاعر کی تخلیقی قوت کو نئے امکانات سے روشناس کرتی ہے۔ گویا نو بہ نو مضامین کو غزل کے مزاج کا ادراک رکھتے ہوئے شعری پیرہن میں صفحۂ قرطاس پر جلوہ نما کرنا تغزل کہلاتا ہے۔ اس میں لب و رخسار کا تذکرہ بھی ہو جائے یا شمع و پروانہ کی بات بھی ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن چبائے ہوئے نوالوں کو چبانے سے غزل کا حسن و جمال معرضِ خطر میں پڑ جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ آج کی غزل نئے مشاہدات، نئے تجربات اور نئے استعارات کا تقاضا کرتی ہے، برگِ گل پر شبنم کا موتی ہر شخص کو دکھائی دیتا ہے لیکن یہ شادابی کہاں سے آئی اس کی تفہیم کے لئے ریاضتِ فن ضروری ہے، صداقتِ حرف کی ضمانت اسی صورت میں پیش کی جاسکتی ہے جب شاعر اپنے گردوپیش کا مشاہدہ کمال ہنرمندی سے کرتا ہے، فی زمانہ تخلیقی صلاحیتوں کو آزمانے کی خاطر غزل کہنے والوں میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ نعت نگار شعراء بھی جہاں نعت میں تغزل کی کارفرمائی کا معجزہ دکھانا چاہتے ہیں وہاں غزل میں تزکیہ نفس کی جلوہ نمائی کا اہتمام بھی ضروری خیال کرتے ہیں چنانچہ سید ریاض حسین زیدی غزل کی نزاکتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے صاف صاف بات کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ ''مجھے غزل کے کلاسیکی اسلوب کے بے پناہ حسن اور اس کی جادوئی بنت نے اس قدر متاثر کیا کہ میں نے زندگی کے ہر موضوع کے حسن ابلاغ کے لئے اس سے بہتر اور تیر بہدف اظہار یہ کہیں نہیں دیکھا''

دیکھنا یہ ہے کہ غزل اور نعت کی ہیئت اور بُنت میں قافیہ اور ردیف کی اہمیت کے پیش نظر اندازِ اظہار میں سمندر کو ایک کوزے میں

بند کرنے کا فن اپنی جگہ لیکن ارادت اور عقیدت نعت میں جلوہ فرما ہوتی ہے جب کہ غزل میں رغبت اور محبت کے علاوہ حسیت کی معجز نمائی بھی دلپذیری کا سبب بنتی ہے، ریاض زیدی کی غزل میں حرمتِ لفظ اور صداقتِ اظہار کے گونا گوں پہلو ابھر کر سامنے آتے ہیں، خود آ گہی اور بدلتی ہوئی تہذیبی قدروں کا شعور ان کی غزل میں قاری کو نئے آفاق سے ہمکنار کرتا ہے۔

دوسروں کی خبر جو رکھتے ہیں کاش اپنا بھی زائچہ دیکھیں
بے پروبال ہو گئے کیسے کیسے اجڑا ہے گھونسلا دیکھیں

ہم سب اولادِ آدم ہونے کے ناتے ایک زندہ اکائی کی طرح اس کرۂ ارضی کو سنوارنے، نکھارنے اور سرسبز و شاداب کرنے کی خاطر سرگرم عمل رہتے ہیں اور صبح درخشاں کے طلوع ہونے کے منتظر شبِ دیجور کو آنکھوں میں کاٹ رہے ہیں، مگر وہ صبح درخشاں جواب خواب ہوئی جاتی ہے کہ آج بھی اہل درد افق زاروں پر نظر رکھے ہوئے ہیں لیکن ہم خود احتسابی سے گریزاں ہیں ورنہ یہ صبح بہت پہلے طلوع ہو چکی ہوتی، ہمیں کسی صورت ناامیدی اور تذبذب کی ضرورت نہیں اس لئے کہ ہم نے بہت سے دکھ جھیلے ہیں، ہم آگ کے دریاؤں کو تیر کے آئے ہیں، ہم نے مخالف قوتوں کے ارادے خاک میں ملا کر اس سرزمین کو صدر شک گلستان بنانے کی خاطر اپنے سفر کا آغاز کیا ہے، ریاض زیدؔی کی آنکھ میں یہ سب منظر خوں رنگ محفوظ ہیں، غزل ایسی معتبر صنف شاعری ہے جو ایجاز و اختصار کے ساتھ شاعر کے بطون کی عکس نمائی کر سکتی ہے۔

شعورِ ذات سے کھلتا ہے کائنات کا راز سمندِ شوق کو حیرت کا ہم سفر کر لیں
تپش دنوں کی بڑی خوش دلی سے راس آئے شبِ دراز کو ہمت سے مختصر کر لیں

....

دوستی آبلوں سے اچھی ہے کیا خبر راہ پُرخطر آئے
راحتیں اس کے پاؤں پڑتی ہیں آزمائش سے جو گزر آئے

ریاض زیدی نے غزل میں ترسیل فکر کرتے ہوئے اپنے ماحول کی زبوں حالی اور معاشرتی خرابیوں پر طنزیہ لہجے میں اظہار خیال کیا لیکن غزل کی نزاکت سے انحراف نہیں کیا، دراصل انہیں ہمہ جہت آئینہ دکھانا مقصود ہے، انہوں نے زندگی بھر کی ریاضت سے کام لیتے ہوئے غزل کے آبگینے کو شکست سے محفوظ رکھنے کا ہنر آزمایا ہے، یہ کام آسان نہیں کہ ایک طرف شب کی سیاہیوں کو مٹانا ہے اور دوسری طرف انسانی رشتوں کے تقدس پر حرف آنے کی حکایت بیان کرنا ضروری ہے۔

وعدہ ان کا تھا روز روشن کا تان ٹوٹی ہے کالی راتوں پر
قہقہوں میں سرور ملتا ہے کان دھرتا ہے کون آہوں پر
جن میں کشکول ہے گدائی کا شرم آتی ہے ایسے ہاتھوں پر
منقسم ہو گیا مکاں سارا وارثوں میں ٹھنی ہے حصوں پر

....

ہمارا معاشرہ عدل وانصاف کو طاقِ نسیاں کی نذر کر چکا ہے، ظلم وتعدّی، استحصال اور تذلیل انسانیت کے ناقابل رشک رویّے

راہ پا چکے ہیں، باہمی احترام کی روایت کمزور پڑنے اور عداوت کو فروغ ملنے کے نتیجے میں دہشت گردی نے ''جہاد فی سبیل اللہ'' کی صورت اختیار کر کے معاشرے کو شکست و ریخت سے دوچار کر دیا ہے، شاعر کے نزدیک یہ منفی سوچ مثبت طرزِ حیات کے نظریے کے حق میں زہر قاتل ہے چنانچہ ریاضؔ زیدی کا کہنا بجا ہے کہ ہم نے اپنے سر زندگی کی تہمت لے کر مجبوری کو حرزِ جاں بنا رکھا ہے۔

اپنا جینا بھی گویا جینا ہے — ایسے جینے سے ہم تو باز آئے
راستے چھپ گئے، اندھیروں میں — قافلہ جگنوؤں کا اب آئے

امین راحت چغتائی نے ان کی شاعری کے تہذیبی کردار کے حوالے سے پتے کی بات کہی ہے کہ پروفیسر زیدی کی شاعری مدرک بھی ہے اور محرک بھی، علم و عرفان نے بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں، لہٰذا وہ زہر ہلاہل کو قند نہیں کہتے، تجربے اور مشاہدے کے عمل میں تسلسل کو برقرار رکھتے ہیں جس سے ان کا کلام اُجلا اُجلا سا لگتا ہے، وہ اجتماعی فہم کی اہمیت کے قائل ہیں لیکن انفرادی تجربے کو جلا بخشنے کے فرض سے بھی غافل نہیں، اس میں شک نہیں کہ ریاض زیدی سچائی کے اظہار میں کسی مصلحت کو خاطر میں نہیں لاتے اس طرزِ احساس نے ان کے ہاں صاف گوئی کو فروغ بخشا، وہ غزل کی زبان میں جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اسے غور و فکر کی چھلنی سے گزار کر قاری کے گوش گزار کرتے ہیں، انہیں اس حوالے سے خود سے مشورہ کرنا بھلا معلوم ہوتا ہے، وہ خود آگہی کی اہمیت سے باخبر ہیں۔

یہ سوئے ظن، یہ بد اندیش وسوسے توبہ — خدا کرے، یہ رہے، دور ہم سے آلائش
دل و نظر کی حمیت پہ شاق گزری ہے — لبوں پہ بھول کے آئی ہے جب بھی فرمائش

وہ غزل میں معاملاتِ مہر و محبت کا ذکر چھیڑتے ہوئے محتاط انداز اختیار کرتے ہیں، خصوصاً بیتے دنوں میں جب عہدِ شباب کی سرمستی اور بےخودی کا ذائقہ ان کی شاعری میں در آتا رہا، وہ محبوب کے معصومانہ رویوں سے لطف اندوز ہونے اور کیف و سرور میں مبتلا رہنے کی عادت اپنا چکے ہیں، اس عبوری دور میں جو تجربے حاصل ہوئے انہیں بھلانا ممکن نہیں انسان کی نفسی کیفیت کا المیہ یہی ہے کہ وہ ماضی کو حال بنا کر بھولی بسری باتوں کی تائید میں تشہیر سے اجتناب نہیں کرتا۔ اپنی نفسی کیفیت کے اظہار میں بے باک ہونا اور ماضی کو حال میں کھینچ لانا ہے، حسرت موہانی جیسی نفسی صورتِ حال ریاض زیدی کی غزل میں جھلکتی دکھائی دی اور قاری نے ان کے ماضی کا مرقع کھلی آنکھوں سے دیکھا۔

حرفِ استفسار پر میرے وہ اس کا چونکنا — بھول پن کا یاد ہے دل کو وہ منظر آج بھی
بے حجابی کمال فن اس کا — پردہ داری بھی جس سے شرمائے
نظر ملے تو چراغاں ہو دل کے آنگن میں — ہو آنکھ مستی بھری، زلف تابدار بھی ہو

ریاضؔ زیدی کی تربیتِ نفس اس جہت پر ہوئی کہ وہ غمِ عشقِ حقیقی کی منزل پر قدم رکھنے سے پہلے ذہنی بلوغت کا مرحلہ بخیر و خوبی طے کر چکے تھے، وہ قبیلہ غیرت نشاں کے فرد ہونے کے ناتے پاک طینت بھی ہیں اور صاحبِ فضیلت بھی یہی وجہ ہے کہ ان کا برگ گل شاداب ہے اور یہ شادابی گریہ پیہم کا اعجاز ہے انہیں حوادث نے شعورِ حیات و ممات سے نوازا۔

ہو چکا ہوں میں تب سے لب بستہ — جب سے وابستہ اس کے غم سے ہوں
پاک طینت ریاض کیوں نہ رہوں — دل حرم سے ہے، میں حرم سے ہوں

◆◆◆

''گیان نامے بہ نام ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی''......ایک مطالعہ

سکندر حیات میکن

اکیسویں صدی کے منظر نامے پر نظر دوڑائیں تو گشتی فون اور گشتی فون کے ذریعے پیغام رسانی نے خط نگاری کی خوب صورت روایت کو ختم کر دیا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی نے الفت ناموں کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ حقیقت ہے کہ جو مزا خط پڑھنے میں ہے وہ SMS پڑھنے میں ہرگز نہیں ہے۔ کلاسیکی شاعری میں قاصد کا ایک اپنا مقام تھا۔ اسی طرح ایک زمانہ تھا جب ڈاک کے ہرکارے کی راہ میں لوگ دیدہ و دل فرشِ راہ کرتے تھے۔ محبت ناموں کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی شخصیات سے بھی ہم کلام ہوتے تھے۔ خطوں میں پوسٹ کی ہوئی داستانیں نہ جانے اپنے اندر کیا کچھ سموئے ہوئے ہوتی تھیں۔ آج یہ سب کچھ ماضی کا قصہ اور فلمی دنیا محسوس ہوتی ہے۔

اُردو خطوط کی روایت میں بلاشبہ غالب نے اپنا حصہ اس طرح ڈالا ہے کہ غالب ہی سے اُردو خطوط نگاری کا آغاز و ارتقا ہوتا ہے۔ غالب کے بعد دیگر ادبی مشاہیر نے خطوط نگاری میں خوب حصہ لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے خطوط نگاری ادب کا ایک معتبر حوالہ بن گئی۔ خطوط ہی کی بدولت ادبی مشاہیر کے مخفی گوشوں کی عکاسی ہوتی ہے۔ خطوط کے ذریعے ہی سوانحی نقوش کی توضیح ممکن ہوتی ہے۔

معروف اقبال شناس اور نامور محقق ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی خطوط کے بھی دل دادہ ہیں۔ خط کا جواب دینا فرض سمجھتے ہیں۔ اسی طرح علمی و ادبی شخصیات سے خط کتابت ان کا محبوب مشغلہ بھی ہے۔ زیرِ نظر کتاب ''گیان نامے بہ نام ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی'' ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد کی مرتّبہ ہے جو سرمد اکادمی، اٹک سے ۲۰۱۳ء میں شائع ہوئی ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ مکاتیب میں ڈاکٹر گیان چند کے تیس خطوط شامل ہیں جو ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کو لکھے گئے۔

''ڈاکٹر گیان چند'' کے عنوان سے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے ایک مفصل مضمون تحریر کیا ہے جس میں گیان چند کے شخصی اور علمی و ادبی کارناموں سے بحث کی گئی ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے گیان چند کی ادبی خدمات کو مستحسن نظروں سے دیکھا اور بیان کیا ہے۔ لیکن گیان چند کی کتاب ''ایک بھاشا، دو لکھاوٹ، دو ادب'' کی اشاعت (2006ء) کے بعد ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی رائے ڈاکٹر گیان چند کے بارے میں متزلزل ہو گئی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

> ''گیان چند کے انکسار، وضع داری، صاف گوئی اور سب کے لئے جذبہ ''خیر سگالی'' کے پیشِ نظر میرے ذہن میں ان کی مرنجان مرنج شخصیت کی ایک اچھی تصویر بنی ہوئی تھی مگر ان کی کتاب ''ایک بھاشا دو لکھاوٹ، دو ادب، سامنے آئی تو یہ تصویر دھندلا گئی بلکہ اچھی خاصی مسخ ہو گئی اور ان کے تضادات کھلنے لگے۔'' (ص 15)

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد نے ''عرضِ مرتّب'' کے عنوان سے گیان چند کی ادبی و علمی زندگی کا نقشہ خوب صورت انداز میں رقم کیا

ہے۔تاہم انہوں نے بھی اپنے مضمون میں ڈاکٹر گیان چند کی متنازع کتاب پر تین حرف بھیجے ہیں۔

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد نے خطوط کی اہمیت کے حوالے سے اپنی دانش مندانہ رائے کا اظہار یوں کیا ہے:

''خطوط، بلاشبہ تحقیق کا بنیادی ماخذ ہیں۔مشاہیر اہلِ قلم کے مکاتیب قیمتی معلومات کا گنجینہ ہوتے ہیں اور ان کی روشنی میں ان کی شخصیت تمام تر خال وخط کے ساتھ اجاگر ہوتی ہے یہی نہیں بل کہ ان کا عہد ان خطوں میں پورے طور پر جلوہ ریز ہوتا ہے پچھلے کچھ عرصے سے مکتوب نگاری کی صنف کو پھلنے پھولنے اور فروغ پانے کا خوب موقع مل رہا ہے۔معروف شعراء، ادبا، علما اور دانش وروں کے مکاتیب کے بیسیوں مجموعے شائع ہو کر علمی ادبی میدانوں کے ثروت میں اضافے کا باعث بنے ہیں''۔(ص28)

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے نام پہلا خط 5 مئی 1986ء کو لکھا گیا۔گیان چند نے اس خط میں علامہ اقبال سے متعلق مباحث کو موضوع بنایا ہے۔دوسرا خط 23 جون 1986ء کو لکھا گیا۔جس میں اختصار کا پہلو نمایاں ہے۔خط ملاحظہ کیجئے جو صرف دو سطروں پر محیط ہے:

''میں نے رجسٹری سے اپنے کئی مضامین آپ کو بھیجے تھے کہ پاکستان کے مختلف رسالوں میں شائع کرانے کا کام کرائیں۔مجھے ان کی رسید نہیں ملی۔کیا اقبال پر میرے کام کی اشاعت کی اُدھر کوئی سبیل ہو سکتی ہے۔''(ص37)

ڈاکٹر گیان چند کے مکاتیب سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے لمبے چوڑے القابات سے صرفِ نظر کیا ہے۔وہ خط کی پیشانی پر حرف اپنا پتا اور ''محبی!تسلیم''۔لکھ دیتے ہیں۔اسی طرح خط کے آخر میں صرف ''مخلص'' لکھتے ہیں۔زیرِ نظر مجموعے میں تمام خطوط میں ان کا طریق کار یہی ہے۔

گیان چند نے اپنے خطوط میں علمی وادبی مباحث کے ساتھ ساتھ اقبالیاتی ادب کو زیادہ تر خطوط میں موضوع بنایا ہے اور اپنی کتب، نئی کتب اور رسائل وجرائد کے حوالے سے استفسارات بھی کیے ہیں۔لیکن کچھ دیگر امور بھی زیرِ تذکرہ آئے ہیں مثلاً اپنے ایک خط میں پاکستان اور اہل پاکستان کو یوں خراج پیش کیا ہے :

''مجھے پاکستان اور اہل پاکستان بہت پسند آتے۔اردو والوں کے حسن سلوک نے میرا جی موہ لیا۔لاہور کے اساتذہ، طلبہ اور درس گاہیں کبھی میرے جذبات سے محو ہونے والی نہیں۔آپ حضرات سے ملاقات محض ایک دو لمحے کے لیے ہوتی۔سمندر سے پیاسے کو شبنم ملے تو تشفی تھوڑے ہوتی ہے۔جی چاہتا ہے کہ بہ شرط حیات ایک بار پھر آپ کے پاس آؤں۔آپ نے تاریخی ادارے اورینٹل کالج میں مجھے کم سواد کے لیے جیسا شاندار اجتماع کیا، اس کے لیے کالج اور شعبے کا تہہ دل سے مشکور ہوں آپ نے لطف خاص الخاص، سے کام لے کر میرے مستقر پر دوبار قدم رنجہ کیا''۔(ص79)

اسی خط میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی سادہ لوحی اور منکسر المزاجی کی تصویر یوں کھینچی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اردو کے سب سے بڑے شاعر اقبال کے سب سے بڑا ادا شناس و ماہر (آپ) کو ابھی تک پروفیسری پر فائز نہیں کیا گیا۔یہ پاکستان کے لیے شرم کی بات ہے ہندوستان میں متعدد ایسے معلّم جو آپ کی خاک پا بھی نہیں، پروفیسر بنے ہوئے ہیں معلوم نہیں آپ کے ساتھ کب انصاف ہوگا''(ص79)

بعض خطوط میں گیان چند کی حس مزاح بھی نمایاں ہے۔ کبھی کبھی کوئی جملہ زیر لبی کا باعث بنتا ہے اور پھر قاری کا قہقہہ چھوٹ جاتا ہے۔ 24 راگست 2000ء کو لکھے گئے خط میں ڈاکٹر گیان چند کا شگفتہ انداز ملاحظہ کیجیے:

"میں اور میری بیوی بیماریوں کے تھیلے ہیں۔ ابھی 13 راگست کو میں نے ہرنیا کا آپریشن کرایا جو اس بیماری کا میرا چھٹا آپریشن ہے ساتھ ہی مجھے Parkinsons Disease بھی ہو گیا ہے لیکن مجھے رشک نہیں"۔ (ص 82)

اسی طرح ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

"تحسین فراقی اور اورنگ زیب صاحب کو میرا سلام پہنچا دیجیے۔ فراقی بڑے شگفتہ ہیں وہ فراقی نہیں وصالی ہیں"۔ (ص 79)

مکاتیب کے آخر میں ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد نے حواشی و تعلیقات درج کیے ہیں جو اس مجموعۂ مکاتیب کی تفہیم میں مدد معاون ثابت ہوتے ہیں۔ وضاحت طلب باتوں اور شخصیات کے حوالے معلومات کا خزینہ ہیں۔ اس مجموعہ مکاتیب کے آخر میں کتابیات بھی درج کی ہے جو مرتب کی تحقیقی و تدوینی بصیرتوں پر دال ہے۔

گیان نامے بہ نام ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، علمی و ادبی سرمایہ ہے اور مقام شکر ہے کہ یہ خطوط قارئین کو نظر نواز ہوئے ہیں۔ یہ خطوط گیان چند کی شخصی و ادبی جہتوں کی نمائندگی کرتے بھی نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد مبارک باد کے مستحق ٹھہرتے ہیں کہ انھوں نے تحقیق و تدوین کے کٹھن مرحلوں سے گزر کر ان خطوط کی رسائی عوام تک کروائی ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے علمی و ادبی رویے کا پرچار کرتے ہوئے یہ خطوط ڈاکٹر ناشاد کے حوالے کر دیئے۔

◆◆◆

معروف افسانہ نگار اور شاعرہ آصفہ نشاط کی نئی افسانوں کی کتاب

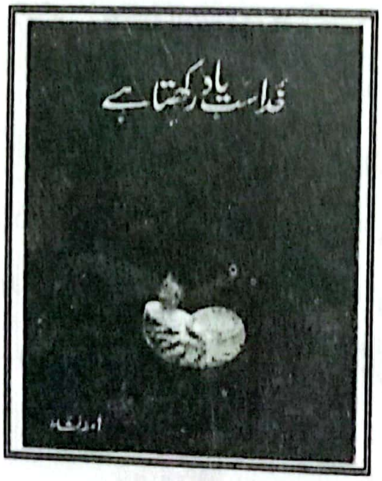

خدا سب یاد رکھتا ہے

شائع ہو گئی ہے

قیمت : -/300 روپے

ملنے کا پتہ: 9722. W. 167th St. Lawndale C.A. 90260

وہ چاہے جس کو عطا کر دے روشنی اپنی

ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی (انڈیا)

سرزمین بہار کے فرزند مراق مرزا، افسانہ نگار اور شاعر کے روپ میں اپنی تحریروں کے ذریعہ ادب میں ایک منفرد شناخت کی منزل کی طرف گامزن ہیں اور اس سفر میں ان دنوں وہ ''سورج'' کے زیر سایہ تیز رفتاری سے رواں دواں ہیں۔

سورج...... جس کے بارے میں برسوں پہلے پولینڈ کے مشہور سائنسداں ''کوپرنیکس'' نے یہ انکشاف کیا تھا کہ کائنات کا مرکز سورج ہے، زمین نہیں۔ تب سے نظام شمسی اور متعدد کہکشاؤں کے وجود کا تصور آج ایک مسلمہ نظریہ بن چکا ہے۔ خود خدائے بزرگ و برتر نے، جو خلاق کائنات ہے، قرآن مجید میں جہاں زمین و آسمان کی، ہواؤں کی، بادلوں کی، رات اور دن کی اور چاند تاروں کی قسم کھائی اور اس سے آگے بڑھ کر سورۂ الضحیٰ اس وقت کا مظہر ہے جب سورج نصف النہار اعظم پر ہوتا ہے۔ ان دو سورتوں کے اندر ہی سورج کی وجودی اہمیت، افادیت اور عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔

مراق مرزا بھی اپنی تمام تر مراقیت اور جنوں کے باوجود مدار کائنات سے ہٹتے نہیں ہیں بلکہ زندگی، انسان اور کائنات...... سب کو سورج کے مدار سے دیکھنے، دکھانے اور سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں جس کا ثبوت ان کا زیر نظر شعری مجموعہ ''سورج کے آس پاس'' ہے۔ سورج ان کے یہاں پوری کائنات پر چھا جانے والی قوت، وقت کو دن اور رات میں بدل دینے والی طاقت ہے۔ ان کا خیال ہے کہ انسان کے قلب میں اگر سورج روشنی کا عرفان بن کر اتر جائے تو وہ دشت وصحرا سے سمندر نکال سکتا ہے اور پتھر کو بھی تابنا کی اور جلا بخش سکتا ہے، بلکہ کمزور و ناتواں انسانوں کی محنتیں اور صلاحتیں بے چراغ گھروں میں بھی ایسے پیکر تراش سکتی ہیں جو سورج کی طرح روشن ہوں۔

ان حقائق کی وضاحت اور تشریح و تفہیم کے لئے مراق مرزا نے اپنی شاعری میں علامتوں اور استعاروں سے کام لیا ہے۔ ان کے آسمان فکر وسخن پر سورج علامت ہے روشنی کی، حرارت کی، سرگرمیوں کی، تگ ودو کی، بصارت وبصیرت کی، فہم وفراست کی، طمانیتِ قلب وخود اعتمادی کی، ایقان وعرفان کی، روحانی مسرت وانبساط کی، عبادت وریاضت کی اور ایک روشن صبح یعنی زندگی کے آغاز کی!! مراق مرزا وہ قلندر ہے جو غیر مشروط طریقہ پر صبح کے اس پیغامبر، سورج، ہی میں سب کچھ دیکھ لیتا ہے۔

دنیا کے سب رنگ ہیں اس کے، ہر منظر میں سورج ہے　　　ہر دھرتی کا مالک ہے وہ، ہر امبر میں سورج ہے
ہر مظہر میں جلوہ اس کا، ہر آیت اس کا چہرہ　　　وقت کی ہر آواز میں سورج، ہر پیکر میں سورج ہے

وحدت الوجود کا فلسفہ ہو یا وحدت الشہود کا، اس واحد مطلق کی ذات سے انکار ناگزیر ہے۔ مراق سا دیوانہ اسی لئے تو ''سورج کے آس پاس'' یوں دست افشاں، رقصاں ومستاں ہے!

''ایک ہی ہے ہمیشہ سے، اور رہے گا سدا
کبھی نہ ہو گا جہاں میں جواب سورج کا
نہ تاب لا سکی پل بھر کو بھی نگاہِ کلیم
جو کوہ طور سے ابھرا شباب سورج کا''

سچ تو یہ ہے کہ مراقؔ جیسے مستانہ جوگی اور صوفیٔ صافی کے لئے سورج ہی عرفانِ کائنات اور معرفتِ الٰہی کا سب سے توانا وسیلہ ہے۔ وہ اپنے دل میں، اپنے وجود میں، اپنی آتما اور انتر آتما میں سورج کو سانس لیتے ہوئے پاتے ہیں۔ ان کو اپنی رگ و پے میں سورج کی کرنیں اترتی، پھیلتی، جگمگاتی، حرکت کرتی، قلب کو گرماتی اور روح کو تڑپاتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ اور پھر یہ روشنی ان کے وجود سے نکل کر ان کے حرف حرف اور لفظ لفظ میں معنوی وسعتوں، پرتوں اور تہہ داریوں کے ساتھ جلوہ دینے لگتی ہے۔

شاید...... یہیں کہیں،...... اسی جگہ...... اس سورج کے آس پاس، ''من تُو شدم، تُو من شدی'' کی منزل موجود ہے جس کی تلاش میں مراقؔ مرزا برسوں سے رواں دواں ہیں۔ لوگ چاند کے سفر پر جاتے ہیں، لیکن میری دعا ہے کہ مراقؔ مرزا سورج کے اس سفر پر یوں ہی گامزن رہیں!!

شاید کہ مراقؔ اک دن اس راہِ تصوف میں
سورج ہی صدا بن کر، سورج کا پتہ دے گا

کیونکہ......

وہ چاہے جس کو عطا کر دے روشنی اپنی
کہ ہے ازل سے ہی یہ اختیار سورج کا

اس لئے...... یہ سفر ختن مبارکباد!!!

◆◆◆

معروف سفرنگار، افسانہ نگار اور شاعر

بی۔ ڈی۔ کالیہ ہمدم

کا سفرنامہ

آبشارِ ادب

شائع ہو گیا ہے

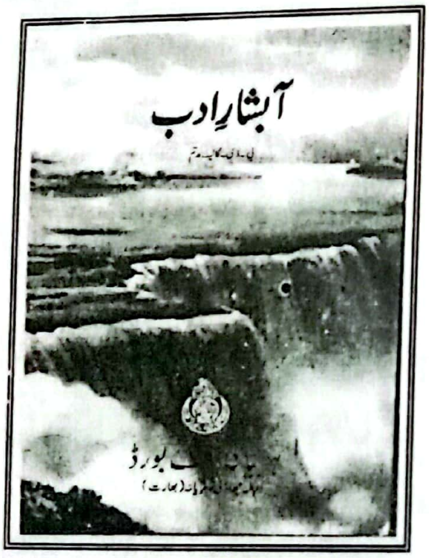

ملنے کا پتہ

ہریانہ وقف بورڈ، 50۔ سردار پٹیل مارگ، انبالہ کینٹ-133001

اسد بیگ

نعت

مکّن ہنجو ہوکے ہاواں
میں وی شہر مدینے جاواں

پاک نبیؐ دے روضے اُوتے
دُکھڑے دل دے آپ سناواں

ٹھنڈ پے جاوے سینے اندر
اکھیاں دی میں پیاس بجھاواں

جَد آقا نیں آپؐ سہارا
ککھاں وانگو کیوں رُل جاواں

دم دم اسدؔ کراں وظیفہ
دم دم جپاں آپؐ دا ناواں

OOO

بشریٰ رحمٰن

صوفی غزل

پنج رادھے شام مناویں گی
پیریں گھونگھرو وصل دے پاویں گی

اکھیں کجلا عشق دا لاویں گی
سجناں نال اکھ ملاویں گی

گل کرتی جوگ دی پاویں گی
ساری رات سہاگ مناویں گی

راتیں جاگیں گی نالے روویں گی
پاپی تن نوں مل مل دھوویں گی

جے سونویں گی پچھتاویں گی
کرلاویں گی مر جاویں گی

جد اپنا آپ گنواویں گی
موہن نوں اپنے پاویں گی

OOO

سلیم شہزاد

چُپ

چُپ اساڈیاں
ناڑاں وَل کے
جِھ ہلاندی اے
چُپ اساڈیاں
ساہواں کھچ کے
نظم بناندی اے
چُپ اساڈیاں
واجاں بن کے
چوگ چگاندی اے
چُپ اساڈیاں
چیکاں چُگ کے
کھُرڑ پاندی اے
چُپ اسانوں،
چُپ نئیں دیندی
اَکھ وکھاندی اے

OOO

منزہ شاہد

فقیر دی موج

دُکھ پھولاں میری مرضی
نہ پھولاں میری مرضی

وَدھ تولاں میری مرضی
گھٹ بولاں میری مرضی

رَت ڈولاں میری مرضی
جِند رولاں میری مرضی

رس گھولاں میری مرضی
کر چوہلاں میری مرضی

پر تولاں میری مرضی
رب چھوٗلاں میری مرضی

گھُنڈ کھولاں میری مرضی
نہ کھولاں میری مرضی

OOO

احسان رانا

O

اپنی بھر جوانی ویکھی
اوہدی نظرِ ثانی ویکھی
اِکو چُپ اے لکھاں ورگی
ایسے وچ آسانی ویکھی
مچھی پتھر چٹ کے پرتی
ایسی روح سیلانی ویکھی
میں نہیں اُنگل پھڑ کے ٹریا
کوٹھے چڑھ ویرانی ویکھی
دل دا دیوا بل بل بُجھا
فوٹو اک پرانی ویکھی
مکھن دودھ، ملائیاں کتھوں
پانی وچ مدھانی ویکھی
کھدو پھولے پراں نکلن
لڑکی اک دیوانی ویکھی
گل وی اپنے گھر دی کریے
یاراں دی مجمانی ویکھی
ورتے ورتے ہوندی راناؔ
سب نے رام کہانی ویکھی

OOO

سلطان کھاروی

O

کوئی ایسا باوفا ہووے
کہ دِل نوں حوصلہ ہووے
ایہ جیون جاپدا ایویں
جویں کوئی بددُعا ہووے
جدوں میں ویکھنا تینوں
کوئی کیوں ویکھدا ہووے
تُوں رکھیں وَیر سوچیں پر
متے ساڈا خُدا ہووے
کتے دا پندھ کرنا اے
ہوا جے رہنما ہووے
محبت خاک جتھّے وی
دِلاں وچ فاصلہ ہووے
بڑی ہوئی جو ہو گئی اے
نہ مُڑ کے کربلا ہووے
ہُنے اک واج آئی سی
بوہے تے نہ کھڑا ہووے؟
محبت دی قضا کوئی نہ
چلو سجدا قضا ہووے
ایہہ ٹُریا کون رکے جے؟
جویں جاندی صبا ہووے
او مارو واج ساقی نوں
گھٹا دا نہ گھٹا ہووے
اک اوہو ترس کھاندا اے
جدھے اندر خُدا ہووے
کراں سلطاںؔ دے وانگوں
تکبر جے روا ہووے

OOO

آفتاب خان کے تبصرے

سُخنِ آئینہ......مظفر ایرج (انڈیا)

ناشر : براق پبلی کیشنز، بائی پاس سرنگر، انڈیا   صفحات : 276   قیمت : 500روپے

مظفر ایرج سینئر شاعر ہیں اور یہ ان کا چھٹا شعری مجموعہ ہے جس میں نعتیں، مناقب، نظمیں اور غزلیں شامل ہیں اور ہر صنفِ سخن میں انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں شعر گوئی کی ہے۔ مظفر ایرج کا انداز استاذانہ ہے۔ وہ استعارات کے ساتھ کھیلتے ہیں اور انہیں خوبی سے برتتے ہیں۔ اِس کے علاوہ نئے الفاظ اور تراکیب بھی اُن کے ہاں پائی جاتی ہیں جو اُن کی شاعری کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ مروج شعری اقدار اور مضامین پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ نئی دنیاؤں کی کھوج میں لگے رہتے ہیں حتیٰ کہ چاند ستاروں اور کہکشاؤں سے بھی آگے جانے کی جدوجہد میں مصروفِ کار نظر آتے ہیں۔ اس مجموعہ میں نظموں میں وہ بالکل اپنا ایک الگ وژن دکھانے پر آمادہ ہیں۔ اِسی طرح غزل کے اشعار میں سے کسی شعر کا انتخاب کرنا بھی دشوار نظر آتا ہے کہ اُن کی غزل کا ہر شعر انفرادیت سمیٹے ہوئے ہے۔

ے شہر کی بھیڑ سمٹ آئی چوراہے پر   شاید سانپ اُگ آئے دالانوں میں
ے جب بھی دستک کسی کھڑکی پہ ہَوا دیتی ہے   کتنے چہروں سے کھلے رنگ اُڑا دیتی ہے
ے جہاں پہ ختم ہو یہ بحر و بر اُفق پیچاک   وہیں سے آگے خلاؤں کا سلسلہ ہو گا

مظفر ایرج کے اِس شعری مجموعہ کی شاعری جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے اور ہم اسے جدید لب و لہجے کی حامل شاعری قرار دے سکتے ہیں کیونکہ اس میں نہ صرف نیا پن ہے بلکہ کرافٹنگ کے حوالے سے بھی یہ منفرد اُسلوب کی حامل ہے جس کے لیے مظفر ایرج دادو تحسین کے مستحق ہیں۔ اس مجموعے کی پروف ریڈنگ پر تھوڑی سی مزید توجہ دے دی جاتی تو یہ ڈھیر ساری اغلاط سے پاک ہو جاتا۔

....

سینۂ خاک......عامر عبداللہ

ناشر : مثال پبلشرز، فیصل آباد   صفحات : 116   قیمت : 120روپے

اس مجموعۂ کلام میں وہ غزلیں شامل کی گئی ہیں جو 1997ء سے اب تک ماہنامہ ''تخلیق'' میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ عامر عبداللہ کا

شعری جہان اپنا ہی تخلیق کردہ ہے۔ وہ اپنی اختراع کردہ زمینوں میں نئی نئی ردیفوں اور قافیوں کے بیج اُچھال دیتے ہیں جس کے بعد اُگنے والے اشعار اپنا الگ رنگ اور الگ ذائقہ لیے سامنے آتے ہیں۔ عامر عبداللہ اپنی داخلی کیفیات کا سفر طے کرتے ہوئے جب خارجی دُنیا میں داخل ہوتے ہیں تو اس طرح کے اشعار قرطاس کی رونق بڑھاتے ہیں۔

جس لفظ کی اک گونج میں تحلیل ہوئے ہیں ہم لوگ اُسی لفظ سے تشکیل ہوئے ہیں

....

کس نے پرو دیا ہے ہمیں نوکِ خار میں خوشبو سے رسم و راہ بڑھانے سے پیشتر

....

پہلے ہی رگ و پے میں اُداسی تھی کہاں کم ہر سانس میں اُترا جو چراغوں کا دُھواں بھی

....

سکوتِ آب پہ جلتے ہوئے کنول سے بدن کبھی تھے پیشِ نظر اور اب ہے ریت بجھی

....

تھے تو بھیگا ہوا سا عکس مگر ہاں، پسِ چشم نم نہیں تھے ہم

''سینۂ چاک'' کے بارے میں ڈاکٹر ناصر عباس نیر کہتے ہیں کہ ''عامر عبداللہ محض واقعہ نہیں لکھتے۔ واقعہ کی منطق کو بھی اِس طور پیش کرتے ہیں کہ وہ نری منطق نہیں رہ جاتی، واقعہ کے ساتھ اُس کا رشتہ گوشت اور ناخن کا سا ہو جاتا ہے۔'' یقیناً عامر عبداللہ اِس کائنات کو اپنے ہی تناظر میں دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں اور اپنی پہچان الگ انداز میں کرواتے ہیں۔

....

سامان دِل کا......رفیق ارم

ناشر : مثال پبلشرز، فیصل آباد **صفحات :** 144 **قیمت :** 250 روپے

مجھے رفیق اِرم کا کلام ایک عرصے سے مختلف جریدوں میں پڑھنے کا موقع مل رہا ہے۔ انہیں شاعری سے لَو لگائے ہوئے تقریباً چالیس برس گزر گئے ہیں اور اب اُن کا یہ پہلا شعری مجموعہ ''سامان دِل کا'' منظرِ عام پر آیا ہے۔ آج کے نوجوانوں کی طرح نہیں کہ اِدھر شعر کہنے کا آغاز کیا اُدھر اگلے ہی ماہ شعری مجموعہ لے آئے جو کسی کوڑا دان میں پھینکنے کے لائق ہوتا ہے مگر رفیق ارم جیسے حقیقی شاعر جلد بازی کا شکار نہیں ہوتے اِس لیے انہوں نے اپنی عمر بھر کی ریاضت چالیس سال کے بعد یکجا کی ہے اور یقیناً اس میں اُن کی منتخب غزلیں شامل ہیں۔ زیرِ نظر مجموعۂ کلام صرف غزلوں پر مشتمل ہے۔ رفیق اِرم بھی اپنے جذبات محبت کے خمیر میں گوندھ کر نرم و نازک اشعار کی بنیاد رکھتے ہیں۔ ذرا دیکھیں :

یہ روز روز کا مرنا مجھے قبول نہیں جو تم مِلو تو مَیں غم کے مدار سے نکلوں

....

ایسا حسیں، اِتنا حسیں، دیکھا نہیں، ہوتا نہیں صندل کا جیسے تن بدن، مخمور اکھیاں ہو بہ ہو

....

تمہارے ہونٹ مِل کر رو رہے تھے ہماری آنکھ بھر آنے سے پہلے

رفیق ارم کی غزل کلاسیکیت اور جدیدیت کے سنگم پر کھڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ جب وہ عشق و محبت کے جھمیلوں سے بیزار ہوتے ہیں تو اُنہیں انسانی رویے اور گردشِ دوراں کے عطا کردہ رنج و الم ستانے لگتے ہیں اور پھر وہ اِس طرح کے اشعار کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں :

اے مری چاک گریبانی پہ ہنسنے والو! تم نے دیکھے ہی نہیں گردشِ ایام کے پھول

....

زخم گریاں، آنکھ پُرنم ہے، غزل کیسے کہوں چار سُو وحشت کا عالم ہے غزل کیسے کہوں

....

ابھی موسم نہیں بدلا......شاہین زیدی

ناشر : علم و عرفان پبلشرز، لاہور **صفحات :** 112 **قیمت :** 300 روپے

شاہین زیدی بنیادی طور پر ناول و افسانہ نگار ہیں۔ شاعرہ کی حیثیت سے وہ کچھ عرصہ قبل ہی منظرِ عام پر آئی ہیں اور حیرت ہے کہ انہوں نے اتنی جلدی شعری مجموعہ بھی شائع کروالیا۔ شاہین زیدی طویل عرصہ سے لکھ رہی ہیں اور ایک رسالے کی مدیر بھی ہیں۔ اِس لیے اُن پر یہ اعتراض لاگو نہیں ہوتا کہ وہ راتوں رات شہرت حاصل کرنے کے لیے شاعرہ بنی ہیں بلکہ یہ شاعری بہت پہلے سے کہیں اُن کے اندر پھوٹ رہی تھی جسے پروان چڑھنے میں اتنا عرصہ لگ گیا ہے اور اب انہوں نے اسے مکمل کر کے کتابی شکل دے دی ہے۔ اُن کا بنیادی موضوع محبت ہے۔ وہ اپنے محبوب کی محبت میں سرشار رہی ہیں اور جب جدائی کا مرحلہ آیا تو اُن کی چیخ شعروں میں ڈھل گئی۔ یقیناً اِن شعروں میں وہ اپنے محبوب شوہر سے مخاطب ہیں جو چند برس قبل دُنیائے فانی سے کوچ کر گئے تھے۔ چند اشعار ملاحظہ کریں :

ہر فرد ہمیں جانتا ہے اب تو جہاں میں یوں تیرے لیے عشق میں بدنام ہوئے ہیں

....

ایک پَل بھی لگے ہیں سال مجھے جانے کِس کا ہے اب خیال مجھے

....

مسعود! آج تک یہ سمجھ میں نہ آ سکا تم میرا دل تھے یا مرے دل کی اُمنگ تھے

....

دُنیا ہے سبھی میری محبت کے طلبگار اِک میں ہوں کہ اُس شخص پہ مرتی بھی بہت ہوں

عشق و محبت اور ہجر و وصال کی شاعری کے ساتھ ساتھ انہوں نے غمِ دنیا کے درد و آلام کا بھی ذکر کیا ہے اور دُنیا کی بے ثباتی کا احساس دلایا ہے۔ غزلوں اور نظموں کے اس جھرمٹ میں شاہین زیدی نے اپنے بیٹے تابش کے لیے جو نظمیں لکھی ہیں وہ بے مثال ہیں۔ اِن نظموں میں ایک ماں نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہے۔ شاہین زیدی کو شعری ایوان میں قدم رکھنے پر مبارک باد اِس اُمید کے ساتھ کہ وہ مستقبل میں اِس سے بھی کئی گنا بہتر شاعری کر کے اپنا آپ منوائیں گی۔

ہَوا پتّے گرائے گی......گلزار بخاری

ناشر : امیر پبلی کیشنز، لاہور صفحات : 208 قیمت : 300روپے

گلزار بخاری ایک منجھے ہوئے قادرالکلام شاعر ہیں۔ وہ جب ترنم سے غزل سُناتے ہیں تو مشاعرہ لوٹ لیتے ہیں۔ لاہور کے علاوہ انہیں دیگر شہروں میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں خصوصی طور پر مدعو کیا جاتا ہے۔ 45 سال کی ریاضت کے بعد اب اُن کا یہ پہلا مجموعہ کلام اشاعت پذیر ہوا ہے جبکہ اُن کے بقول ابھی مزید چار پانچ مجموعوں کا کلام موجود ہے جو رفتہ رفتہ کتابی شکل کا روپ دھارے لے گا۔ زیرِ نظر مجموعہ غزلوں اور نظموں پر مشتمل ہے جو پڑھنے والے کو نئے امکانات اور نئے خیالات کی سرزمینوں کی سیر کرواتا دکھائی دیتا ہے۔ گلزار بخاری کا اندازِ سخن تمام ہم عصر شعراء سے یکسر جداگانہ ہے۔ وہ عام سے خیال کو اِس طرح شعری پیکر عطا کرتے ہیں کہ وہ خیال عام سے خاص بن جاتا ہے اور بالکل مختلف منظر دکھانے کا کام کرتا ہے۔ وہ بڑی سہولت سے شعر کہہ کر سامع کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ ذرا اُن کے چند اشعار دیکھیے :

شجر بے دست و پا ہیں ابتلا کو کون روکے گا ہَوا پتے گرائے گی ہَوا کو کون روکے گا

....

سو ہم نے پتھروں سے بات کی شیشے کے لہجے میں ہمیں معلوم تھا، شورِ فغاں سے کچھ نہیں ہوتا

....

چمک چراغ کی فانوس نے بڑھا دی ہے جمال اور نمایاں ہوا حجاب کے بعد

....

سہمی ہوئی اک فاختہ کو جب سے اماں دی رُخ کتنے عقابوں کا مرے گھر کی طرف ہے

گلزار بخاری داخلی کرب کو خارجی کرب سے اِس طرح ہم آہنگ کرتے ہیں کہ وہ آفاقی سوچ سے ہمکنار ہو جاتا ہے اور پھر وہ شعر اُن کی کتاب تک محدود نہیں رہتا بلکہ لامحدود حیثیت اختیار کرتے ہوئے اطرافِ عالم میں پھیلتا چلا جاتا ہے۔ اِس مجموعے کے بیشتر اشعار نئے امکانات اور نئے طرزِ اظہار کے ضامن ہیں۔ یہ اشعار دیکھیے :

لاکھ مبذول کرو ذہن خطر کی جانب آدمی جائے گا ممنوعہ شجر کی جانب

....

اِس میں کسی کی جان گئی ہے تو کیا تمہیں تم نے تو آزما لیا خنجر کی دھار کو

....

دیمک نے کر دیا تھا انہیں کھوکھلا بہت چھیڑا ذرا ہَوا نے تو اشجار گر پڑے

گلزار بخاری کا یہ پہلا شعری مجموعہ اہلِ علم وادب کے لیے ایک سوغات ہے۔ نئی نسل اِسے پڑھ کر اپنی شاعری میں نکھار پیدا کر سکتی ہے۔

....

''اَن کہی سوچیں''......مقصودہ حسین

ملنے کا پتا : J-78 بلاک، ماڈل ٹاؤن، لاہور　　صفحات : 168　　قیمت : 300روپے

مقصودہ حسین کو ایک عرصہ سے ''تخلیق'' میں پڑھ رہا ہوں۔ ''ان کہی سوچیں'' مقصودہ حسین کی اپنی داخلی کیفیات کی آئینہ دار شاعری پر مشتمل ہے۔ انہوں نے اپنی ذات اور کائنات کے بکھرے ہوئے مظاہر کا مشاہدہ اور تجزیہ گہرے غور وفکر سے کرنے کے بعد انہیں شعروں کی شکل میں ڈھالا ہے۔ رشتوں کے حوالے سے اُن کی نظمیں ممتاز، میرا گھر، رابعہ خان کی یاد میں، میرے عیسیٰ، عورت کے دو روپ، بچپن، ماں کی دعا، میری گڑیا کو سلامت رکھنا وغیرہ کافی دل گداز اور شفقت بھرے جذبات سے لبریز ہیں اور عجیب سی سرخوشی یا کرب طاری کر دیتی ہیں۔ اسی طرح اُن کی دیگر موضوعات کی نظمیں ایٹمی دھماکہ، راول کوٹ، رات سمندر چاند اور میں، اے شہر کے لوگو، ایک وعدہ، ساتھی، وادیٔ ایبٹ آباد، تم ملے دنیا ملی، اُداس کیوں ہو وغیرہ وغیرہ اپنے اندر گہرے احساسات ومحسوسات سمیٹے ہوئے ہیں اور پڑھنے والے پر ایک سرشاری کی کیفیت حاوی ہو جاتی ہے۔ بلاشبہ یہ نظمیں اپنے خیالات کی بلندی کے باعث مطالعے کا لطف دوبالا کرتی ہیں۔

''ان کہی سوچیں'' کی غزلیں بھی قاری کو جھومنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ انہوں نے بہت اچھے اچھے اشعار نکالے ہیں جن میں روایتی موضوع کے باوجود نیا پن اور ہنرمندی صاف دکھائی دیتی ہے۔

اک نیا خواب دکھاتی ہیں تمہاری آنکھیں　　سرمئی شام کے جادو کو بڑھا دیتی ہیں

....

ادراک کب ہوا ہمیں؟ وہ جب بدل گئے　　تنہا ہے ہر بشر یہاں ہمراہ کچھ نہیں

....

گزر ہی گیا اُن کو پانے کا موسم　　مَیں دستِ طلب کو اُٹھا بھی نہ پائی

....

مَیں یہ سمجھی بُلا رہے ہیں وہ　　یوں ہی دیکھا تھا آنکھ اُٹھا کے مجھے

یہ شعری مجموعہ ایک عورت کے خیالات وجذبات کا عکاس ہے۔

....

''فخرِ دو عالم''......رشید آفرین

پبلشر : الحمد پبلی کیشنز، انارکلی، لاہور　　صفحات : 240　　قیمت : 400روپے

نعت گوئی اگرچہ ایک بہت بڑی سعادت ہے لیکن یہ تلوار کی دھار سے بھی زیادہ تیز اور مشکل صنف ہے کہ ذرا سی بھی اونچ نیچ ہو گئی تو شرک کے مرتکب پا سکتے ہیں۔ رشید آفرین ایک عرصہ سے غزل گوئی کر رہے ہیں۔ یہ اُن کا پہلا مکمل نعتیہ مجموعہ ہے جس میں محامد،

منقبت اور سلام بھی شامل ہیں۔اس مجموعے کی بہت ساری نعتیں ''روضۂ رسولؐ پر حاضری کے دوران لکھی گئی ہیں جو اپنی ایک الگ ہی کیفیت رکھتی ہیں اور انہیں پڑھ کر لکھنے والے کی سعادت پر رشک آتا ہے۔ان کی نعت کے چند اشعار دیکھیں :

جس کے ہونٹوں سے پھول جھڑتے ہیں　　اُس کی میٹھی زباں کی بات کریں

....

تخت و تاج و حشم اس سے لرزاں رہے　　جگ میں بے مثل ہے بوریا آپؐ کا

....

اِس کو بنا دیا ہے زیارت گہِ جہاں　　خُلدِ بریں بنا ہے مدینہ حضورؐ کا

رشید آفریں نے عقیدت میں ڈوب کر جو محبت اور عشق کے پھول نچھاور کیے ہیں اُن کی مہک سارے عالم میں پھیلے گی اور فخرِ دو عالم بھی اس ثناخوانی پر حشر میں نظرِ کرم فرمائیں گے۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اُن کے اہلِ بیت اور نواسوں نواسیوں سے محبت بھی ہمارے ایمان کے حصہ ہے۔رشید آفرین کے سلام کے چند شعر پیش ہیں :

چار سُو ہیں امامؓ کی باتیں　　سبطِ خیرالانامؐ کی باتیں

....

کلاہِ فخر عالم کا جو رنگیں ہے لہو　　وہی شہادت کی عظمت کا بھی امیں ہے لہو

....

''بحرِ تجلیات'' ...... ریاض ندیم نیازی

ناشر : ماورا پبلشرز، لاہور　**صفحات :** 352　**قیمت :** 700 روپے

ریاض ندیم نیازی نے مجھے گزشتہ سال کے آخری ماہ میں یہ کتاب ارسال کی تھی اور مَیں نے یہ پڑھ کر اور چوم کر رکھ دی تھی۔ ارادہ تھا کہ کچھ لکھوں گا۔اب سونان اظہر بھائی کی طرف سے کتاب ملی تو مجھے پھر ایک بار اس کی تلاوت کا شرف دوبارہ حاصل ہوا اور ندامت ہوئی کہ اس کتاب پر اپنی عقیدت کا اظہار پہلے کیوں نہ کیا۔ریاض ندیم نیازی پوری طرح عشقِ رسولؐ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔اس لیے اُن کی نعت میں یہ عکس بھرپور طریقے سے جلوہ گر دکھائی دیتا ہے۔وہ نعت کے بنیادی ماخذ اور استعارات وتشبیہات سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔ اس لیے اُن کے لیے نعت کہنا بہت آسان مرحلہ ہے جسے وہ خوبی سے نبھاتے ہیں۔چند اشعار ملاحظہ کیجیے :

پڑھتے ہیں صرف نعت وہ کچھ مانگتے نہیں　　دیکھے ہیں ہم نے ایسے بھی سائل گلی گلی

....

یہ تصور، یہ تمنا، یہ مرا ارمان ہے　　ایک دن میری زیارت گاہ ہو غارِ حرا

یہ نعتیہ مجموعہ ریاض ندیم نیازی کا اہم دنیاوی حوالہ اور آخرت کا اثاثہ ہے۔مجھے اُمید ہے اُن کا حمد یہ و نعتیہ مجموعہ آنکھوں سے نہیں دل سے پڑھا جائے گا۔

◆◆◆

انجمنِ خیال (خطوط)

﴿1﴾ محترمی سونان اظہر جاوید!

میرا خیال تھا کہ اظہر جاوید کی دوسری برسی کی تقریب کے بعد ''تخلیق تحسین ایوارڈ'' کا غلغلہ ختم ہو جائے گا لیکن مارچ 2014ء کے شمارے کے سرورق کو تصویروں سے سجا کر اور اندرونی صفحات پر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صاحب کا مضمون شائع کر کے آپ نے اور خواجہ صاحب نے ایک خاک نشین کو عرش مقام کر دیا ہے۔ یہ بے بضاعت اب آزاد انصاری کو یاد کر رہا ہے جس نے یہ شعر ایسے مواقع پر پیش کرنے کے لیے ہی لکھا تھا۔

تجھے آزاد گر کوئی کسی قابل سمجھتا ہے — تو ان کا حسنِ ظن ہے، ورنہ من آنم کہ من دانم

اور میں ہمیشہ گزارش کرتا ہوں کہ

انور سدید عام سا بندہ ہے اس کے ساتھ — مٹی پہ بیٹھ، دھول میں اٹ کر کلام کر

86ویں برس میں قدم رکھا تو یہ احساس غالب ہے کہ

اب اپنے زبوں جسم کی کچھ فکر نہیں مجھ کو — آٹھ عشروں میں دنیا کے سب ذائقے ہیں چکھے

آفاتِ زمانہ کی یورش ہے، مگر انور — ہر حال میں خوش ہوں میں، جس حال میں رب رکھے

مجھے اظہر جاوید کی رحلت کا شدید صدمہ ہے لیکن جس ناگہانی انداز میں انہوں نے موت کا خیر مقدم کیا وہ انداز پیغمبرانہ ہے اور خوش قسمت لوگوں کو نصیب ہوتا ہے کہ بھرے میلے کو اپنی مرضی سے چھوڑ کر دنیا سے اُٹھ جاتے ہیں۔ میں بھی ایسی ہی موت کی آرزو کرتا ہوں اور ''تخلیق'' کے قارئین سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے آخری وقت کی آسانی کے لیے دعا فرمائیں۔ میں آپ کا اور خواجہ محمد زکریا صاحب کا ممنونِ احسان ہوں کہ آپ نے میرے معمولی کام کو غیر معمولی اہمیت دی اور اسے ''نقشِ عالم'' بنانے کی سعی فرمائی۔ یہ رتبۂ بلند شاید میری استعداد سے زیادہ بلکہ بہت زیادہ ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ادب کا مطالعہ اور تخلیق و تنقید میری تلاشِ حق اور جستجوئے صداقت کا روحانی زاویہ ہے۔ میں نے اس کے ساتھ کسی ایوارڈ کا حصول اور دنیاوی مقصد کو کبھی وابستہ نہیں کیا اور ''زبانِ خلق'' جس انداز میں بھی اظہار کر رہی ہے اسے روک بھی نہیں سکتا۔ محمد انوار الدین کا ہمزاد انور سدید خود سے آگاہ نہیں تھا۔ یہ حیرت انگیز آگہی آپ کی عطا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ ''تخلیق'' کی اشاعت کا سلسلہ دراز کرے۔ آپ کی ہمتوں کو جوان رکھے اور ''تخلیق'' کی زندگی کے لیے وسائل دستیاب رکھے۔

اور درویش کی دعا کیا ہے؟

انور سدید (لاہور)

....

﴿2﴾ عزیز و مکرم سونان صاحب!

مارچ 2014ء کا تخلیق ملا۔ کم و بیش سارا پرچہ پڑھ چکا ہوں۔ پرچے میں حمد و نعت کا اضافہ بہت اچھا لگا۔ نورین طلعت عروبہ کا نعت سے حمد کی طرف آنا بھی باعثِ صد تحسین ہے۔ اس کی تازہ حمد کا یہ شعر دیکھیے ؎

''ایک ڈوری ہو ثنا کی جو تجھے بھا جائے گوندھ کے لاؤں میں اس میں ترے معیار کے پھول''

پرچے کے دیگر مندرجات میں بھی نکھار آتا جا رہا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کی محنت رنگ لا رہی ہے۔ افسانوں میں بشریٰ رحمٰن، سلمیٰ اعوان اور آغا گل کے افسانے زیادہ اچھے لگے۔ بشریٰ رحمٰن، بشری فطرت کی کچھ پرتیں کھولتی رہتی ہیں اس بار بھی ''گیسو'' میں ایسا ہی ہوا ہے۔ ایسے افسانوں میں تخلیق کار کہیں کہیں خود بھی منکشف ہونے لگتا ہے مگر نہیں ہوتا۔ قرۃ العین حیدر کے ہاں بھی کئی بار ایسا ہوا ہے۔ سلمیٰ اعوان کا افسانہ ''No'' اپنے اندر کئی جہتوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ سلمیٰ یوں بھی ہمارے عہد کی بہت باشعور افسانہ نگار ہیں۔ اُن کے افسانوں میں روانی بھی ہوتی ہے اور گہرا مشاہدہ بھی۔ مقصد کی دیانت ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ میں نے اکثر محسوس کیا ہے کہ جتنا سیاسی شعور ان کے افسانوں میں ملتا ہے۔ اتنا کسی اور افسانہ نگار کے ہاں نہیں پایا جاتا۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جس کا شرح صدر کے ساتھ اعتراف کرنا چاہیے۔ روس، عراق اور فلسطین کے سیاسی پس منظر میں اُن کا مشاہدہ اور مطالعہ بہت وسیع ہے۔ آغا گل بھی ہمارے اچھے افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ انھوں نے اپنے محکمے (ڈاک) اور بلوچستان کی بود و باش پر بڑے انوکھے افسانے لکھے ہیں۔ مگر اس بار ''مسیت ناں پاٹ'' کے عنوان سے اُنھوں نے اپنے معمول سے ہٹ کر ایک ''رومانوی انقلاب'' کی حامل کہانی لکھی ہے۔ میں آج سے ساٹھ باسٹھ سال پہلے دلّی کے ایک ادبی پرچے میں اسی موضوع پر ایک افسانہ پڑھ چکا ہوں۔ اُس میں بھی ایک انقلابی نوجوان ایک طوائف کے گھر میں پناہ لیتا ہے اور پھر پولیس کے ہاتھوں وہ طوائف بھی ایسی ہی اذیت سے گزرتی ہے، اسے سرقہ یا توارد ہرگز نہ سمجھا جائے۔ زندگی میں ایسے مماثل واقعات ہوتے رہتے ہیں مگر اب اس موضوع میں کوئی کشش باقی نہیں رہی۔

حصہ نظم میں جب بھی شاہین صاحب (کینیڈا والے) کو پڑھتا ہوں تو مجھے اُن کی صورت میں اپنا بہت پرانا قاری یاد آ جاتا ہے جو دلّی کے دوماہی مجلّے ''شاہراہ'' کا خریدار ہے اور یوپی میں اپنے قصبے سے شہر آ کر باقاعدگی سے ''شاہراہ'' خرید کر لے جاتا ہے اور پھر اُس میں چھپنے والے شاعروں اور ادیبوں کو یاد رکھتا ہے۔ یہ 1950/49ء کی بات ہے کہ دلّی سے انجمن ترقی پسند مصنفین کا ترجمان مجلّہ ''شاہراہ'' شائع ہوتا تھا اور میں اس میں بہ کثرت چھپتا تھا۔ شاہین صاحب نے اس کا حوالہ دے کر ''تخلیق'' کے شمارہ دسمبر 2011ء میں لکھا تھا کہ اُس عہد کے ایک ادیب امین راحت چغتائی کو آپ کے شمارے میں دیکھ کر کتنی ہی یادیں تازہ ہو گئیں۔ جس کا جواب میں نے اظہر جاوید مرحوم کے زیرِ ادارت چھپنے والے آخری ''تخلیق'' (فروری 2012ء) میں دے دیا تھا۔ جانے شاہین صاحب کی نظر سے گزرا یا نہیں۔ بہر حال میں اب اُن کی نظم ''تخلیق'' میں پڑھتا ہوں تو خوشی ہوتی ہے۔ اللہ انھیں خوش رکھے۔

پروین شیر (کینیڈا) ماشاء اللہ اچھی نظم کہتی ہیں۔ مگر اُن کا نام دیکھتے ہی مجھے اُن کی مصوری کے چند فن پارے یاد آ جاتے ہیں جو میں نے ایک اور پرچے میں دیکھے تھے۔ وہ بہت پر اعتماد مصوّرہ بھی ہیں اور وسیع کینوس کا استعمال جانتی ہیں۔ اور ایسے شگفتہ رنگوں سے فن پارے کو آراستہ کرتی ہیں کہ تصویر بھی ایک نظم محسوس ہونے لگتی ہے۔ اللہ اُن کے قلم اور مو قلم کا زور اور زیادہ کرے۔

آخر میں دشال کھلر کی ایک فکر انگیز نظم ''آتش فشاں'' کی داد نہ دوں تو میں ''کافر''! اُنھوں نے محبت کی گھلاوٹ کو ایسے رواں مگر ''کافرانہ انداز'' میں پیش کیا ہے کہ ''مکرر ارشاد'' کہنے کو جی چاہتا ہے۔

.... **امین راحت چغتائی (اسلام آباد)**

﴿3﴾ برادرم سونان اظہر جاوید!

ماہنامہ ''تخلیق'' کا شمارہ ملا۔شکریہ! ویسے تو ہر شمارہ پہلے سے بہتر ہوتا ہے لیکن اس مرتبہ ابتدا میں حمد و نعت، اظہر جاوید صاحب کی دوسری برسی اور ''تخلیق'' تحسین ایوارڈ شامل ہیں اور یہ اس کی انفرادیت کو نشان زد کرتے ہیں۔ واہ واہ! اس پر مستزاد یہ ہے کہ ''فیض احمد فیض'' کا گوشہ بھی شامل ہے۔ افسانے سب ہی اچھے ہیں مثلاً بشریٰ رحمٰن سلمیٰ اعوان ڈاکٹر صغریٰ صدف شامل ہیں غزلیں بھی اسی اعتبار سے اچھی اور شاندار ہیں۔ شورش کاشمیری کا اسلوب بہت عمدہ مضمون ہے، اگر چہ ڈاکٹر انور سدید صاحب نے مختصر لکھا ہے مگر یہ کامیاب اور عمدہ ہے۔ اسی انداز سے باقی مضامین بھی تحسین کے مستحق ہیں۔ طنز و مزاح میں ڈاکٹر معین قریشی اور اعتبار ساجد کے مضامین قابل صد تعریف ہیں۔ مجموعی طور پر ماہنامہ ''تخلیق'' اپنے عروج کی طرف جا رہا ہے۔ اللہ مبارک کرے اور جس طرح اظہر جاوید نے ماہنامہ ''تخلیق'' کو نامسائد حالات میں جاری رکھا مجھے یقین ہے کہ آپ بھی اسی طرح جاری رکھیں گے۔

.... **سلطان رشک مدیر ماہنامہ ''نیرنگ خیال'' (راولپنڈی)**

﴿4﴾ مکرم سونان اظہر جاوید!

'تخلیق' کا شمارہ مارچ 2014ء اپنے خوبصورت سرورق کے ساتھ نظر نواز ہوا جس پر ڈاکٹر انور سدید جیسی قد آور ادبی شخصیت کے ساتھ تین اور ادبی لیجنڈز (فیض، اظہر جاوید اور شفیع عقیل) کی تصاویر بھی ہیں، اب جن کے دیکھنے کو اکھیاں ترستی ہیں اور یہ ادار یہ میں مزید دو من موہنی شخصیتوں کی وفات کی دُکھ بھری خبر بھی ہے۔ ان کا ذکر پڑھ کر ان کا غم تازہ ہو گیا، یعنی زمان کنجاہی اور جناب عزیز میرٹھی۔ عزیز میرٹھی کی آپ بیتی کی زیر نظر شمارے میں تیسری قسط ہی شاید آخری ہوگی اور اب ایسی ادبی چاشنی والی تحریر پھر پڑھنے کو نہ ملے گی۔

تخلیق تحسین ایوارڈ 2013ء کے حوالے سے ڈاکٹر انور سدید پر لکھا ہوا ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا مضمون بڑا معلوماتی ہے۔ انہوں نے احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر وزیر آغا گروپ کے درمیان اختلافات کے سبب جو کچھ ڈاکٹر انور سدید نے اپنے طور پر یا ردِ عمل کے طور پر لکھا ہے اس کا ذکر کر کے ادبی دیانت کا ثبوت دیا ہے۔ کاش ہماری ادبی تاریخ میں ان دونوں گروپس کی جانب سے ایک دوسرے کے خلاف وہ کچھ نہ کہا اور لکھا جاتا! اس چپقلش کا ایک نقصان اُن بہت سے ادیبوں کو بھی ہوا جو غیر جانبداری سے صرف ادب کی خدمت کرنے کے قائل تھے مگر ''فنون'' میں شائع ہونے پر ان پر قاسمی گروپ سے، اور اوراق میں شائع ہونے پر ان پر وزیر آغا گروپ کا حصہ ہونے کا لیبل لگ گیا، اور یوں اس مسموم ادبی ماحول میں ان کی سرگرمیوں کو زبردستی محدود کر دیا گیا۔

افسانوں میں پہلا ہی افسانہ 'گیسو' محترمہ بشریٰ رحمٰن کی خوبیِ تحریر کا ثبوت ہے۔ عورت کے لئے محبت زندگی اور موت کا مسئلہ ہوتی ہے اور یہی اس افسانے کی مرکزی کردار نرگس کا مسئلہ ہے، جسے لمبے بالوں کی وجہ سے اس کا شوہر گیسو کہتا تھا، اس نے شوہر کی بیوفائی پر اپنی

جان دی۔ محبت کا نقش زندہ رکھا۔اس موضوع پر سینکڑوں بلکہ ہزاروں افسانے لکھے جا چکے ہیں اور اس میں کوئی نئی بات نہیں ہے چنانچہ اگر یہ افسانہ اتنا خوبصورت ہے تو صرف اپنے اندازِ بیان کی وجہ سے۔ دوسرا قابلِ ذکر ڈاکٹر صغریٰ صدف کا افسانہ 'کھڑکی' ہے جس میں بظاہر ایک کھڑکی میں کھڑے آدمی کو اُس کی محبوبہ باہر بلا رہی ہے جبکہ درحقیقت اُس نے کھڑکی سے کود کر خودکشی کی ہے۔ یہ افسانہ ایک شخص کی سچی محبت کی تلاش اور خواب کی عکاسی پر مبنی ہے۔ 'مسیت ناں پاٹ' میں منفرد افسانہ نگار آغا گل نے اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کیا ہے، اور ایسے ایسے پھڑکتے ہوئے جملے لکھے ہیں کہ جتنی داد دی جائے کم ہے۔ مثلاً ''محبت کرتے مرد مینڈک سا آسن اختیار کر لیتے ہیں۔'' ''سوائے زبان کے ان طوائفوں کو سب کچھ کھولنے کی اجازت تھی''۔ افسانے کا آخری جملہ قاری کو ایک زور کا جھٹکا لگاتا ہے'' کیونکہ تم بالی کے وہی بھائی ہو جس سے ملنے کے لئے وہ عمر بھر تڑپتی رہی''۔ اس افسانے میں ہندوستان کی تقسیم اور دو قومی نظریہ کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے شاید، مجھ سمیت، بہت سے لوگ متفق نہ ہوں۔ پاکستان کے بارے میں ایسا بہت کچھ آغا جی اپنی دوسری تحریروں میں بھی لکھتے رہتے ہیں، ظاہر ہے لکھنے پر پابندی تو نہیں لگائی جا سکتی لیکن احتیاط ضروری ہے۔ ابدال بیلا نے سفرنامہ 'سورج کے رخ کی تیسری قسط' پڑھی تو محسوس ہوا کہ بہت اچھے الفاظ میں اسلام آباد سے فرینکفرٹ تک سفر کا ذکر ہے لیکن سفرنامہ نگار کے ساتھ ہم بھی ابھی تک ہوائی جہاز میں ہیں۔ پھر جب انجمنِ خیال میں ڈاکٹر انور سدید کا اس پر تبصرہ پڑھا کہ جس تفصیل سے ابدال بیلا سفر کی جزئیات بیان کر رہے ہیں اس سے اصل واقعاتی حصہ شاید بائیسویں صدی میں پڑھنے کو ملے گا، تو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ منظومات میں مجموعی طور پر ظفر اقبال، محمود شام، کنول فیروز، سہیل غازی پوری، سلیمان خمار، ناصر علی سید اور وقاص عزیز کی غزلیں اچھی لگیں۔ جناب ناصر زیدی کی غزل میں گلہائے عشق، سخن ہائے عشق جیسی خوبصورت تراکیب استعمال ہوئی ہیں لیکن 'ہے' کی ردیف کے ساتھ انہیں صیغہ واحد کے طور پر برتا گیا ہے جبکہ معنوی طور پر ان تراکیب کے ساتھ ''ہیں'' لگتا ہے، لیکن بہرحال 'اس دورِ کم نظر میں وہ بابائے عشق ہے' اس لئے مستند ہے ان کا فرمایا ہوا۔ جناب ابصار عبدالعلی کی غزل میں لفظ 'جاویداں' اور وقاص عزیز کی غزل میں لفظ 'جاویدانی' اگرچہ درست ہیں مگر بہتر ہوتا اگر اشعار کو وزن میں رکھنے کے لئے انہیں علی الترتیب جاوداں اور جاودانی لکھا جاتا کیونکہ ان الفاظ کو دونوں طرح سے لکھا جا سکتا ہے۔ جناب زہیر کنجاہی کی غزل کا چھٹا شعر اور مقطع نظرِ ثانی چاہتے ہیں جبکہ ایک شعر انہوں نے غیر ملکی بینکوں کے لئے 'غیر بینکوں' کی ترکیب استعمال کی ہے۔ آصفہ نشاط کی غزل کا یہ مصرع بھی محلِ نظر ہے: ''نجانے کیوں میں جب آئینہ دیکھوں تو خدا جانے''۔ اسی طرح 'کہ آنکھیں بند ہوتے ہی وہی رشتہ نہیں ہوتا'' میں ہی اور وہی میں تکرار نہیں ہونی چاہئے۔ بُرا مت مانئے گا، میرے خیال میں بطور مدیر آپ کو منظومات کے بارے میں زیادہ محتاط ہونا چاہئے۔

اظہر جاوید کی دوسری برسی پر جو تقریب لاہور میں منعقد ہوئی اس کا احوال شاہد بخاری کے قلم سے عمدہ انداز میں بیان ہوا۔ زیر نظر شمارے میں مزید ایسی تقریبات کا ذکر بھی ہے جو لاہور اور کیلی فورنیا میں ہوئیں، ساتھ ہی دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ادارہ 'تخلیق' رسالے کی اشاعت کے علاوہ بھی بھرپور انداز میں ادبی سرگرمیوں کے انعقاد میں فعال ہے، نارنگ ساقی اور کیول دھیر کے اعزاز میں لاہور میں ہونے والی تقریب، اور پھر تاشی ظہیر کے نام ایک شام اس کی منہ بولتی مثال ہیں۔ اظہر جاوید کی دوسری برسی کی مناسبت سے گوشہ اظہر جاوید بھی دوستوں کی محبت اور اس بات کا ثبوت ہے کہ اظہر جاوید آج بھی اپنی محبتوں سمیت دلوں میں زندہ ہے۔

نسیمِ سحر (راولپنڈی)

....

﴿5﴾ محترمی سونان اظہر جاوید!

ڈاکٹر انور سدید پر ڈاکٹر کا خواجہ محمد زکریا نے بہت معلوماتی مضمون لکھا ہے جناب شفیع عقیل کو اللہ جنت نصیب کرے آمین! بشریٰ رحمٰن کا افسانہ ''گیسو'' اور صغریٰ صدف کا افسانہ ''کھڑکی'' خوب دل لگا کر پڑھے۔ غزلوں کے کچھ شعر پسند آئے جو حسبِ ذیل ہیں۔

رہو گے بر سرِ پیکار کب تک — یہاں تو ہر قدم پر کربلا ہے
ریاض ندیم نیازی

مجھے دشمن سے کوئی ڈر نہیں ہے — ہمیشہ دوست سے ڈرتا رہا ہوں
وصی احمد مکراتی

ہر روح پہ اک بوجھ ہے لمحاتِ گراں کا — ہر ذہن کسی سوچ میں الجھا سا لگے ہے
محمد نصیر ہمایوں

زندہ رہنا ہے دوسروں کے لئے — ایسے جینے کی بات ہے کچھ اور
سہیل غازی پوری

ہر بے بصر کے سامنے دستِ طلب نہ کر — اُس سے مراد مانگ جو مولائے عشق ہے
ناصر زیدی

محترم ڈاکٹر انور سدید نے ''شورش کاشمیری کا اسلوب'' خوب واضح کیا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید جس موضوع پہ بھی قلم اٹھاتے ہیں کامیاب رہتے ہیں۔ اب رہی بات ''عاشقِ صبر طلب'' کی تو ڈاکٹر رشید امجد ایسا بیباک اور نڈر رائٹر بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ (''انجمنِ خیال'' خوب سجی ہے)

.... **پروفیسر زہیر کنجاہی (راولپنڈی)**

﴿6﴾ سونان میاں!

لمبے عرصے کے بعد ''تخلیق'' دستیاب ہوا، شکریہ! امید ہے والدِ بزرگوار کی یادوں سے پیوستہ یہ گلدستہ 'ادب' آپ خوب سنواریں گے!! یہ عشق ایسا آسان بھی نہیں۔ اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے...... ہماری دعائیں آپ کی کاوشوں کے ہمراہ رہیں گی، انشاء اللہ!

.... **جاوید اختر زیدی (امریکا)**

﴿7﴾ عزیزم سونان اظہر جاوید!

آپ پر ربِّ قدوس کی رحمت بے کنار ہو۔ تازہ تخلیق نظر نواز ہوا۔ ماشاءاللہ آپ میرے دوست اظہر جاوید کے رسالے کو جاری رکھ کر ایک بڑا کارنامہ انجام دے رہے ہیں۔ اظہر جاوید کی دوسری برسی پر شاہد بخاری کا مضمون قابلِ داد ہے۔ ڈاکٹر انور سدید پر ڈاکٹر خواجہ زکریا کا تفصیلی مضمون بہت خوبصورت ہے۔ اس مضمون میں انور سدید کے بعض ایسے گوشے سامنے لائے گئے ہیں جو لوگوں کی نظروں سے

پوشیدہ تھے۔حسن عسکری کاظمی کا مضمون شفیع عقیل، ادب اور صحافت کا سنگم بھی بہت خوبصورت ہے۔اس میں شفیع عقیل کی زندگی اور فن پر بھر پور روشنی ڈالی گئی ہے۔گوشہ فیض احمد فیض کے تینوں مضامین معیاری اور قابل مطالعہ ہیں۔پروفیسر جمیل آذر کا انشائیہ ''چائے کی معیت'' میں پڑھ کر بڑا مزہ آیا۔حالانکہ یہ انشائیہ اس سے قبل بھی پڑھ چکا ہوں۔اس کے باوجود لطف میں کمی نہیں آئی۔گوشۂ اظہر جاوید میں شمشاد احمد نے اپنی پرانی یادوں کو تازہ کیا ہے۔افسانوں میں بشریٰ رحمٰن، سلمیٰ اعوان، آغا گل اور اظہر جاوید کے افسانے بہت پسند آئے۔''تخلیق'' میں یہ تحریر پڑھ کر مسرت ہوئی کہ اردو اکیڈمی شمالی امریکہ کی سرپرستی میں اظہر جاوید کے قریبی رفیق تاشی ظہیر نے اظہر جاوید کی دوسری برسی کے سلسلے میں ایک تقریب کا اہتمام کیلیفورنیا میں کیا ہے جس میں امریکہ میں مقیم کثیر ادبی حلقوں نے شرکت کر کے ان کی ادبی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔سونان اظہر جاوید! میں آپ کو ''تخلیق'' جاری رکھنے اور اسے خوب سے خوب تر بنانے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

.... **شفیع ہمدم (فیصل آباد)**

﴿8﴾ عزیزم سونان اظہر جاوید!

تازہ ''تخلیق'' مارچ 2014ء میں سمندر کی سی وسعت ہے۔کون سی ایسی صنف شعر و ادب ہے، جو اس قلزم میں موجزن نہیں۔ حمد، نعت، نظم، غزل، افسانہ، انشائیہ، مضمون، یادنگاری، آپ بیتی، سفرنامہ، طنز و مزاح، جائزہ، تبصرہ، گوشہ، تقاریب کی رپورٹ، غرض مشمولات کا ایک شاندار تنوع ہے جس نے تازہ ''تخلیق'' کو پرچے سے زیادہ ایک نگارخانے کا روپ دے دیا ہے۔ایک نوعمر مدیر ادارت میں بزرگی دکھا سکتا ہے، یقین نہیں آتا......لیکن یقین کرنا پڑتا ہے ''تخلیق تحسین ایوارڈ'' 2013 یافتہ قلمکار ڈاکٹر انور سدید کے فن وشخصیت پر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے ان کے شایان شان ایک مضمون تحریر کیا ہے۔اس مضمون میں خواجہ صاحب نے ڈاکٹر انور سدید کی صلاحیتوں کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔بدقسمتی سے ڈاکٹر انور سدید ایک متنازع شخصیت متصور ہوتے ہیں۔اس حوالے سے خواجہ صاحب نے جو اظہار خیال کیا ہے، وہ ہمارے دعوے پر دال ہے کہ انہوں نے اپنے ممدوح کے ایک شخصی منفی پہلو کا اعتراف کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔

> ''یہاں مجھے مجبوراً لکھنا پڑتا ہے کہ احمد ندیم قاسمی اور وزیر آغا اور ان کے مداحین کے درمیان جو شدید اختلافات رہے ہیں اور اس سلسلے میں دونوں طرف سے جو انتہائی دل آزار تحریریں لکھی گئی ہیں۔ان میں مَیں کسی کو بری الذمہ قرار نہیں دیتا۔اس لئے غیر جانبداری سے رائے دینے کا مجاز ہوں۔ان دنوں دل خراش تحریریں کسی ایک طرف سے نہیں دونوں طرف سے لکھی گئی ہیں، بہت اچھا ہوتا اگر یہ نہ لکھی جائیں۔اب دونوں بزرگ دنیا سے جا چکے ہیں، اس لئے ان تحریروں کا محاکمہ بھی مناسب نہیں۔

حنیف باوا کا شکریہ کہ وہ یار جانی اظہر جاوید کی پنجابی تحریروں کا اصل کے مطابق ترجمہ کرتے ہیں۔اظہر جی کا افسانہ ''اشارہ'' ایک فینٹسی (Fantacy) پر مبنی ہے۔اس قسم کی فینٹسیز (Fantacies) ذہنوں میں جنم لیتی رہتی ہیں۔''اشارہ'' میں اظہر جاوید نے ''راجا جی'' کا ایک جاندار کردار تخلیق کیا ہے۔''شورش کاشمیری کا اسلوب'' کے عنوان سے اپنے مضمون میں ڈاکٹر انور سدید نے اپنی مخصوص علمی و ادبی بصیرت کا مظاہرہ کیا ہے۔شورش کاشمیری کے فن وشخصیت کو ہم ہمالہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ڈاکٹر صاحب نے جس کی چوٹی کو ایک ہی جست میں سر کر لیا ہے۔علی سفیان آفاقی کی آپ بیتی ''بھارت سے پاکستان تک'' کی تیسری قسط جہاں تحریک پاکستان کے چشم دید واقعات

کی آئینہ دار ہے وہاں اس دور کے متحدہ ہندوستان کی طرز معاشرت کی تصویر بھی دکھاتی ہے۔عزیز میرٹھی ایسے کہنہ مشق قلم کار کی قلمکاری محتاج تعریف نہیں۔ان کی خودنوشت کی تیسری قسط ''تمہیں یاد ہو......'' کی نمایاں خوبی میرٹھی صاحب کی سراپا نگاری ہے۔''سورج کے رخ پر'' ڈاکٹر ابدال بیلا کے سفرنامے کی تیسری قسط ہے۔ڈاکٹر صاحب ایک کثیر الجہت شخصیت کے مالک ہیں۔لطف کی بات یہ ہے کہ ان کی کوئی ''جہت تشنہ'' تکمیل نہیں۔چونکہ وہ ایک فکشن رائٹر بھی ہیں۔ان کے سفرنامے میں کہانی کاری بھی اپنی چھب دکھائی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور یوں قاری کو دو آتشہ کا مزا لینے کا موقع ہاتھ آتا ہے دوسرے ''تخلیق تحسین ایوارڈ'' یافتہ کا نام نامی شفیع عقیل ہے۔جنہیں حسن عسکری کاظمی نے ''ادب اور صحافت کا سنگم'' قرار دیا ہے۔ہم ان کی رائے پر صاد کرتے ہیں۔

اردو فکشن کا ایک معروف نام بشریٰ رحمٰن ہے۔کہانی اب جن کے گھر کی کنیز ہے۔تازہ ''تخلیق'' میں ان کا افسانہ ''گیسو'' شامل اشاعت ہے۔بشریٰ صاحبہ نے سسپنس پیدا کرنے میں جس مہارت فن کا مظاہرہ کیا ہے، اس کا اختتام کسی حیرت کو جنم نہیں دیتا۔البتہ کہانی کا انجام سرتاسر افسانویت سے سرشار ہے، جس کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔

ڈاکٹر صغریٰ صدف کا افسانہ ''کھڑکی''، ایک عام سی کہانی ہے۔جس میں ٹریٹمنٹ کی کمی کا شدید احساس ہوتا ہے۔لیکن انجام کے ڈرامائی انداز نے یقیناً کہانی میں جان ڈال دی ہے۔ڈاکٹر صاحبہ کا اسلوب اظہار متاثر کن ہے۔

''مسیت ناں پاٹ'' آغا گل کا ایک تاثر آفرین افسانہ ہے۔انہوں نے ہجرت ایسے موضوع میں سیاست کا تڑکا لگا کر ایک دلچسپ کہانی تخلیق کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ قدرت نے انہیں منفرد خلاقانہ صلاحیتیں ودیعت کی ہیں۔آغا گل کے افسانے معلومات افزا ہوتے ہیں۔کردار نگاری میں انہیں بطور خاص کمال حاصل ہے۔

نثار احمد صدیقی (انڈیا) نے اپنے افسانے ''واپسی'' میں ایک کڑوا سچ پیش کیا ہے۔کرنل بشیر اگرچہ حقیقی زندگی کا ایک کردار ہے، مگر ہمیں وہ ان کے کسی افسانے کا کردار لگتا ہے۔

ڈاکٹر ایس۔ایم قریشی مزاح نگاری کے ہمیشہ نئے نئے آفاق دریافت کرنے میں مگن دکھائی دیتے ہیں۔ہمارے نزدیک ان کا فکاہیہ ''بھارتی پولیس کی غالب شناسی'' اردو مزاحیہ نگاری کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔غالب ایسے گنج معانی کے بعض اشعار میں شگفتہ نگاری کا خام مال تلاش کر لینا یقیناً ایک کارنامہ ہے۔

شمشاد احمد ایک معروف افسانہ نگار ہیں۔یادنگاری کے ذیل میں شامل اشاعت ان کی تحریر ع میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے، کی تفسیر ہے۔اپنے مضمون ''اظہر جاوید بھی چل بسے'' میں انہوں نے صرف اپنے ہی نہیں، ہمارے جذبات کی بھی ترجمانی کی ہے۔یار جانی کی یاد میں لکھی گئی یہ پہلی تحریر ہے۔جس میں ہمیں اپنا دل بھی دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

اعتبار ساجد کا مزاحیہ مضمون ''شہزور'' کے رومان کے ساتھ ساتھ ہمیں محمود الحسن جعفری اور محمد ساجد کے جائزے ''انسٹالیشن'' اور ''شکیب سے میرا کیا تعلق؟'' بھی پسند آئے ہیں۔منظومات اور غزلیات میں ہمیں ظفر اقبال اور محمود شام کی غزلیں اچھی لگی ہیں۔

قیصر نجفی (کراچی)

....

﴿9﴾ جناب سونان جاوید!

'تخلیق' کا تازہ شمارہ مارچ ۲۰۱۴ء موصول ہوا شکریہ، میں آپ کی 'پہلی بات' میں تھوڑی سی اپنی بات بھی شامل کرنا چاہوں گی۔ یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ آج کے دور میں اربابِ اختیار تک رسائی رکھنے والے لوگ ہی فائدہ حاصل کر رہے ہیں اب چاہے معاملہ سیاسی ہو، مذہبی ہو یا پھر ادبی...... بُرا تو لگے گا مگر سچ یہی ہے کہ جو اصل لوگ ادب کو اپنا خونِ جگر دے رہے ہیں اُن کے ناموں، چہروں اور خدمات سے لوگوں کو ناواقف رکھا گیا ہے۔ آپ پاکستان کے کسی بھی شہر میں رہتے ہوں اور اعلیٰ معیار کے قلم کار ہوں لیکن یہ سب بیکار ہے آپ کو کہیں چانس نہیں ملے گا اگر آپ کے تعلقات محدود ہیں......اس کھیل تماشے کا دائرہ، صرف کانفرنس......ادبی میلے......اور ایوارڈز تک ہی نہیں رہا بلکہ مختلف چینلز کے پروگراموں، بیرونِ ملک مشاعروں، اعلیٰ عہدوں پر تعیناتی، آرٹ کونسلوں کے الیکشن......اب کس کس بات کا رونا روئیں گے......کراچی کے حالات اس قدر خراب ہونے کے باوجود، یہاں جیسے ہی عالمی مشاعرے کا اعلان ہوتا ہے، دنیا بھر سے طرح طرح کے خود ساختہ شعراء کہ جن کو اُردو کے ہجے تک نہیں آتے وہ ان مشاعروں میں عزت سے اسٹیج پر براجمان ہوتے ہیں اور کراچی کے ادبی ذوق رکھنے والے سامعین کے صبر اور برداشت کا امتحان لیتے ہیں لیکن کراچی سے صرف اُن ہی شعراء کرام کا انتخاب ہوتا ہے جو پچھلے کافی عرصہ سے کمال مہارت سے اپنا انتخاب کرواتے چلے آ رہے ہیں اور ان کو اس بات کا قطعی احساس نہیں کہ وہ دوسروں کا حق مار رہے ہیں۔ جس معاشرے میں میرٹ قتل ہو جائے اور تمام چیزوں کا حصول صرف تعلقات کی بنا پر ہوتا ہو وہاں ان باتوں کا رواج پا جانا کوئی خاص معنی نہیں رکھتا۔ آپ نے اظہر جاوید ایوارڈ کی ابتدا کر کے ایک اچھی اور مثبت روایت کو جنم دیا ہے میری نیک خواہشات آپ کے ساتھ رہیں گی۔

افسانہ 'گیسو' محترمہ بشریٰ رحمٰن صاحبہ کا ایک ایسا افسانہ ہے جو عورت کی محبت اور مرد کی بے وفائی کی وہ ازلی داستان بیان کرتا ہے جو شاید اب مرد کی فطرت کا ایک جزو لازم بن چکی ہے۔ جناب اظہر جاوید کا افسانہ 'اشارہ' عورت کی اُس ادا پر بحث کرتا ہے جسے آج تک کوئی نہیں جان پایا۔ غزلوں کا حصہ بھرپور تھا۔ ظفر اقبال صاحب کا رنگ سب سے الگ نظر آتا ہے۔ مشکور حسینؔ یاد، نثار ترابیؔ، سہیل غازی پوریؔ اور محترمہ رشیدہ عیاںؔ کی غزلیں پسند آئی۔

.... **رومانہ رومیؔ (کراچی)**

﴿10﴾ محترم و مکرم سونان اظہر جاوید صاحب!

ماہ نامہ ''تخلیق'' کا تازہ شمارہ (مارچ 2014) نظر نواز ہوا۔ آپ نے پہلی بات میں فکر و نظر اور دانش مندی کی باتیں کی ہیں۔ ادب دوستی کا پرچار بھی کیا ہے۔ عزیز میرٹھی کے بعد اعزاز احمد آذر کی شدید علالت کی طرف حکومتی اداروں کی توجہ مبذول کروانا ایک خوبصورت سماجی عمل ہے۔ جس سے دوسرے مدیران غافل ہیں۔ ''تخلیق گھر میں ایک دن''، ستاروں کی مانند روشن نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے ڈاکٹر انور سدید کی ادبی خدمات کو مفصل انداز میں روشن کیا ہے۔ انور سدید کی جہتوں کو اور ان کی ادب دوستی کو بھی نمایاں کیا ہے۔ حسن عسکری کاظمی نے شفیع عقیل کو ادب اور صحافت کا سنگم قرار دیا ہے۔ فیض احمد فیض کو بھی خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔ افسانوی کائنات میں ستھرے ہوئے اسلوب میں بشریٰ رحمٰن کا لکھا گیا افسانہ ''گیسو'' عشقیہ لہروں کا ترجمان ہے۔ ڈاکٹر صغریٰ صدف نے بھی چاندنی راتوں میں بند کھڑکی کھول کر افسانوی فضا کو روشن کر دیا ہے۔ پروفیسر جمیل آذر نے ''چائے کی معیت میں'' عمدہ انشائیہ رقم کیا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید اردو تنقید کے وہ مردِ آہن ہیں جنھوں نے اپنی زندگی اُردو ادب اور بالخصوص پچھلے چند عشروں سے اردو رسائل و جرائد کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ انور سدید ہر ادبی رسالے میں جگمگ کرتے نظر آتے ہیں۔ انور سدید جینوئن ادیب ہیں۔ ''شورش کاشمیری کا اسلوب'' انور سدید کا یہ مضمون ماخذ کا درجہ رکھتا ہے۔ انہوں نے ''تخلیق'' کے دو سال'' الفاظ کی گیلری میں محفوظ کر دیئے ہیں۔ تبصروں میں بھی ان کی شمولیت کا قوی احساس ہوتا ہے۔ خوش آئند بات یہ کہ ان کا گوشہ نہ ہوتے ہوئے بھی ان کی موجودگی نمایاں ہے۔ مزاحیہ دنیا میں ڈاکٹر معین قریشی نے موضوعاتی تنوع میں لطافت پیدا کر لی ہے۔ گوشہ اظہر جاوید بھی شاد باد نظر آتا ہے۔ جناب شفیع ہمدم نے اپنے مضمون ''ڈاکٹر سلیم آغا کے اشارے'' میں ڈاکٹر سلیم آغا کے بارے میں بڑا خوب صورت جملہ لکھا ہے کہ ''وہ بحر تنقید و تحقیق کے بھی شناور ہیں''۔ شفیع ہمدم نے ایک دور اندیش مصنف کی طرح ڈاکٹر سلیم آغا کو صرف انشائی کائنات تک مقید نہیں کیا۔ بلاشبہ ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش اپنی ادبی دنیا خود پیدا کر لی ہے۔ آخر میں ڈاکٹر انور سدید کی رائے سے اتفاق کرنا پڑے گا کہ ''تخلیق ادب کا زندہ استعارہ ہے''۔

.... **سکندر حیات میکن** (سرگودھا)

﴿11﴾ مکرمی سونان اظہر جاوید صاحب!

آپ کی عنایت سے ''تخلیق'' کا تازہ شمارہ مارچ 2014ء میرے ہاتھوں میں ہے۔ امین راحت چغتائی کی نعت کا یہ شعر بہت خوب ہے۔

جس نے تہذیب نظر دی، راستوں کو روشنی   حاصلِ عمرِ رواں وہ نقشِ پا ایسا لگا

صفدر صدیق رضی کی نثری نظم ''وراثت'' پسند آئی۔ انہوں نے کراچی کے ساحل سمندر کا ایک مصرف بھی بتایا ہے جو حسبِ حال ہے اور بے حد خوبصورت بھی۔

بشریٰ رحمان نے اپنی تحریر صنفِ نازک کی حمایت اور اصلاح کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ وہ بتانا چاہتی ہیں کہ وفا، اخلاص اور سچائی میں بڑی طاقت ہوئی ہے۔ بند آنکھوں سے بھی وہ سب نظر آ جاتا ہے جو کھلی آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔ خصوصاً کسی کی بے وفائی و خیانت کو بہت جلد جان لیا جاتا ہے۔ ان کا افسانہ ''گیسو'' ان خوبیوں کا آئینہ دار ہے۔ سلمیٰ اعوان کا اسلوب اور فنی مہارت اب اس بلندی تک آ چکا ہے جہاں وہ تاریخ اور جغرافیے کے کینوس پر کہانیاں بُنتی ہیں۔ جہاں کردار نگاری اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ افسانہ ''No'' مشرقِ وسطیٰ میں وارد ہونے والی ایک خاتون جس کی صلاحیتیں اسے بادشاہ بنا دیتی ہے۔ سچی محبت کو ترسنے والی وہ شخصیت اپنے اندر ایسی بے پناہ قوتیں کیوں کر پیدا کر لیتی ہے۔ اور وہ ہے اس کا کردار۔ جس کا اظہار وہ ''No'' سے کرتی ہے۔ ڈاکٹر صغریٰ صدف کا خوب صورت افسانہ ''کھڑکی'' ظاہر کرتا ہے کہ انسان اپنی ضرورت کے لیے سمجھوتا کرتا چلا جاتا ہے لیکن محبت کی چنگاری ہر وقت سلگتی رہتی ہے اور ناآسودگی اس کی ہستی کو پھونک ڈالتی ہے افسانے کا اختتام خصوصاً ''پنچ لائین'' بڑا زوردار ہے۔

''مسیت ناں پاٹ'' آغا گل نے ایک بڑے موضوع کو اپنے اسلوب سے منور کر دیا۔ چند مثالیں:

''بانہوں کی قوسیں پکاریں تو چھاتی پر لرزاں گنبد عبادت گاہوں کی مانند روح کو مسحور کرنے لگتے۔''

''اس بازار میں جان بوجھ کر اندھیرا رکھا جانا، تاکہ ایک دوسرے کا چہرہ دیکھ کر گاہک نہ شرمائیں۔''

''سوائے زبان کے ان طوائفوں کو سب کچھ کھولنے کی اجازت تھی۔''

نثار احمد صدیقی کے افسانے ''واپسی'' پر مختصر ترین تبصرہ یہ ہوسکتا ہے کہ ''شادی محبت کی قینچی ہے''۔
اپنی خوشبو کے لیے مشہور ''باسمتی'' چاولوں کی رانی ہے۔کوئی لڑکی اپنی خدمت اور اعلیٰ کردار سے ''باسمتی'' کہلائے تو ہرگز حیرت نہیں ہونی چاہیے۔زہیرہ سمن علی (بلغراد) سے یہی بتاتی ہیں اور کسی کا اس باسمتی کے لیے دل ہار جانا انوکھی بات نہیں ہے۔لیکن کیا کیا جائے کہ عین وقت پر باسمتی کا باپ اپنی کھوئی ہوئی بیٹی کو لینے آ دھمکتا ہے اور قاری کو چونکا دیتا ہے۔
اظہر جاوید کا ترجمہ ''اشارہ'' حنیف باوا کے توسط سے ہم تک پہنچا۔زندگی کے بہت سے باریک اور لطیف نقطے اظہر جاوید کے قلم سے اوجھل نہیں ہوئے۔''اشارہ'' سمجھنے کی صلاحیت ہر ایک میں کہاں ہوئی۔اور بعض اشارے سمجھنے میں تو زندگی کم پڑ جاتی ہے۔
''بھارتی پولیس کی غالب شناسی'' میں ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی نے اس مرتبہ بھارتی پولیس کو تاکا ہے۔اب ان کی خیر نہیں اور بندوق رکھے ملے گی، مرزا نوشا کے کندھے پر۔آپ خود اندازہ کرلیں کہ کیسی کیسی پھلجھڑیاں جھڑیں گی۔ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے؟

.... **نجیب عمر (کراچی)**

﴿12﴾ سونان بیٹے سلامت رہو!

تم سے فون پر پچھلے ہفتے بات ہوئی تھی۔دوپہر کی پوسٹ سے تخلیق کا مارچ کا شمارہ مل گیا اور میں اس میں کھوگئی۔اس پر لکھے ہوئے تمہارے مختصر نوٹ نے ہی میرے اندر زندگی کی ایک نئی روح پھونک دی۔سب سے پہلے تو ڈاکٹر انور سدید کا بے انتہا شکریہ کہ انہوں نے میری برسوں کی دیرینہ خواہش پوری کی اور میرے تیسرے شعری مجموعے ''خیال کی خوشبو'' پر اتنا خوبصورت اور اچھوتا تبصرہ کیا ہے۔یہ میرے لیے کسی بہت بڑے اعزاز یا ایوارڈ سے کم نہیں۔میری دلی مبارک باد کہ انہیں ''تخلیق تحسین ایوارڈ'' پیش کیا گیا۔کاش میں وہاں موجود ہوتی۔بہرحال ان کی صحت اور سلامتی کے لیے ہمیشہ دعاگو رہتی ہوں۔ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے انور سدید کی تصنیفات اور تالیفات کے حوالے سے سچی بات کہی ہے کہ ''ان کے کام کا احاطہ کرنا کسی ایک مضمون میں ممکن نہیں''۔ڈاکٹر زکریا نے انور سدید کی شخصیت اور انداز اسلوب کے بارے میں بڑا جامع مضمون تحریر کیا ہے۔ابھی پورا رسالہ نہیں پڑھا ہے۔افسانے سبھی اعلیٰ معیار کے ہیں۔خاص طور پر بشریٰ رحمان اور آغا گل کے افسانے بھرپور تاثر چھوڑتے ہیں۔شاعری کا حصہ اور دوسرے مضامین ابھی پڑھ رہی ہیں۔مرحوم اظہر جاوید پر لوگ ابھی تک لکھ رہے ہیں۔میں بھی جلد ہی اس حوالے سے لکھ کر روانہ کروں گی۔ابھی تک خیالات منتشر ہیں اور سچی بات ہے انہیں مرحوم لکھنے کو جی نہیں چاہتا۔پھر تم نے ماشاءاللہ تخلیق کو رواں دواں رکھا ہے بلکہ اور بھی خوبصورت بنا دیا ہے۔لگتا ہے وہ اب بھی اس کارواں میں شامل ہیں۔اپنا یہ شعر تمہارے بلند عزائم کی نذر کرتی ہوں۔

میں تھک گئی تو کئی لوگ ہار جائیں گے یہی خیال مجھے اور حوصلہ دے گا

.... **نجمہ عثمان (برطانیہ)**

﴿13﴾ محترم سونان اظہر صاحب!

رنگوں سے سجا ''تخلیق'' ملا اور یہ بہار کا پیامبر بن گیا اس پر آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ڈاکٹر انور سدید کے قیمتی الفاظ میرے لیے گراں قدر سرمایہ ہیں، اُنھوں نے صحیح فرمایا کہ ڈائجسٹ پہلی سیڑھی اور ادب کی قد آور محفل میں پنیری کی سی اہمیت تو رکھتے ہیں مگر یہ مقام پڑاؤ کا نہیں! ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے ڈاکٹر انور سدید پر بھرپور اور جامع مضمون تحریر کیا ہے۔شفیع عقیل پر حسن عسکری کاظمی کا مضمون بھی پوری

توجہ حاصل کر لیتا ہے۔نظموں میں شاہین کی ''چین والے'' متاثر کن تھی ،شہزادنیرّ اور عبیرہ احمد کی نظمیں دل کو چھو گئیں۔افسانوں میں ''اشارہ'' اک لا جواب اور زندہ و جاوید افسانہ تھا اُس کے بعد بشریٰ رحمٰن صاحبہ ،سلمیٰ اعوان اور آغا گل اپنے مخصوص لب و لہجے اور اسلوب کے ساتھ متاثر کن رہے! ''چائے کی معیت'' میں پروفیسر جمیل آذر نے ثابت کیا کہ چائے کے عشق میں اے حمید کے بعد کوئی اور بھی بہت خوبصورت اور رومانوی انداز میں لکھ سکتا ہے! ڈاکٹر انور سدید کا مضمون شورش کاشمیری کے اسلوب کا بخوبی احاطہ کرتا ہے! اسی طرح تخلیق کے دو سالوں کو بھی اُنھوں نے بہت عمدگی سے سمیٹا! طنز و مزاح میں دونوں مضامین بڑے جاندار تھے بلکہ ڈاکٹر معین قریشی نے ''سیمی'' کی دہشت گردی پر تو چودہ طبق روشن کر دیے! ڈاکٹر ابدال بیلا اور عزیز میرٹھی دونوں نے اپنا رنگ خوب جمایا! اس خوبصورت پیشکش پر مبارکباد!

.... سیمیں کرن (فیصل آباد)

﴿14﴾ مکرمی سونان اظہر جاوید!

میں انور سدید صاحب کو ''تخلیق تحسین ایوارڈ'' ملنے پر تہہ دل سے مبارکباد دیتی ہوں۔ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے اس موقع کی مناسبت سے ڈاکٹر صاحب کی ادبی خدمات کا اجمالی جائزہ پیش کر کے تحسین کا حق بروقت ادا کیا ہے۔بشریٰ رحمٰن کا افسانہ ''گیسو'' کا انداز بیان رواں اور گرفت میں لینے والا ہے تاہم افسانے میں دو جھول ہیں۔راز اپنی بیوی کا چیلنج قبول کرتا ہے تو نازش کی آمد مصنوعی اور کہانوی سی لگتی ہے۔اس میں بھی راز کا قصور کم نکلتا ہے۔شوہر کا ہرجائی پن تب ثابت ہوتا جب وہ دل سے کسی دوسری عورت کو چاہتا۔اس کے علاوہ گیسو کا بال گردن کے گرد لپیٹ کر خودکشی کرنا خاصا ڈرامائی ہے حقیقت یہ ہے کہ خودکشی کرنے والے کی جان پر جب بن آتی ہے تو وہ خودکشی کے اسباب بھول جاتا ہے اُس کی بچی کھچی جسمانی توانائی زندہ بچ جانے کے لیے بھرپور شور کرتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ پنکھے سے لٹکنے والے گلے میں پھندہ ڈالنے کے بعد پاؤں سے سٹول گرا دیتے ہیں ورنہ اذیت کے لمحوں میں وہ ضرور سٹول پر پاؤں رکھ دیں۔میرے خیال میں خودکشی کرنے والے کو بھی زندگی پیاری ہوتی ہے۔

آغا گل اور سلمیٰ اعوان کے طویل افسانے پڑھ کر مدیر تخلیق کی ''مختصر'' لکھنے والی تحریک یاد آ گئی۔کبھی کبھی ایک صفحہ کا افسانہ بھی طویل ہوتا ہے افسانہ ''باس متی'' میں کوئی قابل توجہ بات نہ تھی۔پروفیسر جمیل آذر نے عوامی مشروب چائے کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے انشائیہ دلچسپ اور فکر انگیز ہے۔چائے بنانے کا اسرار بھی سمجھ نہیں آتا۔ہر ہاتھ کی چائے کا ذائقہ اور خوشبو جدا ہوتی ہے، خواہ چائے کی پتی کا ایک ہی برانڈ اور دودھ ایک گائے کا ہو۔یہاں تک کہ ایک ہاتھ سے بھی ہر بار ایک معیار کی چائے نہیں بنتی ...... یہ بھی سچ ہے کہ بہت سے اچھے بھلے باذوق لوگ چائے نہیں پیتے۔

ڈاکٹر رشید امجد کی یادیں ''عاشقی صبر طلب''، علم اور اردو زبان کی عمومی حالت کی کامیاب تصویر دکھاتا ہے۔رضی الدین رضی نے اظہر جاوید سے وابستہ یادوں کا چراغ جلایا۔یہ چراغ جگہ جگہ جلتے رہیں گے۔اظہر جاوید مرحوم کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ڈاکٹر انور سدید نے 'تخلیق کے دو سال' کا جامع جائزہ لیا۔ڈاکٹر صاحب ہمیشہ بھرپور لکھتے ہیں کسی گوشے کو خالی نہیں رہنے دیتے۔شہزاد نیرّ نے میرے افسانہ 'کہاں بسرام کریں' کی تحسین کی۔اُن کی نوازش ہے تاہم وضاحت کر دوں کہ میں جنوبی پنجاب کی ضرور ہوں مگر افسانے کے دو اہم کردار ڈاکٹر ماریہ عظمت کا تعلق شمالی پنجاب اوکاڑہ اور سرسوں گل کا تعلق خیبر پختون خواہ کے دیہی علاقہ سے تھا...... میں شہزاد نیرّ کے مطالعہ کی داد

دیتی ہوں۔حنیف باوا اظہر جاوید کے پنجابی افسانوں کو اُردو میں منتقل کر کے اعلیٰ خدمت انجام دے رہے ہیں۔بعد میں ان کا مجموعہ کتابی شکل میں شائع ہونا چاہیے۔

.... دردانہ نوشین خان (مظفر گڑھ)

﴿15﴾ مکرمی سونان اظہر جاوید!

''تخلیق'' کا تازہ شمارہ ماہ مارچ ۲۰۱۴ء نظر نواز ہوا۔مقام اطمینان ہے کہ آپ نے اپنے عظیم و مہربان والد گرامی کی ادبی میراث بطریق احسن سنبھال رکھی ہے اور تخلیق اپنی روائتی شان اور تسلسل کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ اداریہ ''پہلی بات'' ۔آپ کی ادارتی بصیرت کا آئینہ دار ہے۔آپ نے درست نشان دہی کی ہے کہ اردو ادب کی کانفرنسوں میں اردو کی بجائے انگریزی کو اہمیت دی جا رہی ہے اور ادبی کانفرنس فیسٹیول (میلے) کا نام دے کر راگ رنگ کا اہتمام کیا جاتا ہے اور اہل ادب کی جگہ اہل نشاط کو نوازا جاتا ہے۔آپ نے یہ بھی صحیح لکھا ہے کہ ادبی کانفرنسوں میں عموماً گروہ بندی کے تحت ایسے اہل قلم مدعو کیا جاتا ہے جو منتظمین کو اس کے صلے میں کوئی مفاد دے سکتے ہوں۔اسی طرح اکیڈمی ادبیات کے افسران بھی ایک مخصوص لابی کے لوگوں کو نوازتے ہیں۔کانفرنسوں میں بااثر لوگوں کو مدعو کیا جاتا ہے اور غیر ملکی دوروں پر بھی عموماً ان لوگوں کو ہی بھیجا جاتا ہے جو پہلے بھی کئی ملکوں کا چکر لگا چکے ہیں اور ان کے ذاتی مفادات اس ملک میں ہوں۔اکیڈمی ادبیات انعامی مقابلوں کے لئے پہلے پانچ سات کتابیں خرید ا کرتی تھی اب وہ وہ بھی چار اعزازی کتب لیتی ہے اور رسید تک بھجوانے کی زحمت گوارا نہیں کرتی۔لیکن ان سب باتوں کا اثر کون قبول کرے گا؟ صاحبانِ اقتدار اندھے ہیں، بہرے ہیں۔

منظومات میں امین راحت چغتائی، شاہین، صفدر صدیق رضی اور فوقیہ مشتاق کی نظمیں متاثر کرتی ہیں جبکہ غزلیات میں نثار ترابی، ناصر زیدی، نصیر ہمایوں، مظفر حسن منصور، ظہیر جاوید، رشیدہ عیاں، آصفہ نشاط، اور پرتپال سنگھ بیتاب کی غزلیں مجھے پسند آئی ہیں۔افسانے کے باب میں بشریٰ رحمٰن، سلمیٰ اعوان اور اظہر جاوید مرحوم کا ترجمہ شدہ افسانہ ''اشارہ'' معیاری اور دلکش ہیں۔شورش کاشمیری کے اسلوب کے حوالے سے محترم ڈاکٹر انور سدید کا مضمون انتہائی اہم ہے۔اردو ادب کی خدمات کے حوالے سے ڈاکٹر موصوف کا کام انتہائی قابل تحسین ہے۔محترم رؤف خیر نے ''دامن ساقی'' کے زیر عنوان درج کیا ہے کہ شاہ نامہ اسلام کے شاعر حفیظ جالندھری اور شاعر احسان بن دانش کے بارے میں قتیل شفائی نے لکھا تھا کہ انھوں نے ان حضرات کو کبھی نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا۔(ص160) یہ سراسر غلط بیانی ہے اور معاصرانہ چشمک کا شاخسانہ ہے۔پس مرگ ایسی باتوں کی تشہیر قطعاً مناسب نہیں۔

یادنگاری میں ڈاکٹر رشید امجد صاحب کے مضمون ''عاشقی صبر طلب'' معلومات افزا ہے لیکن اس کا ابتدائی پیراگراف ہی خارج از آہنگ ہے جو پوری تحریر کو غیر ادبی بنا دیتا ہے۔انجمن خیال میں محترم قیصر نجفی، ڈاکٹر معین قریشی، ڈاکٹر انور سدید اور نجیب عمر کے خطوط بڑے گراں قدر ہیں۔''تخلیق'' کا یہ حصہ اول سے آخر تک پڑھنے کے لائق ہے۔

.... جاوید احسن (ڈیرہ غازی خان)

﴿16﴾ سونان بھائی!

محکمہ ڈاک کی ''کرم نوازیوں'' کا تذکرہ پڑھ کر سر پیٹنے کو جی چاہا۔اللہ اس محکمے کے افسروں کو مخلوق کے لئے آسانیاں پیدا کرنے

کی توفیق عطا کرے۔ جناب شفیع عقیل مرحوم پر لکھے گئے مضامین خوب ہیں۔ واقعی شفیع عقیل عظیم لکھاری تھے۔ آفاقی صاحب اور میرٹھی صاحب کی آپ بیتیاں پسند آ رہی ہیں۔ آفاقی صاحب کی تحریر سے تو ''سیارہ ڈائجسٹ'' اور ''سرگزشت'' کے دور سے شناسائی ہے۔ وہ خود میں ایک انجمن ایک ادارہ ہیں۔ آپ اظہر صاحب کے پرانے کاغذات کی تلاشی لیتے رہیں یقیناً ''بڑے خزانے'' برآمد ہوں گے۔ نظم، غزل اور افسانے کا انتخاب اس بار بھی خوب ہے۔

.... **محمد افضال انجم** (لاہور)

﴿17﴾ محترم سونان اظہر جاوید!

''تخلیق'' کا ماہنامہ مارچ 2014ء ملا، اسے پڑھا تو یہ اچھا لگا مگر اظہر جاوید صاحب کا انداز اس میں نظر نہیں آیا۔ میں نے آپ کے نام، اپنی تازہ تخلیق امریکہ، انگلینڈ کا ادبی سفرنامہ 'آبشارِ ادب' کی ایک جلد مورخہ! اکتوبر 2013ء کو رجسٹرڈ پوسٹ سے بھجوائی تھی۔ توقع ہے کہ آپ اس پر ضرور اظہارِ خیال کریں گے۔ اس میں بیرونی دنیا میں آباد اُردو کے ادیبوں کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔ مگر اس پر 'تخلیق' میں تجزیہ، تبصرہ شائع نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ ماہنامہ تخلیق کے آخر میں موصول شدہ کتابوں کا جو ذکر ہے اُس میں بھی اس کا نام تک نہیں۔ جناب اظہر جاوید کے وقت میں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ انہوں نے ہماری 'احساس ادبی سوسائٹی' کی خدمات کا ذکر ہمیشہ کیا۔ اور ہماری کتابوں پر تبصرے بھی شائع کیے۔ ہم اُن کا خوب احترام کرتے تھے اور کرتے ہیں اور وہ بھی ہمیں خوب عزت دیتے تھے۔ میں نے ''انسانیت'' پر نظم بھیجی تھی جو عالمی انٹرنیٹ مشاعرہ امریکہ میں پڑھی گئی تھی۔ اسے بھی ''تخلیق'' میں شائع نہیں کیا گیا۔ آخر یہ سب کیوں؟

''تخلیق'' میں میری کتاب پر کب تبصرہ شائع ہوگا؟ کیا آپ کچھ بتانے کی زحمت گوارا کریں گے؟ میں ''انسانیت'' پر اپنی نظم کی کاپی اور ''ہولی'' پر غزل دوبارہ بھیج رہا ہوں۔ اسے ''تخلیق'' میں شائع کرنے کی کوشش کیجئے گا۔ ادارۂ تخلیق لاہور اور ادبی دوستوں کو آداب!

.... **بی ڈی کالیہ ہمدم** (انڈیا)

﴿18﴾ محترمی سونان اظہر جاوید!

''تخلیق'' کا تازہ شمارہ (مارچ 2014ء) ملا۔ اظہر جاوید کے امر ہو جانے کے بعد ''تخلیق'' کی اشاعت کے سلسلہ کا قائم رہنا بڑی بات ہے۔ اس میں حمد اور نعت کے علاوہ سلام کا انتخاب معیاری ہے اور دیگر پرچہ جات کے مقابلے میں اضافی بات، سلام کا انتخاب ہے جو یقیناً صحت مند روایت ہے حصہ منظومات اور افسانے اعلیٰ پائے کے ہیں خصوصاً بشریٰ رحمٰن کا افسانہ ''گیسو'' اور ڈاکٹر صغریٰ صدف کا ''کھڑکی''۔ افسانہ ''گیسو'' جہاں عصرِ نو کے زائیدہ مسائل کا آئینہ دار ہے وہاں انسانی نفسیات کی پرتیں بھی کھلتی نظر آتی ہیں۔ انسان چونکہ عقل اور جبلت کا مرکب ہے اس لیے جہاں وہ سوچ سمجھ کر فیصلے کرتا ہے، وہاں متعدد ناہمواریوں کا مرتکب بھی ہوتا ہے۔ محترمہ بشریٰ رحمان نے یہ بات ضرور کہی ہے کہ ''مرد آزاد فضا کا پنچھی ہے اور فضائے بسیط میں نظر بازی کرنا اس کا پیدائشی مشغلہ ہے'' (گیسوص 35) اس بات کا اطلاق سب پر نہیں ہوتا تاہم بیش تر اِسی مد میں آتے ہیں۔ جبکہ ازدواجی زندگی تو نام ہی اعتماد اور خلوص کا ہے۔

حصہ غزلیات بھی بہت اعلا پائے کا ہے تمام تخلیق کاروں نے خوب دل جمعی سے اشعار کہے ہیں۔ ''گوشہ فیض احمد فیض'' اور ''گوشہ اظہر جاوید'' میں لکھنے والوں اور محمد ساجد کے جائزہ ''شکیبؔ سے میرا کیا تعلق؟'' ڈاکٹر معین قریشی کے مضمون ''بھارتی پولیس کی

غالب شناسی'' پروفیسر جمیل آذر کے انشائیہ ''چائے کی معیت میں'' کی داد دیے بغیر بھی میں نہیں رہ سکتا۔ ''تخلیق'' قلم کاروں کی محنت اور ادب دوستی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

.... **قمر علوی** (جھنگ)

﴿19﴾ عزیز القدر سونان اظہر!

''تخلیق'' کا شمارہ نمبر 3 بابت ماہ مارچ 2014 نظر نواز ہو گیا تھا۔ اظہر جاوید کی برسی پر تبصرہ خوب ہے۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے انور سدید صاحب کے بارے میں بہت اچھے خیالات کا اظہار کیا ہے وہ اس کے مستحق بھی ہیں۔ حسن عسکری صاحب نے شفیع عقیل کے بارے میں اپنے جذبات عقیدت و محبت پیش کیے ہیں جو قابل داد ہیں۔ ''لاہور سے کیلیفورنیا تک'' اظہر جاوید کی خوشبو کے عنوان سے مدیر ''تخلیق'' کی تحریر ہمارے لئے بطور تبرک ہے۔ مامون امین (نیویارک) نے فیض کے ہاں خارجیت اور داخلیت کا ذکر بڑی وضاحت سے کیا ہے۔ ایسے مضامین ادب سے تعلق رکھنے والوں کیلئے اردو ادب سے لگاؤ رکھنے والوں کیلئے چشم کشا ہوتے ہیں۔ اس شمارے میں نظمیں اور غزلیں بھی لاجواب ہیں۔ پڑھنے والے کو ادبی تسکین حاصل ہو جاتی ہے۔ اس شمارے کے افسانے اعلیٰ معیار کے حامل ہیں۔ بالخصوص اظہر جاوید کا ''اشارہ'' اور صغریٰ صدف کا ''کھڑکی'' بہت اچھے لگے۔ انشائیہ ایک ہی ہے لیکن خوبصورت انشائیہ ہے جمیل آذر انشائیہ کے بہت بڑے استاد ہیں۔ ہمارے ہاں ایک آدمی تھا جسے شورش کاشمیری کے نام سے لوگ جانتے تھے۔ شورش کاشمیری جب تک زندہ رہے بہت کچھ لکھا۔ وہ اپنے آپ کو سید عطا اللہ شاہ بخاری کا شاگرد کہا کرتے تھے۔ انور سدید صاحب نے شورش کاشمیری کے اسلوب کو موضوعِ قلم بنا کر انہیں ادب کی دنیا میں متعارف کرا دیا ہے۔

یادنگاری کے زیر عنوان ڈاکٹر رشید امجد نے ضیاء الحق، امریکا اور بدقسمت پاکستانیوں کا جس انداز میں ذکر کیا ہے وہ حقیقت کے عین مطابق ہے۔ ایسے مضامین ہمارے لوگوں کو سیاسی شعور سے بہرہ ور کرنے کیلئے نہایت ضروری ہیں۔ آپ بیتیاں (دونوں) اور سفر نامہ ڈاکٹر ابدال بیلا نے ہمیں بڑی اچھی تحریریں پڑھنے کو دی ہیں۔ ''تخلیق کا ایک دن اور شام'' کے دونوں مضامین سونان اظہر جاوید اور شاہد بخاری کی تحریریں ہیں۔ جو دلچسپ بھی ہیں اور معلوماتی بھی۔

الغرض اس بار تو تخلیق اپنے دامن میں اتنا کچھ رکھتا ہے کہ اس کو بیان کرنے کیلئے کئی صفحات درکار ہیں۔ اب صرف ایک فقرہ لکھ کر اپنی بات کو ختم کرتا ہوں کہ تخلیق کا یہ شمارہ ایک یادگار شمارہ ہے۔ جو ہمیشہ اپنی حیثیت برقرار رکھے گا۔

.... **مشتاق احمد** (لاہور)

﴿20﴾ سونان صاحب!

تخلیق کا تازہ شمارہ موصول ہوا، دیدہ زیب اور خوبصورت تصاویر سے مرصّع سرورق نے دل خوش کر دیا۔ اس شمارے کی خاص بات گوشۂ فیض احمد فیض: ''تخلیق تحسین ایوارڈ'': شورش کاشمیری پر ڈاکٹر انور سدید کا مضمون ہے۔ ابتدا سونان اظہر جاوید کی ''پہلی بات'' سے کی گئی ہے۔ انہوں نے بجا فرمایا ہے کہ یہ ادبی کانفرنسیں جو صرف اور صرف اپنی تشہیر کے لیے منعقد کی جاتی ہیں اردو ادب کی کوئی خدمت نہیں کر رہیں۔ مدیر نے نہایت نازک موضوع پر مختصر پیرائے میں مفصل اور جامع اداریہ لکھا ہے۔ عمل کرنا اربابِ اختیار کا کام ہے۔ محترم اظہر

جاوید کی دوسری برسی کی تقریب کی تصویری جھلکیوں نے لطف دوبالا کر دیا۔شاہد بخاری نے تقریب روداد بہت اچھی لکھی۔

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے ڈاکٹر انور سدید پر بہت عمدہ اور معلومات سے پُر مضمون تحریر کیا ہے۔خواجہ صاحب بذاتِ خود بہت اچھے لکھاری ہیں: ڈاکٹر انور سدید پر بلاشبہ یہ ایک عمدہ اور یاد رکھی جانے والی تحریر ہے۔انور سدید صاحب کی اردو ادب کے لیے بلاشک وشبہ خدمات بہت زیادہ ہیں۔اسی سلسلے کا اگلا مضمون ''شفیع عقیل: ادب اور صحافت کا سنگم'' کے عنوان حسن عسکری کاظمی نے تحریر کیا ہے۔شفیع عقیل نہ صرف عمدی تخلیق کار تھے بل کہ بہت بڑے انسان بھی تھے۔قدرت نے انہیں بہت ساری خوبیوں سے نوازا تھا:حسن عسکری کاظمی صاحب نے موضوع کے ساتھ بلاشبہ انصاف کیا ہے۔مامون ایمن نے فیض کی شاعری کے بعض خفیہ پہلوؤں سے پردہ اٹھایا ہے۔عمدہ مضمون ہے۔ بشریٰ رحمٰن ایک منجھی ہوئی افسانہ نگار ہیں: انہوں نے اچھا افسانہ لکھا۔سلمیٰ اعوان نے تاریخی شخصیت پر لکھا: موضوع، دوحرفی انگریزی لفظ جب کہ افسانہ یا تاریخی کہانی اردو میں۔اگر اس پورے پرچے میں کوئی عیب ہے تو وہ یہی ہے، دوسرا اس میں کئی لفظ انگریزی کے استعمال کیے گئے ہیں جب کہ ان الفاظ کا اردو متبادل بھی موجود تھا۔ڈاکٹر صغریٰ صدف کے افسانے میں کوئی خاص بات نہیں تھی، دوسری بات افسانے کا اختتام ہے، ایسا لگتا ہے جیسے افسانے کو بس انجام تک پہنچانا تھا۔آغا گل کے افسانے کو پڑھ کر ذہن امراؤ جان آدا کی طرف چلا جاتا ہے تاہم یہ افسانہ تھوڑی بہت مشابہت رکھنے کے باوجود بہرحال امراؤ جان آدا سے مختلف ہے۔اظہر جاوید کی پنجابی تحریر کو حنیف باوا نے اردو کا خوبصورت جامہ پہنایا ہے۔یہ کہانی عورت کے روپ اور اس کے رموز کی پہچان کراتی ہے۔بلاشک وشبہ عورت کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ ترجمہ بہت عمدہ ہوا ہے۔سید مشکور حسین یاد، سہیل غازی پوری، ارشاد قمر، مظفر حسن منصور، رفیق ارم کی غزلیں اچھی ہیں۔ڈاکٹر انور سدید نے شورش کاشمیری کے اسلوب پر مضمون قلم بند کیا ہے۔ان کا اندازِ بیاں سادہ اور عام فہم ہے۔اس لیے بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ یادوں کے حوالے سے ڈاکٹر رشید امجد کا مضمون ''عاشقِ صبر طلب'' بھی اچھا ہے۔ڈاکٹر ابدال بیلا کا سفر نامہ اور علی سفیان آفاقی اور عزیز میرٹھی کی آپ بیتیاں چونکہ قسط وار شائع ہو رہی ہیں اور مجھے پہلی بار ''تخلیق'' پڑھنے کا موقع ملا ہے اس لیے ان کی موجودہ قسط کے حوالے سے یہی کہہ سکتا ہوں کہ اچھی جا رہی ہیں۔مدیر تخلیق اور شاہد بخاری نے اچھی روداد لکھی ہے۔اعتبار ساجد کا مزاحیہ مضمون ''شہر نورد کے رومان'' نے بہت لطف دیا تاہم یہ بھی ایک قسط وار کہانی ہے۔''گوشہ اظہر جاوید'' کے تحت بہت اچھے مضمون پڑھنے کو ملے اور اظہر صاحب کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کرنے کا موقع ملا۔اپنے عظیم والد کے انتقال کے بعد سونان اظہر جاوید نے کافی محنت کی ہے۔بلاشک و شبہ ''تخلیق'' نئے لکھنے والوں کی بھی حوصلہ افزائی کر رہا ہے اور اس میں پیش کیا جانے والا ادب معلومات سے پُر ہے۔پرچے کے حوالے سے ایک اور خاص بات اس کی ''انجمن خیال'' ہے۔پاک و ہند کے چوٹی کے لکھاریوں کے خطوط سے مزین یہ محفل نئے لکھنے والوں کے لیے مشعل راہ کا کام دیتی ہے۔''پنجاب رنگ'' بھی عمدہ ہے۔شمارے میں کچھ مقامات میں کتابت کی غلطیاں ہوئی ہیں جن پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔اتنے معیاری شمارے کو پیش کرنے پر مدیر تخلیق اور ان کی پوری ٹیم مبارکباد کے مستحق ہیں۔

جمیل حیات (اٹک)

....

﴿21﴾ عزیزم سونان اظہر جاوید!

مارچ کا تخلیق بروقت ملا اور معیاری تحریریں پڑھنے کو ملیں ''اپنی بات'' میں 2013 کے تخلیق تحسین ایوارڈ کا احوال پڑھ کر دلی خوشی ہوئی۔(جہاں تک فخر زمان صاحب کی رائے کا تعلق ہے کہ ''تخلیق'' میں بلوچی، سندھی اور پشتو کی نمائندگی کا حصہ ہونا چاہیے۔راقم اس

تجویز کے حق میں نہیں۔ یہ کام اکادمی ادبیات کے کرنے کے ہیں نہ کہ تخلیق کا۔ اس مرتبہ فرشتۂ اجل نے عزیز میرٹھی کو بھی ہم سے چھین لیا۔ ہم پچھلے کئی سالوں سے ان کی دلکش تحریریں تخلیق میں پڑھتے چلے آ رہے تھے۔ ان کی موت سے تخلیق ایک رجحان ساز لکھاری سے محروم ہو گیا تخلیق میں تمہارے خط بڑے غور سے پڑھتا ہوں۔

شاہد بخاری نے اظہر جاوید کی دوسری برسی کی بڑی خوبصورت روداد مرتب کی اُن کی تحریر کا ہر لفظ اظہر جاوید کی محبت سے آراستہ نظر آتا ہے۔ والدِ گرامی کے اعزاز میں ایسی پروقار تقریب منعقد کرنے پر میری طرف سے مبارکباد قبول کیجئے۔

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے ''ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں'' کے عنوان سے ڈاکٹر انور سدید کی شخصیت پر جو مضمون لکھا ہے وہ بڑا دلچسپ اور انتہائی معلوماتی ہے۔ اس مضمون کو اگر ڈاکٹر انور سدید کی مختصر ترین تاریخ کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہو...... بالکل اسی طرح حسن عسکری کاظمی کی شفیع عقیل پر لکھی تحریر ''ادب اور صحافت کا سنگم'' بھی ایسی ہی خوبیوں سے مرصع دکھائی دی۔ مامون ایمن کا فیض احمد فیض پر لکھا مضمون فیض شناسی کی ایک درخشاں مثال ہے۔ سات افسانوں میں ہر افسانہ ایک سے بڑھ کر ایک دکھائی دیا۔ ''بشریٰ رحمٰن کا گیسو'' شاہکار المیہ ہے۔ سلمہ اعوان کا No حیرانی کا استعارہ نظر آیا، ڈاکٹر صغریٰ صدف کا افسانہ ''کھڑکی'' کا دکھ بھری زندگی کا المیہ اختتام قاری کو نمناک کر دیتا ہے۔ آغا گل کا افسانہ ''میست ناں پاٹ'' میں کلاسیکی فلموں کی دلچسپ کہانی کی واضح جھلک نظر آئی۔ نثار احمد صدیقی کا افسانہ ''واپسی'' بظاہر روائتی انداز سے آگے بڑھتے ہوئے اختتام بہر قاری کو چونکا دیتا ہے یہ ہی افسانے کی سب سے بڑی خوبی کہلاتی ہے اظہر جاوید کے افسانے ''اشارہ'' کو حنیف باوا نے کمالِ فنی مہارت سے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے باوا جی کی اردو میں اظہر جاوید کا لہجہ بولتا ہے۔

پروفیسر جمیل آذر کی چائے کی معیت اچھا انشائیہ ہے اسے پڑھ کر لن یوتانگ کی یاد تازہ ہوگئی جو چائے کا بڑا رسیا تھا۔ شورش کاشمیری کے اسلوب کو ڈاکٹر انور سدید نے بہت خوب طریقے سے اجاگر کیا ہے ڈاکٹر رشید امجد، علی سفیان آفاقی اور عزیز میرٹھی کی احتیاط گزشتہ سے پیوستہ کی طرح خوب رنگ جماتی دکھائی دیں۔ ''سورج کے رخ پر'' تخلیق کے ''مہاگرو'' ابدال بیلا کے سفرنامے کی یہ قسط طنز و مزاح سے بھرپور نظر آئی کرنل رنگ کی رنگ میں بھنگ ڈالنے والی ظریفانہ حرکات کی روداد پڑھتے ہوئے شاید ہی کوئی قاری ایسا ہو جو ہنسی پر قابو رکھ سکا ہو، اب آگے اگلی قسط میں دیکھئے کرنل رنگ کیا رنگ جماتا ہے نارنگ ساقی اور کیول دھیر نے آپ کے دولت خانے میں قدم رنجہ فرما کر اظہر جاوید سے حق دوستی ادا کر دیا۔ تخلیق کی شام...... تاشی ظہیر کے نام بھی اچھی تحریر تھی۔ ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی ہمیشہ ہلکے پھلکے انداز میں طنز و مزاح لکھتے ہیں تاہم ان کے عنوان کا انتخاب ہمیشہ اچھوتا ہوتا ہے۔ اس مرتبہ بھی ''بھارتی پولیس کی غالب شناسی'' ان کی نمائندہ تحریر نظر آئی تاہم اگر وہ عنوان میں غالب کی جگہ گالب لکھتے تو ان کے عنوان کو شاید ایک آدھا چاند اور لگ جاتا۔ اعتبار ساجد کا شہر نورد کے رومان'' ایک رومان پرور تحریر دکھائی دی گوشہ اظہر جاوید میں شامل شمشاد احمد، رضی الدین رضی اور پیرزادہ بخت قاضی کی تحریروں کا ایک ایک لفظ اظہر جاوید کی دوستی میں گوندھا نظر آیا۔ انور سدید کا خوبصورت جائزہ تخلیق کا دو سال کا سفر بھی خاصے کی چیز تھے۔ صائمہ نورین کے خط کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ''تخلیق'' کا بڑی گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کرتی ہیں ایسے خطوط سے ہی ادب کا طالب علم کچھ سیکھ سکتا ہے۔

.... **ایم ڈی ملک** (راولپنڈی)

﴿22﴾ انتہائی محترم عزیزم سونان اظہر جاوید!

چند ماہ میں ہی تخلیق آپ کی موتیوں جیسی کاوش ہم پر چھا گئی اور مارچ کا شمارہ قدرے تاخیر سے ملا۔ ابھی تک زیرِ مطالعہ ہے۔ میں نے اردو ادب سے کبھی بھی ناطہ نہ توڑا۔ مصروفیت اپنی جگہ مگر ادبی چسکا ہمیشہ پورا ہوتا رہا۔ آپ سے فون پر بات کر کے بڑی حوصلہ افزا پذیرائی ملی اور اسی نشہ میں آج تخلیق کی محفل میں آنے کی گستاخی کر رہا ہوں۔ انجمن خیال میں اتنے بڑے بڑے بھاری بھر کم نام دیکھ کر ہی ''ذرا نیچے ہو گیا'' اور ساتھ ہی ان بے مثال ہستیوں کے خیالات پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ شکر ہے ان ادیبوں میں بہت رواداری اور پذیرائی دینے کی صنعت موجود ہے۔

مکمل روداد سے واقعی مکمل معلوماتِ اظہر جاوید دوسری برسی حاصل ہوئیں شاہد بخاری نے بڑی ''معلوماتی لحاظ'' سے رپورٹ دی ہے۔ تقریب کے شرکاء کے نام بھی دیکھ کر ان لوگوں کی اردو ادب میں اتھارٹی کو مانا اور یہ بڑے بڑے ادیب و لکھاری ہمارے مرحوم اظہر جاوید کے قدر دان کتنے بڑے ہیں؟ ڈاکٹر انور سدید اور شفیع عقیل کے متعلق پڑھ کر معلومات میں بے شمار اضافہ ہوا۔ گوشہ فیض احمد فیض میں حق دوستی اور تینوں مضمون دل میں اتر گئے۔ افسانے ایک سے ایک بڑھ کے تھے۔ مگر NO (سلمیٰ اعوان) اور مسیت نہ پاٹ (آغا گل) نے تو خاص طور پر دل و دماغ کو ہلا کر رکھ دیا۔ واہ سونان جی۔ یہ انتہائی خوشی کی بات ہے اظہر جاوید کی کوئی نہ کوئی تخلیق ضرور افسانوں میں شامل ہو رہی ہے اور کرتے رہیے۔ ان کے ٹائم پر تو کبھی وہ نہ شائع کرتے تھے تو اس لحاظ سے یہ آپ پر قرض ہے۔ کئی جگہ تو حنیف باوا کا ترجمہ ہی دلچسپی کا باعث بن جاتا ہے۔ گوشہ اظہر جاوید بھی دل میں اتر گیا۔ ویسے تو آپ نے اس مجلّہ میں دریا کوزے میں بند کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اتنے دن گزرنے کے بعد بھی زیرِ مطالعہ ہے۔ اتنا تنوع، اتنا مواد اور انتہائی دقیق، تحقیقی مواد پڑھنا بھی کار دار ہے۔ مگر مجھ سے تو چند ایک ''ایسے ویسے'' اردو کے رسالے، تخلیق نے چھڑا دیئے ہیں۔ لکھنے اور تبصرہ کرنے کے لیے تو جناب کئی صفحات چاہیں۔

جاوید احمد صدیقی (راولپنڈی) ....

﴿23﴾ محترم سونان اظہر جاوید صاحب!

مارچ 2013ء کا شمارہ 31 مارچ کو موصول ہوا تھا۔ ''تخلیق'' میں میری دو نظموں کی اشاعت کا شکریہ! میری پہلے سے ارسال کردہ کچھ چیزیں آپ کی فائل میں موجود ہوں گی۔ بہر نوع، دو تازہ ترین تخلیقات نذرِ تخلیق ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید، امین راحت چغتائی، مشکور حسین یاد اور اپنی بیگم سعدیہ سونان سے میرا اسلام کہیے۔ ڈاکٹر رشید امجد، جمیل آذر، محمود شام، نارنگ ساقی، سلیم آغا قزلباش، نسیم سحر اور نجمہ عثمان بھی میرے کرم فرماؤں میں ہیں۔ آپ کے توسط سے ان سب کو میرا مخلصانہ سلام پہنچے۔

جانے والوں نے قطار باندھ رکھی ہے   اتنا دُکھ سہنے کے لئے جگر چاہیے

ولی عالم شاہین (کینیڈا)

◆◆◆

ماہنامہ 'تخلیق' کو موصول ہونے والے رسائل

(تخلیق کو ملنے والے رسائل اور کتب کی تعداد کافی زیادہ ہے اسی لئے تمام رسائل اور کتب کے ناموں کو لسٹ میں شامل کرنا ممکن نہیں)

سہ ماہی معاصر لاہور مدیر : عطاالحق قاسمی	ماہنامہ ادبِ لطیف لاہور چیف ایڈیٹر : صدیقہ بیگم	ماہنامہ الحمرا لاہور مدیر : شاہد علی خان
ماہنامہ ادب دوست لاہور مدیر اعلیٰ : خالد تاج	ماہنامہ بیاض لاہور مدیر : عمران منظور	ماہنامہ سپوتنک لاہور مدیر اعلیٰ : آغا امیر حسین
ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ مدیر : محمد عمار خان ناصر	ماہنامہ نیرنگ خیال راولپنڈی مدیر اعلیٰ : سلطان رشک	ماہنامہ مسکراہٹ لاہور چیف ایڈیٹر : طفیل اختر
ماہنامہ چہارسو راولپنڈی مدیر مسؤل : گلزار جاوید	سہ ماہی کہکشاں راولپنڈی مدیر اعلیٰ : محمد بشیر رانجھا	ماہنامہ سفید چھڑی سرگودھا مدیر : پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال
سہ ماہی نالۂ دل بھیرہ مدیر : مرزا شبیر بھیروی	ماہنامہ صبح بہاراں گوجرخان چیف ایڈیٹر : ذکاء اللہ شیخ	ماہنامہ روشنائی کراچی مدیر : احمد زین الدین

ماہنامہ 'تخلیق' کو موصول ہونے والی کتب

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف	رابطہ نمبر	پبلشرز	قیمت
-1	خدا سب یاد رکھتا ہے	آصفہ نشاط	0302-7844094	مکتبہ فکرودانش	300/-
-2	چند سیپیاں سمندروں سے	پروین شیر	0091313972589	پرنس آرٹ پرنٹرس	200/-
-3	فرنٹ سیٹ	منور عثمانی	0321-9476768	سانجھ پبلی کیشنز	160/-
-4	پنجابی نثر دی کہانی	ملک شاہ سوار علی ناصر	0300-4737299	گنج شکر پرنٹرز، لاہور	300/-
-5	چہرہ چہرہ کہانیاں	احمد زین الدین	042-36679769	این پبلی کیشنز، کراچی	350/-
-6	رازِ درونِ خانہ	جاوید اختر پاشا	....	....	300/-
-7	ابھی موسم نہیں بدلا	شاہین زیدی	042-37352332	علم و عرفان پبلشرز	300/-
-8	چشمِ غزال	جاوید احسن	03336478180	سلیمان اکیڈمی، ڈی جی خان	350/-
-9	ان کہی سوچیں	ڈاکٹر مقصودہ حسین	042-37323963	سپوتنک پرنٹرز	300/-
-10	اکھ دا سچ	ملک شاہ سوار علی ناصر	0300-4737299	گنج شکر پرنٹرز	150/-

◆◆◆